اشفاق احمد کے افسانوں کا اخلاقی تناظر

مقالہ نگار:

نورین کھوکھر

نگران مقالہ:

ڈاکٹر سعادت سعید

شعبہ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

اشفاق احمد کے افسانوں کا اخلاقی تناظر

نام: نورین کھوکھر

رجسٹریشن نمبر

0	0	4	2	-	GCU	-	Ph.D	-	U	-	2008

شعبہ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

اشفاق احمد کے افسانوں کا اخلاقی تناظر

یہ مقالہ پی ایچ۔ڈی کی تکمیل کے سلسلے میں جی سی یونیورسٹی، لاہور کو سند عطا کئے جانے کے لیے پیش کیا گیا۔

پی ایچ۔ڈی

مضمون

اُردو

نام: نورین کھوکھر

رجسٹریشن نمبر

0	0	4	2	-	GCU	-	Ph.D	-	U	-	2008

شعبہ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

تصدیق برائے تکمیل مقالہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ زیرِ نظر مقالہ بعنوان

اشفاق احمد کے افسانوں کا اخلاقی تناظر

نورین کھوکھر۔ رجسٹریشن نمبر: 0042-GCU-Ph.D-U-2008 نے پی۔ایچ ڈی کی سند کے حصول کے لیے میری زیرِ نگرانی مکمل کیا۔

نگران: تاریخ: ________

ڈاکٹر سعادت سعید

شعبہ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

کنٹرولر امتحانات: بتوسط:

جی سی یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر شفیق عجمی

صدر شعبہ اُردو

جی سی یونیورسٹی، لاہور

اقرار نامہ

میں نورین کھوکھر رجسٹریشن نمبر 0042-GCU-Ph.D-U-2008 اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ میں پیش کیا جانے والا مواد بعنوان

''اشفاق احمد کے افسانوں کا اخلاقی تناظر''

میری ذاتی کاوش ہے اور یہ کام پاکستان یا پاکستان سے باہر کسی بھی تحقیقی یا تعلیمی ادارے کی طرف سے شائع، طبع یا پیش نہیں کیا گیا۔

دستخط مقالہ نگار:

______________________ تاریخ: ______________________

فہرست ابواب

صفحہ

دیباچہ

اشفاق احمد متنوع الجہات شخصیت کے حامل ہیں۔ افسانہ نگار، ڈراما نگار، ہدایت کار، صداکار، کالم نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ماہر سماجیات، ماہر روحانیات اور ماہر اخلاقیات بھی ہیں۔ ان کی تخلیقی شخصیت مصلح قوم کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی تمام تر علمی و ادبی خدمات کا مقصد عوام کی بھلائی اور معاشرے کی اصلاح رہا ہے۔ زیر نظر مقالے میں ''اشفاق احمد کے افسانوں کا اخلاقی تناظر'' پیش کیا گیا ہے اور اس کا مقصد عوام کے سامنے ان کی تمام کاوشوں کی تشریح و توضیح کرنا ہے تا کہ اشفاق احمد کا مقصدِ حیات پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے۔ اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور چھٹا باب محاکمے پر مشتمل ہے۔

پہلے باب ''اشفاق احمد (ایک تعارف)'' میں اشفاق احمد کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش، تعلیم، خاندان، ملازمت، ادبی رسائل کی ادارت، علمی اور ادبی مجالس کی رکنیت، اعزازات اور علمی و ادبی خدمات کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ان کی تمام تصانیف اور تالیفات کا تعارف بھی بیان کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں فلسفہ اخلاق اور اس کے بنیادی مباحث کی وضاحت پیش کی گئی ہے اور مختلف مذاہب میں موجود اخلاقی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے ساتھ ادب اور اخلاقیات کی وضاحت بھی تحریر بھی لائی گئی ہے۔

تیسرے باب میں ''اشفاق احمد کے عمومی اخلاقی تصورات'' کا جائزہ پیش خدمت ہے۔ اس باب میں ان کی تمام تر کتابوں اور انٹرویوز، پروگرامز، تحریروں اور تقریروں میں موجود اشفاق احمد کے اخلاقی تصورات بیان کئے گئے ہیں۔ اس باب میں مذہب، تصوف، معاشرت، معیشت اور انفرادی اخلاقیات کے تصورات بھی موجود ہیں۔

چوتھے باب میں اشفاق کے افسانوں میں موجود اخلاقیات کا تناظر پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں اشفاق احمد کے چھ افسانوی مجموعوں ''ایک محبت سو افسانے، گڈریا۔ اُجلے پھول، سفر مینا، صبحانے فسانے، ایک ہی بولی۔ پھلکاری، طلسم ہوش افزاء اور دیگر افسانے'' کا اخلاقی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے کے پانچویں باب ''ہمارا معاشرہ'' میں ''اشفاق احمد کے افسانے اور مثالی معاشرہ'' پر ماحصل بحث مرقوم ہے۔ اس باب میں معاشرے کی تعریف اور تصورات بیان کئے گئے ہیں اور اشفاق احمد کے افسانوں میں موجودہ معاشرے کے تصورات کو وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ موجودہ معاشرے کی تمام خامیوں اور کمزوریوں کی پیشکش کے ساتھ ساتھ ان کی روک تھام کیلئے اشفاق احمد کا مثالی معاشرہ پیش کیا گیا ہے۔

چھٹا باب محاکمہ ہے۔ جس میں درج بالا تمام ابواب کا طائرانہ جائزہ بیان کیا گیا ہے۔

خدا کا خوف حکمت شروع ہے، سب سے پہلے میں شکر گزار ہوں اس رب الرحیم کی مبارک ذات کا جس نے ہر لمحہ، ہر جاء میرے ہر کام میں میرے لئے آسانیاں پیدا کیں۔ میری کامیابی اس کا کرم ہے۔ میں اس کی رحمتوں کے در پر سربسجود ہوں۔

یسوع مسیح کا نام میری زندگی میں برکتوں کا وسیلہ ہے۔ شکر ہو ان کی ساری شفاعت اور مسیحائی کے لیے۔ الفاظ میں ان کی قدرت کا بیان ناممکن ہے، ان کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ میرا دل ان کی شکر گزاری سے بھرا ہے۔

باپ کی شفقت ہر انسان کی زندگی میں سائباں کی سی حیثیت رکھتی ہے لیکن میرے لئے تو سائباں ہی میرے والد محترم کی ذات ہے۔ میری تعلیم کے حصول میں کلاس رسیپشن سے لے کر پی۔ ایچ ڈی کے سفر تک ان کے تعاون، مدد، راہنمائی، اعتماد، حوصلہ افزائی نے ہمیشہ مجھے تقویت دی۔ مجھے تو یہ ساری ڈگریاں اپنی نہیں ان ہی کی لگتی ہیں۔ میری کامیابی کے روح رواں میرے ابو ہی ہیں۔ ان کا وجود میرے لیے باعث اطمینان ہے۔ میری تعلیم و تربیت کا سارا کریڈٹ ان کو جاتا ہے۔ اب بھی یوں لگتا ہے کہ اس ڈگری کے حصول کے بعد ڈاکٹر نورین کھوکھر نہیں بلکہ ڈاکٹر یعقوب کھوکھر ہونا چاہیے۔

میری ''ماں'' کا وجود میری ہر تھکن کو سمیٹتا اور ان کی دعائیں میری راہ میں پھول بکھیرتی ہیں۔ جب بھی میں گھر سے باہر ہوتی ہوں اپنی ماں کی دعاؤں کے ہالے میں رہتی ہوں تبھی تو ہر قدم پر مجھے فرشتوں سے واسطہ رہتا ہے۔ یہ سب میری ماں کی دعاؤں کا اثر ہے۔ اپنے والدین کی تمام محنت، ریاضت، خدمت، محبت اور عزت کے لیے میں دل سے شکر گزار ہوں۔

اساتذہ روحانی والدین بھی ہوتے ہیں اور پیغمبری بھی کرتے ہیں۔ مجھے بھی ایسے ہی استاد ڈاکٹر سعادت سعید کے روپ میں ملے۔ مقالے کے تمام رموز و نکات پر ان کی گہری نظر تھی اور مجھے بھی آنکھ جھپکنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس مقالے کی تکمیل کے ہر مرحلے پر ان کی راہنمائی اور حوصلہ افزائی کے لیے میں دل سے ان کی شکر گزار ہوں۔

صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور ڈاکٹر شفیق عجمی اپنے نام سے عین موافقت رکھتے ہیں۔ اس مقالے کی تکمیل کا باعث ان کی شخصیت ہے۔ مقالے کی مختلف موضوعات سے لے کر ماخذ اور مصادر تک ان کی مشاورت شامل رہی۔ ان کی راہنمائی اور تعاون کے بغیر اس مقالے کی تکمیل ناممکن تھی۔ میں دل سے ان کی سپاس گزار ہوں۔

میں ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا کی دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بے پناہ مصروفیت کے باوجود مجھے وقت دیا اور اشفاق احمد کے بارے میں مفید معلومات دیں۔

صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر فخر الحق نوری نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ میں ان کی بھی شکر گزار ہوں۔

میں ڈاکٹر سی جے ڈوباش ایگزیکٹو وائس ریکٹر ایف سی کالج کی دل سے شکر گزار ہوں۔ انہوں نے اس مقالے کے آغاز سے تکمیل تک میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ ڈین آف سٹوڈنٹس شیرل برک کے تعاون کے لیے بھی شکر گزار ہوں۔

صدر شعبہ اردو ایف سی کالج یونیورسٹی لاہور پروفیسر عتیق انور کی مسلسل معاونت نے مقالے میں پیش آنے والی ہر مشکل کو دُور کیا۔ مواد کی فراہمی اور دستیابی میں خصوصی مدد فرمائی۔ شعبہ جاتی امور کی انجام دہی میں مکمل تعاون کیا۔ اگر ان کی طرف سے یہ سہولتیں مجھے نہ ملتیں تو شاید یہ مقالہ مکمل نہ ہو پاتا۔ میں دل سے ان کی شکر گزار ہوں۔

صدر شعبہ ابلاغیات ڈاکٹر سلیم عباس اور فراست جبیں کے مفید مشورے بھی مقالے کی تکمیل میں کام آئے ہیں ان کی بھی شکر گزار ہوں۔ صدر شعبہ اردو (کالج سائیڈ) ایف سی کالج لاہور صفدر نعیم کی معاونت بھی میرے لئے حوصلے کا باعث بنی۔ وہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

میں مسز فرحت سعادت سعید کی محبت اور میزبانی کے لیے بھی دل سے شکر گزار ہوں انھوں نے ہمیشہ مجھے پرخلوص انداز سے وقت بے وقت خوش آمدید کہا۔

میرے شعبہ اردو کے قابل احترام کولیگز ڈاکٹر علی محمد خان، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر اشفاق ورک، ڈاکٹر محمد طاہر کی طرف سے مدد اور تعاون کیلئے میں ان کی دل سے شکر گزار ہوں۔ پروفیسر عابدہ بتول کی محبت اور عقیدت کیلئے بھی ان کی شکر گزار ہوں۔

ثاقب سلیم نے اخبارات کی فراہمی میں میری مدد کی۔ ان کا بہت بہت شکریہ۔ محسن علی رتھ نے رسائل کی دستیابی میں میرا بہت ساتھ دیا۔ سعدیہ خالد، عائشہ فیاض، عرفان، متین، عمیر ذیشان، منان چوہدری اور عمار گل نے اشیاء کی دستیابی میں مدد کی، ان کا بھی شکریہ، میاں مسعود، بانو قدسیہ کے اسسٹنٹ نے اشفاق احمد کی ذاتی لائبریری سے بہت سی معلومات فراہم کیں۔ ان کا بہت شکریہ۔ پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج کے چیف لائبریرین اور محمد یونس صاحب، جناح لائبریری کی مس خوشی، پنجاب پبلک لائبریری، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کے محمد رمضان صاحب، گورنمنٹ کالج لاہور کے محمد زاہد اور ایف سی کالج لاہور سے میڈم بشریٰ جسوال، جیکب لعل دین، بوئنر فریڈرک اور دیگر تمام لائبریرین کے تعاون کا بے حد شکریہ۔

محترمہ بانو قدسیہ کی محبت اور ان کے بیٹے انیق احمد کے تعاون کیلئے بھی شکر گزار ہوں۔

باجی رانی اور بھائی جاوید نے ہمیشہ ہر مرحلے پر میرا ساتھ دیا اور میرے لیے دعا کی۔ ان کی محبت کا بہت شکریہ۔ اپنے ماموں مقصود گوہر کی دعاؤں کے لیے بھی شکر گزار ہوں۔ شمیم اور عمران بھائی نے ہمیشہ اچھے دوستوں کے سے فرائض سرانجام دیئے ان کی عقیدت بھی شکریہ۔ تسنیم اور شاہد بھائی نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ ان کی فکر کا بے حد شکریہ۔ یاسمین اور دانیال نے پردیس میں رہ کر میری ہمیشہ دیکھ بھال کی۔ ان کے پیار کا بہت شکریہ۔ ''راج'' کی مدد اور تعاون کے بغیر میرا ہر کام ادھورا ہے۔ میرے کام کے لیے سازگار ماحول فراہم کرنا، میری شخصیت کو منظم رکھنے میں اس کی محبت اور ایثار شامل ہے۔ اس کی خدمت میں تہہ دل سے اس کی شکر گزار ہوں۔ ''فاروق'' نے مقالے کے ہر مرحلے پر میرا ساتھ دیا اور میرے کاموں کا بوجھ بانٹا۔ اس کی محبت کے لیے بہت شکریہ۔ ''قدوس'' نے میرے کاموں میں ہر طرح سے آسانی فراہم کی۔ اس کی عقیدت کے لیے بہت شکر گزار ہوں۔ ''شاہا'' نے ہمیشہ میرے لیے دعا کی۔ اس کی عبادت کا بہت شکریہ۔ باجی ادیبہ، باجی وحیدہ اور کاشفہ بھابی کی محبت نے مجھے ہمیشہ ذہنی سکون فراہم کیا، میں ان کے اس پیار کے لیے دل سے شکر گزار ہوں۔ داؤد اور سلیمان نے ان مصروف ایام میں میرے بہت سے کام کیے۔ میں ان کے لیے شکر گزار ہوں۔ شہ زور، عیشا، فجر، عظمیٰ، تاجور، سنیناں، خضر اور ابراہام کی مسکراہٹوں اور پیار کے لیے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں سمیرا رشید، سحر منصور اور فاخرہ پروین کی دعاؤں کے لیے بھی شکر گزار ہوں۔

آخر میں شکریہ ادا کرتی ہوں زبیر بھائی کا جنھوں نے اس مقالے کی کمپوزنگ کا کام تندہی اور محنت سے کیا۔ ان کی تمام کاوشوں کے لیے ان کا شکریہ۔

اس مقالے کی تکمیل میرے لیے خواب کی تعبیر سے کم نہیں اور بہت کم لوگوں کے خواب سچ ہوتے ہیں۔ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے رب کریم کی رحمت سے اس قدر پرخلوص معاونین ملے جنھوں نے میرے ساتھ مل کر اس خواب کو تعبیر دی۔ ان سب کا تہہ دل سے شکریہ۔

انتساب

ابو کی ریاضت

اور

امی کی عبادت

کے نام

باب اول

اشفاق احمد ۔(ایک تعارف)

ا۔ توقیت اشفاق احمد

ب۔ تعلیم

ج۔ ملازمت

د۔ رسائل کی ادارت

ہ۔ علمی اداروں اور مجالس کی رکنیت

و۔ اعزازات

ز۔ اشفاق احمد کی علمی و ادبی خدمات

ا۔ توقیت اشفاق احمد

اشفاق احمد ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء غازی آباد کے گاؤں گڑھ مکستر، فیروز پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ اشفاق احمد کی تاریخ ولادت کے حوالے سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اردو انسائیکلوپیڈیا میں ۲۴ اگست ۱۹۲۵ء درج ہے۔(۱) اشفاق احمد کے شناختی کارڈ پر ان کی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۷ء ہے۔(۲) ماہنامہ رابطہ میں اشفاق احمد کی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۴ء درج ہے۔(۳) اشفاق احمد کی آٹو بائیوگرافی میں درج ہے:

"Ahmed was born on 22 August 1925 in Garh muktasar village, Ghazaiabad, British India."(۴)

داستان گو بائی اشفاق احمد (Dastango By Ashfaq Ahmed) میں عظیم لکھتے ہیں کہ:

"Ahmed was born on 22 August 1925 in Garh muktasar village, Ghazaiabad, British India."(۵)

ماہنامہ بیاض میں اشفاق احمد کی تاریخ پیدائش ۱۹۲۵ء درج ہے۔(۶)

اردو فارم اشفاق احمد اردو ورلڈ میں ہے کہ:

"Ashfaq born on 22 August 22, 1925 and obtained his early education in his native district Ferozpur, East Punjab."(۷)

ماہنامہ ادب لطیف میں اشفاق احمد کی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء بمقام مکستر فیروز پور بھارت درج ہے۔(۸)

پاکستان فورم اشفاق احمد کے مطابق:

Ashfaq Ahmed was born on August 22, 1925 in Muktasar district Ferozepur in India."(۹)

وکی پیڈیا میں ہے کہ:

"Ahmed was born 22 August, 1925 in Ferozpur, British Punjab."(۱۰)

ماہنامہ ماورا میں بھی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء ہی درج ہے۔(۱۱)

ڈان (DAWN) نیوز پیپر میں ہے کہ:

Ashfaq Ahmed - Born on Aug 22, 1925 in Village Garh Muktasar, Ashfaq obtained his early education in his native district, Ferozepure, East Punjab."(۱۲)

اشفاق احمد نے روز نامہ خبریں کے لیے انٹرویو دیتے ہوئے اپنی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء بتائی۔(۱۳)

روز نامہ پاکستان سنڈے میگزین کو انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست بتائی اور سن کا ذکر نہیں کیا۔(۱۴)

روز نامہ جنگ کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ہی بتائی اور سن کا ذکر نہیں کیا۔(۱۵)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق اشفاق احمد کی ولادت ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء کو ہوئی۔(۱۶)

طاہر مسعود ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد جو آج ٹیلی ویژن کے متنازعہ ترین ادیب کی حیثیت سے ملک بھر میں مصروف ہیں ۲۲ اگست ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔''(۱۷)

اشفاق احمد کی تاریخ پیدائش نعیم مصطفیٰ کے نزدیک ۲۲ اگست ۱۹۲۷ء ہے۔(۱۸)

نعیم مصطفیٰ اپنے انٹرویو ''ایسا کہاں سے لاؤں تجھ سا کہیں جسے'' میں کہتے ہیں:

''۲۲ اگست ۱۹۲۷ء اور ۷ ستمبر ۲۰۰۷ء...... بھارت کے مشرقی پنجاب میں واقع شہر فیروز پور سے شروع ہونے والا پاکستان کے دل لاہور تک کا یہ سفر ۷۷ سال ۱۷ دن اور ۷ گھنٹے پر محیط ہے۔''(۱۹)

درج بالا اقتباس میں تاریخ پیدائش کا سنہ ء متنازعہ ہے۔

یوسف عالمگیرین اپنے مضمون "An unforgettable personality" میں لکھتے ہیں کہ:

"He was born on 22 August 1925 at Ferozpur (India)and died on September 7, 2004 in Lahore."(۲۰)

ثمینہ شہناز نے اپنے مقالے میں اشفاق احمد کی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء لکھی ہے۔
وہ لکھتی ہیں کہ:

''چنانچہ اشفاق احمد کی صحیح تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء ہی قرار پائی ہے۔''(۲۱)

شازیہ صدف نے اپنے مقالے ''اشفاق احمد کی ادبی خدمات، اردو ادب کے تناظر میں'' مختلف شواہد اور بانو قدسیہ سے

ملاقات کے حوالے ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء درج کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

''لہٰذا اشفاق احمد کے بیانات اور مذکورہ شواہد کی روشنی میں ان کی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء کو ہی درست تسلیم کیا جانا ہے۔'' (۲۲)

سدرہ ندیم نے اپنے مقالہ ''بابا صاحبا میں اشفاق احمد کی سوانح'' میں اشفاق احمد کی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء ہی درج کی ہے۔ (۲۳)

راقمہ کی ملاقات بانو قدسیہ سے ہوئی تو انھوں نے کہا کہ:

''اشفاق احمد کی تاریخ پیدائش ۲۵ اگست ۱۹۲۵ ہے۔ لیکن جب تصدیق کے لیے اشفاق احمد کے بڑے بیٹے انیق احمد سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ ''ابا جی کی صحیح تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء ہے۔'' (۲۴)

جب انھیں بانو آپا کا حوالہ دیا تو انھوں نے کہا کہ ''اماں کی یادداشت آج کل میں ایسے ہی ہے بوجہ صحت۔ ابا جی کی درست تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ہی ہے۔'' راقمہ نے اس پر یہ سوال کیا کہ کیا آپ ان کی سالگرہ منایا کرتے تھے تو انیق احمد نے ہاں میں جواب دیا۔ (۲۵)

لہٰذا اشفاق احمد کے انٹرویوز، محترمہ بانو قدسیہ سے ملاقات اور ان کے اہل خانہ سے گفت وشنید، تصاویر، ان کے بیٹے انیق احمد سے گفتگو اور راقمہ کی تحقیق کے بعد اشفاق احمد کی تاریخ پیدائش ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء ہی تسلیم کی جائے۔

اشفاق احمد کا تعلق متمول گھرانے سے تھا۔ وہ پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ممتاز مفتی لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد کھاتے پیتے پٹھان گھر میں پیدا ہوا۔ بہت سے بھائیوں میں ایک کے سوا سب سے چھوٹا۔ باپ ایک قابل محنتی اور جابر پٹھان تھا۔ جس کی مرضی کے خلاف گھر میں پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ گھر کا ماحول روایتی تھا۔ بندشیں ہی بندشیں۔ اس کے باوجود اشفاق کی شخصیت میں بنیادی طور پر پٹھانیت کا عنصر مفقود تھا۔'' (۲۶)

اشفاق احمد کے والد کا نام محمد خان اور والدہ کا نام سردار بیگم تھا۔ یہ آٹھ بہن بھائی تھے۔ اشفاق احمد اپنے سب بھائیوں سے چھوٹے لیکن دو بہنوں سے بڑے تھے۔ بہن بھائی: ۱۔ آفتاب احمد خان، ۲۔ افتخار احمد خان، ۳۔ اقبال احمد خان، ۴۔ اسحاق احمد خان، ۵۔ اشتیاق احمد خان، ۶۔ فرخندہ، ۷۔ راحت۔

اشفاق احمد نے دسمبر ۱۹۵۶ء میں قدسیہ بانو سے شادی کی۔ ان کی زوجہ کا قلمی نام ''بانو قدسیہ'' ہے۔ ان کی جوڑی

علم وادب میں چاند اور سورج کی سی حیثیت رکھتی ہے۔اشفاق احمد کے تین بیٹے ہیں:۱۔انیق احمد،۲۔انیس احمد،۳۔اثیر احمد

ب۔تعلیم

اشفاق احمد نے میٹرک فیروز پور تحصیل مُکسِتر سے۱۹۴۲ء میں کیا۔ایف اے اور بی اے بالترتیب۱۹۴۴ء، ۱۹۴۶ میں کیا۔

''اشفاق احمد نے بی۔اے ۱۹۴۶ میں دیال سنگھ کالج سے کیا۔''(۲۷)

اسی طرح اشفاق احمد کے بھتیجے جاوید طارق کے مطابق ملاحظہ فرمائیے:

Javed Tariq Mr. Ahmed nephew, told. Daily Time that his uncle get his early education at Ferozpur, and then he did his BA from Lahore Master from lahore in Urdu from Government College in Lahore."(۲۸)

اشفاق احمد فورم پاکستان کے مطابق:

"Writer Ashfaq Ahmed did diplomas in Italian and French languages from the University, france, He got spedial training in broad casting from Newyork University."(۲۹)

اشفاق احمد نے ایم۔اے۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ کالج سے کیا۔گرے نوبل یونیورسٹی فرانس سے فرانسیسی زبان میں ڈپلومہ۱۹۵۳ء میں حاصل کیا(۳۰) اور روم یونیورسٹی اٹلی سے اطالوی زبان میں ۱۹۵۷ء میں ڈپلومہ کیا(۳۱)۔۱۹۶۲ء میں نیویارک یونیورسٹی امریکہ سے ریڈیائی نشریات کی خصوصی تربیت حاصل کی اور اسی سال ورمونٹ Wermont میں بریڈ لوف Bread Loaf رائٹرز گروپ میں شرکت بھی کی۔

ج۔ملازمت

اشفاق نے اپنی ملازمت کا آغاز۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور اسٹیشن پر اناؤنسمنٹ سے کیا۔آزاد کشمیر ریڈیو اسٹیشن اور راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن پر بطور براڈ کاسٹر کام کیا۔۱۹۵۲ء۔۱۹۵۱ء دیال سنگھ کالج لاہور میں بطور اردو لیکچرار کام کیا

اور پھر اردو لیکچرار کے طور پر روم یونیورسٹی اٹلی میں ۱۹۵۳ تا ۱۹۵۴ کام کیا۔ ۱۹۷۰ء۔۱۹۷۴ آر۔سی۔ڈی ریجنل کلچرل انسٹیٹیوٹ پاکستان برانچ میں رہے۔ آنریری لیکچرار (پنجابی) پنجاب یونیورسٹی لاہور (۱۹۶۷ء) بھی رہے۔ بطور ڈائریکٹر جنرل، اردو سائنس بورڈ لاہور (۱۹۶۶ء تا ۱۹۹۲ء) بھی خدمات سرانجام دیں۔ (۳۲)

د۔ رسائل کی ادارت

اشفاق احمد کے ادبی سفر کا آغاز بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ ساتویں جماعت میں انھوں نے پرچہ ''علم الوقیع'' نکالا تھا۔ اشفاق احمد اس بارے میں اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ:

> ''میں نے چھٹی یا ساتویں جماعت میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے میں، میں نے ایک پرچہ بھی نکالا تھا، جس کا نام ''علم الوقیع'' رکھا تھا۔ میرا پہلا باقاعدہ افسانہ ''توبہ'' ۱۹۴۴ میں ''ادبی دنیا'' میں چھپا۔'' (۳۳)

اشفاق احمد اپنی زندگی کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

> ''میں نے ادبی زندگی کی ابتدا اسکول کے زمانے میں شاعری سے کی کچھ بے وزن سی نظمیں لکھیں۔ پھر جلد ہی افسانہ نگاری کی طرف آ گیا اور ۱۹۴۳ء میں پہلا افسانہ لکھا۔ میں نے اسے ساقی میں چھپنے کے لیے دہلی بھیجا۔ وہاں سے واپس آ گیا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ خیر میں نے اسے مولانا صلاح الدین احمد کے رسالے ''ادبی زندگی'' میں شائع کرا دیا۔ انھوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور چلتا ہی رہا۔'' (۳۴)

اشفاق احمد نے ''داستان گو'' اور ''لیل و نہار'' کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ اس بارے میں ریاض محمود ''داستان گو'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ غالبًا ۱۹۶۰ء کی بات ہے کہ اشفاق صاحب ان دنوں ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کے ایڈیٹر تھے کچھ عرصے بعد وہ لیل و نہار کی ایڈیٹری چھوڑ کر ریڈیو پاکستان لاہور سے بحیثیت سکرپٹ رائٹر منسلک ہو گئے۔'' (۳۵)

اشفاق احمد اردو رائٹرز کے مطابق:

> ''وطن واپس آ کر ادبی مجلّہ ''داستان گو'' جاری کیا، دو سال ہفت روزہ ''لیل و نہار'' لاہور کی ادارت

کی۔"(۳۶)

اسی طرح اشفاق احمد کے ادبی سفر کے بارے میں باشعور پاکستان میں ہے کہ:

"He started writing stories in his childhood, which were published in Phool [Flower] magazine. After returning to Pakistan from Europe he took out his own Literary magazine, Dastango [Story Teller] and joined Radio Pakistan a Script writer, He was made editor of the popular urdu weekly Lail-o-Nehar (Day and Night) in place of famout poet Sufi Ghulam Mustafa Tabassum by the Government of Pakistan."(۳۷)

علم و ادب سے وابستگی اشفاق احمد کی گھٹی میں شامل تھی۔

ہ۔ علمی اداروں اور مجالس کی رکنیت

اشفاق احمد اپنی زندگی میں بہت سے علمی اداروں اور مجالس کے اہم رکن رہے۔ جو درج ذیل ہیں:

ممبر انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد، اسلام آباد

ممبر پاکستان کورسز کمیٹی، بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن

ممبر کمیٹی آف کورسز برائے پاکستان کلچر، اسلام آباد

ممبر بورڈ آف سٹڈیز (پنجابی)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ممبر اکادمی ادبیات پاکستان (Executive body)، اسلام آباد

ممبر، انجمن ترقی اردو بورڈ، کراچی

ممبر مرکزی کمیٹی برائے پاکستان، برکلے اردو پروگرام، برکلے یونیورسٹی، امریکہ

ممبر ہجرہ کمیٹی، اسلام آباد

ممبر نیشنل کونسل آف دی آرٹس، اسلام آباد

اعزازی چیف ایڈیٹر ماہنامہ ''سکھی سکھر'' لاہور

ممبر نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد

ممبر افیا کی مجلس علمی، لاہور

ممبر پاکستان سٹینڈرڈ انسٹیٹیوشن، کراچی

ممبر پبلک لائبریریز، لاہور

ممبر اردو ڈکشنری بورڈ، لاہور

ممبر پاک مشاورتی کمیٹی

ممبر ایگزیکٹو باڈی لوک ورثہ، اسلام آباد (۳۸)

و۔ اعزازات

اشفاق احمد کو ان خدمات کے سلسلے میں بے پناہ اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کی وفات پر انٹرنیشنل نیوز پیپر خلیج ٹائمز میں شائع ہوا کہ:

The government gave Ahmed the Sitare-e-Imtiaz. Its highest civilian award. In recoginzation of his contribution to urdu litrature." (۳۹)

اشفاق احمد وہ خوش قسمت انسان ہیں جن کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی کیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں ''تمغہ حسن کارکردگی'' پیش کیا گیا۔ چار مرتبہ گریجویٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ''مجید الملکی'' ایوارڈ دیا گیا۔ ''دوحہ قطر ایوارڈ'' دیا گیا، گورنمنٹ کالج لاہور نے ان کی علمی و ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے ۲۰۰۴ء میں ''اشفاق احمد چیئر'' کا بھی قیام کیا۔ (۴۰)

ز۔ اشفاق احمد کی علمی و ادبی خدمات

ادب کی دنیا میں ''اشفاق احمد'' کا نام ایک دبستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اردو نثر کی تمام اصناف کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اپنایا اور ساتھ نبھایا اور ہر میدان میں کمال مہارت سے قارئین، سامعین اور شائقین کے دل جیت لیے۔ نظم و نثر کی ہر صنف میں جہاں انھوں نے کمال کے جوہر دکھائے وہاں بنی نوع انسان کے لیے آسانیاں اور خیر بھی

فراہم کرنے کی کاوش کا اظہار ہر تخلیق سے عیاں ہوتا ہے۔

''اپنی جوانی کے زمانے میں بھی وہ بزرگوں کی طرح ہر کسی کی خیر مانگتا، ہر کسی کا بھلا چاہتا۔''(۴۱)

اشفاق احمد کی علمی و ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ بچوں کے رسالوں میں لکھنے والا کہانی کار مستقبل کا صوفی بابا بن کر لوگوں کے دلوں پر راج کرنے لگا۔

ملاحظہ فرمائیے:

''گورنمنٹ کالج سے ایم اے کی تدریس کے شروع ہوتے ہی ایک طالب علم افسانہ نگار سامنے آیا۔ اشفاق احمد نے قصباتی معصومیت، شرارت بھری ذہانت اور گہرے مشاہدے سے چلبلی نثر کا ایسا نمونہ تیار کیا تھا جس سے محفوظ ہونا آسان اور جس کی نقل مشکل ہے۔ اردو کے دس بہترین افسانوں کی کوئی فہرست ''گڈریا'' سے بے نیاز نہیں ہوسکتی۔ پھر نشریات اور عہدوں کی طرف نکل گئے۔ ترقی کے رستے پر قدم رکھا تو روحانیت کے دروازے بھی کھلتے گئے۔ ان غلام گردشوں میں ایسی بھول بھلیاں تھیں کہ افسانہ نگار اشفاق احمد لوٹ کر نہیں آیا۔''(۴۲)

محمد اکرام چغتائی لکھتے ہیں کہ:

''انھوں نے اپنا پہلا افسانہ ۱۹۴۱ء میں لکھا جب ان کی عمر ۱۷ سال تھی۔''(۴۳)

اشفاق احمد نے اپنے ادبی سفر کے آغاز میں ''گڈریا'' جیسا افسانہ لکھ کر بھرپور شہرت حاصل کی۔ اشفاق احمد اردو رائٹر میں ہے کہ:

''۱۹۵۳ء میں اردو کا لازوال افسانہ ''گڈریا'' لکھ کر شہرت دوام حاصل کی۔''(۴۴)

اشفاق احمد نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ہی افسانے سے کیا، احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ:

''منٹو، بیدی، کرشن اور عصمت کی موجودگی میں نئے افسانہ نگاروں کا نمایاں ہونا بہت دشوار تھا مگر اشفاق احمد نے اس دشواری کو بڑی سہولت اور خود اعتمادی سے طے کر لیا۔ وہ اس فن کی سبھی جہات پر استادانہ مہارت سے حاوی ہیں۔ وہ اپنے موضوع اور کرداروں کے انتخاب میں بھی منفرد اور جس بے تکلفی اور بے ساختگی سے وہ کہانی سناتے ہیں وہ بس انہی کا حصہ ہے۔''(۴۵)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں انسانی زندگی کے حقائق کو بیان کرتے ہیں چاہے وہ حقیقتیں تلخ ہیں یا شیریں اس سے ان کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ان کی اس خصوصیت کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد کی افسانہ نگاری کی کیا صورت ہے؟ میرا جواب ہے کہ وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔''(۴۶)

ادب برائے زندگی جو افسانوی ادب کا حسن ہے۔ اشفاق احمد کی کی افسانہ نگاری کا خاصہ ہے۔اشفاق احمد کو ابتدا میں ہی سعادت حسن منٹو جیسے افسانہ نگاروں سے داد ملی۔اس بارے میں خالد حسین لکھتے ہیں کہ:

"His first stories were publised in the early years of independence and manto, the man who thumbed his nose at all work except his own, shook his head in approval, He liked Ashfaq and he praised him."(۴۷)

منٹو صاحب اشفاق احمد کی افسانہ نگاری کو کھلے دل سے سراہتے ہیں،اس بارے میں اے حمید لکھتے ہیں کہ:

''ایک بار میں اور اشفاق احمد ان سے ملنے گئے تو منٹو صاحب نے اشفاق کے افسانے کی تعریف کی۔ اشفاق جھینپ گیا...... چہرہ سرخ ہو گیا اور بولا۔''وہ تو منٹو صاحب بس......''
منٹو صاحب نے عقابی آنکھوں سے اشفاق کی طرف دیکھ کر کہا:
''بس کیا......اچھا افسانہ لکھا ہے تم نے......''(۴۸)

اشفاق احمد درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ ہر روپ میں ان کے اندر سکھانے، پڑھانے، درس دینے کی خو موجود رہی۔انھوں نے باقاعدہ طور پر اندرون و بیرون ملک اپنے فرائض بطور معلم بخوبی سرانجام دیئے مثلاً:

"He also served as a teacher in government Dayal Singh College, Lahore, He also served as Lecturer of urdu Litrature in rome University."(۴۹)

اشفاق احمد افسانہ نگار، ڈراما نگار، سکرپٹ رائٹر، داستان گو، مقرر، صداکار، مزاح نگار، تجزیہ نگار، کالم نگار، شاعر، مترجم، فلاسفر، مفکر اور صوفی تھے۔ وہ متنوع الجہات شخصیت کے مالک تھے ان کے بارے میں عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد واحد نہیں رہے بلکہ جمع ہو گئے ہیں تو صورت حال یہ ہے کہ کبھی ادب کے قارئین صرف افسانہ نگار اشفاق احمد کو جانتے تھے۔اب بہت عرصے سے وہ صرف افسانہ نگار نہیں، ٹیلی ویژن کے ڈراما نگار، ریڈیو کے تلقین شاہ، پنجابی کے شاعر، اعلیٰ درجے کے مقرر، زبردست قسم کے داستان گو نیز مفکر اور

فلاسفر کے علاوہ ماہرِ روحانیت، ماہر معاشیات، ماہر سماجیات، حتیٰ کہ ماہر جنسیات کی حیثیت بھی اختیار کر چکے ہیں اور جو آخری اعزاز ہے یہ عمر کے ایک خاص حصے میں انسان کو نصیب ہوتا ہے۔" (۵۰)

اشفاق احمد ہلکے پھلکے انداز میں ہنستے ہنساتے ایسا سنجیدہ پیغام قارئین، ناظرین اور سامعین کو دے جاتے ہیں کہ نم آنکھیں زیرِ تبسم لیے ہوئے روح تک تاثیر جاتی ہے۔ کیونکہ ان کے پیغامات روح سے روح تک پہنچتے ہیں۔ "پاکستان ٹائمز" میں ہے کہ:

"His subtle sens of humour is reflected in his long-running radio programmes and characters like "Talqeen Shah" while several Tv drama series based on his memorable plays of three decades ago are still enjoyed by the audience today. Their appeal lies in the universal truths of Life portrayed in human hopes, emotions, aspirations and relationships that touch the soul of people of all age groups." (۵۱)

ہر عمر، طبقے اور جنس کا فرد اشفاق احمد کے لکھے گئے افسانے، ڈرامے، ریڈیو پروگرامز، باتیں، ٹیلی ویژن پروگرامز دیکھتے، سنتے اور سراہتے ہیں۔ اشفاق احمد ان باتوں میں ایسا دلچسپ انداز اختیار کرتے کہ سننے والا ان کی گفتگو کے سحر میں کہیں کھو جاتا ہے کیونکہ اس کا خمیر سننے اور پڑھنے والوں کی اپنی زندگی سے اٹھتا ہے۔

اشفاق احمد اپنے ٹاک شوز میں زندگی کے ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے۔ دی نیوز کے مطابق:

"A part from his plays Ashfaq Ahmed also featured in talk shows in the electronic media, where almost everything under the sun was discussed with his typical early humour and wit." (۵۲)

اشفاق احمد اپنی تحریروں اور پروگرامز میں انسانی زندگی کی عکاسی حقیقی بنیادوں پر کرتے ہیں کیونکہ وہ زندگی کے ہر روپ کو قریب سے دیکھ چکے تھے۔ تقسیم کے وقت بھی انھوں نے رفیوجی کیمپس میں خدمات سرانجام دیں۔ وہ اپنے لوگوں کی بھلائی اور اصلاح کا جذبہ ابتدا سے ہی رکھتے تھے۔ اشفاق احمد رائٹر، براڈ کاسٹر کے مطابق:

"After partition, when Ashfaq Ahmed arrived at the Walton, refugee camp with millions of other migrants, he used to make announcements on megaphone around the clock. Leter he got a job in Radio Azad Kashmir, which was established on a truck, he used to drive around in various parts of Kashmir." (۵۳)

اشفاق احمد میں ابتدا ہی سے انسانیت کی فلاح کا جذبہ موجود رہا اور انھوں نے سچے جذبے اور لگن سے ہر ذریعہ کو اپنی تمام تر قوتوں اور خلوص کے ساتھ استعمال کیا اور انھیں ان خدمات کے صلے میں بہت سے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ان کی خدمات کا مختصراً جائزہ اردو انسائیکلو پیڈیا میں موجود ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''۱۹۵۳ء میں اردو کا لازوال افسانہ ''گڈریا'' لکھ کر شہرت دوام حاصل کی۔ دیگر تصانیف میں شامل ہیں (افسانے: ایک محبت سو افسانے، پھلکاری، اُجلے پھول، سفر مینا، سفر در سفر، کھٹیا وٹیا (پنجابی نظمیں) ہیمنگوے کے ناول (اے فیئر ویل ٹو آرمز'' کا ترجمہ، وداع جنگ، توتا کہانی، بند گلی اور ڈرامے: متاع غرور، ٹاہلی دے تھلے، حیرت کدہ، شہر کنارے، اُچے برج لاہور دے، مہمان سرائے۔ ٹی وی کے لیے متعدد سلسلے وار ڈرامے اور ریڈیو کے لیے اب تک (۱۹۹۶ء) ۴۸ ڈرامے اور ۲۲۹ فیچر لکھے ہیں۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے مقبول عام ہفتہ وار فیچر ''تلقین شاہ'' کے مصنف، پروڈیوسر اور اہم کردار میں ۱۹۷۹ء میں حسن کارکردگی کا صدارتی ایوارڈ ملا۔ ۱۹۹۱ء میں مرکزی سائنس بورڈ کے سربراہ بنے اور ۱۹۹۲ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔'' (۵۴)

اشفاق احمد کو ان کی زندگی میں ہی بے حد پذیرائی اور عوام کی محبت ملی، بہت سے اعزازات، انعامات اور ایوارڈز سے نوازا گیا۔ وہ لوگوں کے دلوں کو اپنی باتوں سے جیت لیتے ہیں۔ ڈیلی ٹائمز کے مطابق:

"One of the country's top literary figures and the winner of several national awards." (۵۵)

اسی طرح ''ڈان میں ہے کہ:

He was recipient of the President's Pride of performence and

Sitara-i-Imtiaz for meritorious services in the field of litrature and broadcasting."(۵۶)

اشفاق احمد نے پاکستانی قوم اور اردو زبان وادب کی ناقابل فراموش خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کی تحریریں، لفظ نہیں بلکہ روح میں اتر جانے والے نور کے دھارے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہی ہے کہ معاشرے میں امن وسلامتی ہو اور اس کے لیے وہ فرد اور معاشرے کا تعلق استوار کرنے میں مگن نظر آتے ہیں، فرد کی شخصیت اور کردار کی تعمیر میں جتے رہتے ہیں۔ باشعور پاکستان میں ان کی اس خدمت کو سراہتے ہوئے درج ہے کہ:

"Ashfaq Ahmed had a vision of peaceful soeiety that's why he globalized his message of character building and sacrifice through his intellectual writings."(۵۷)

....

افسانہ نگاری کے علاوہ اشفاق احمد نے ناول، ڈراما، فلم، سفر نامہ، تراجم، ٹیلی ویژن پروگرام اور ریڈیائی پروگرامز بھی کیے۔ امجد اسلام امجد نے اشفاق احمد کو ایک رجحان ساز ڈراما نگار کی حیثیت سے یاد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یوں کہہ لیجیے کہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۸۰ء تک اشفاق صاحب کے ڈرامے کا ایک Phase ہمارے سامنے آیا اور عوام نے اسے سراہا۔ اس کے بعد وہ ایک منفرد حیثیت سے سامنے آئے۔ انھوں نے طویل دورانیے کے کھیل لکھے اور ''توتا کہانی''، ''اور ڈرامے''، ''منچلے کا سودا'' جیسے لازوال ڈرامے دیکھنے کو ملے۔ یہ ان کا تبدیل شدہ Phase کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے فکر انگیز ڈرامہ نگار کا روپ دھارا اور اپنے ساتھ عوام کو بھی اس طرف موڑ دیا۔''(۵۸)

ڈرامے کے ساتھ ساتھ انھوں نے فلم پر بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے فلم سازی کے رجحان کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ:

''جب اشفاق احمد واپس آئے تو وہ فلم سازی کے جدید تصورات سے آگاہ اور جدید تکنیک کے رمز شناس تھے اور اسی انداز پر انھوں نے خود بھی ایک فلم پروڈیوس کی۔''(۵۹)

اشفاق احمد نے ریڈیو پر بھی بہت کام کیا۔ ان کے پروگرام تلقین شاہ کو خاص طور پر بہت کامیابی ملی۔ اس بارے میں جمیل ملک اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''ریڈیو پر اشفاق احمد نے بہت کام کیا اور اسی لیے تلقین شاہ نامی فیچر نے ریکارڈ توڑا اور پھر ریکارڈ قائم کیا۔'' (۶۰)

اشفاق احمد کے پروگرام ''زاویہ'' نے بھی شہرت کی بلندیوں کو چھوا۔ زاویے کے موضوعات اور حاضرین کا انتخاب اشفاق احمد خود کیا کرتے تھے، پروگرام کا مقصد انسانوں کو بھلائی اور خیر کا راستہ بتانا تھا۔ اس پروگرام نے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ اس بارے میں شوکت زین العابدین کہتے ہیں کہ:

''ناظرین نے اس پروگرام کو شدت سے پسند کیا اور ملک بھر سے اس پروگرام میں شرکت کے لیے درخواست کی جاتی تھی۔'' (۶۱)

اشفاق احمد نے تمام اصناف نثر کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے طور پر استعمال کیا۔ شاعری بھی، تراجم بھی کیے، سفرنامے بھی لکھے۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی بے پناہ پروگرام کیے۔ ایک سچے ادیب کے طور پر ان کے پیش نظر ایک ہی مقصد رہا اور وہ تھا عوام کی ترقی کے لیے راستے ہموار کرنا اور آسانیاں تقسیم کرنا۔ ان کی تقریباً تمام تر تصانیف کتابی شکل میں موجود ہیں اور ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ایک محبت سو افسانے:

اشفاق احمد کے تیرہ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ مکتبہ جدید، لاہور نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۹۲ ہے اور اس کا انتساب ''صاحب جی کے نام'' ہے۔ اس مجموعے میں ان کا پہلا افسانہ ''توبہ'' بھی شامل ہے۔ اس کے افسانے درج ذیل ہیں۔

توبہ (۶۲)، فہیم، رات بیت رہی ہے، تلاش، سنگ دل، مسکن (۶۳)، شب خون، عجیب بادشاہ، بندرابن کی کنج گلی میں، بابا، پناہیں، امی (۶۴)، توتا کہانی (۶۵)

اُجلے پھول:

اشفاق احمد کے افسانوں پر مشتمل دوسرا افسانوی مجموعہ ۱۹۵۵ء میں اپل بک ڈپو دی مال لاہور نے شائع کیا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۲۰۰ تھی اور اس میں ''گڈریا'' افسانہ شامل تھا۔ بعد میں غالب پبلشرز نے ۱۹۸۳ میں دوسری مرتبہ شائع کیا۔ اس کا انتساب ''قدرت اللہ شہاب'' کے نام ہے۔ تیسری مرتبہ اسے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۸۳ میں شائع کیا۔ اس کی پہلی تین اشاعتیں ''اُجلے پھول'' کے نام سے جبکہ آخری تین ''گڈریا'' کے عنوان سے ہوئیں۔ اس کے افسانے

درج ذیل ہیں:

اجلے پھول، گل ٹریا، تنکہ، حقیقت نیوش، توشے بلے، صفدر ٹھیلا، گڈریا (۶۸، ۶۷، ۶۶)، برکھا، ایلویرا

سفر مینا:

اشفاق احمد کا تیسرا افسانوی مجموعہ ۱۹۸۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ اس میں گیارہ افسانے شامل ہیں۔ تیسری مرتبہ ۲۰۰۷ء میں جب شائع ہوا تو اس میں سات سفرنامے اور ایک ناولٹ شامل ہو گیا۔ اس کا انتساب انیق، اثیر اور انیس کے نام ہے۔ صفحات کی تعداد ۳۹۵ ہے۔

افسانوں کی تفصیل:

اٹوٹ مان، قاتل، قصہ نل دمنیتی، چور، مانوس اجنبی، بیاجاناں (۶۹)، محسن محلّہ، پانچ میل دور کے عنوان سے سفر مینا میں شامل ہوا)، کالج سے گھر تک، گاتو، فل برائٹ

سفر ناموں کی تفصیل:

سواد روضۃ الکبریٰ، خوابوں کا جزیرہ، عرش منور ہے تورو (۷۰)، چنگھو پاکستان، چچا سام کے ساتھ (۷۱)، ماؤزے تنگ ایک یاد (۷۲)

ناولٹ: مہمان بہار

پھلکاری۔ ایک ہی بولی:

اشفاق احمد کا چوتھا افسانوی مجموعہ ۱۹۹۱ میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں افسانوں کی تعداد ۱۵ ہے اور صفحات کی تعداد ۱۲۳ ہے۔ پھلکاری کو ''ایک ہی بولی'' کے نام سے دوسری مرتبہ ۲۰۰۵ میں شائع کیا گیا۔ اس میں بھی صفحات کی تعداد ۱۲۳ ہی رہی اس کا انتساب ''ملاوجہی اور قلی قطب شاہ سلطانی کے نام'' ہے اس میں اردو کے وہ الفاظ جو غیر مستعمل ہو چکے ہیں کا استعمال خوبی سے کیا گیا۔ اس کے علاوہ دکنی زبان اور دیگر مقامی بولیوں کے متروک الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا۔

افسانوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

رکی ہوئی عمر، ایک ہی بولی، کالا بدل، سلامتے کی مار، چل چلی، اپنی ذات، جنگ نامہ زیتون، ڈھیچک چال، ضابطے

کی کارروائی، رشوت، داؤ، ننگ و ناموس، پچھیری، دوپہر ویلے، پھمن کہانی۔

صبحانے فسانے:

اشفاق احمد کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ، سنگ میل پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ۱۹۹۷ میں شائع ہوا۔ اس میں صفحات کی تعداد ۲۷۹ ہے اس کا انتساب ''اپنے محلے کے امام مسجد کے نام'' ہے۔ اس میں افسانوں کی تعداد بائیس ہے۔ جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

اماں سردار بیگم، خود بدولت (۷۳)، آڑھت منڈی (۷۴)، بٹیر باز، ماسٹر روشی، خانگی سیاست (۷۵)، مسرور مرثیہ (۷۶)، شازیہ کی رخصتی، بے غیرت مدت خان (۷۷)، بندر لوگ (۷۸)، ڈھور ڈنگر کی واپسی، رازداں (۷۹)، پل صراط اور پاسپورٹ (۸۰)، وکھو وکھ (۸۱)، قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا (۸۲)، مہمان عزیز (۸۳)، بیک گراؤنڈ (۸۴)، زرناب گل (۸۵)، دم بخود، بدل سے بدلی تک، چاند کا سفر، سہیل کی سالگرہ۔

طلسم ہوش افزا:

اشفاق احمد کا چھٹا افسانوی مجموعہ ۱۹۹۸ میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ''طلسم ہوش افزا'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۷۵ ہے۔ اس میں بارہ افسانے ہیں، اس کا انتساب ''دنیا کی سب سے عظیم سائنس فکشن ''طلسم ہوشربا کے نام'' ہے۔ اس کے افسانوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

قصاص (۸۶)، ملک مروت، ملک سونی (۸۷)، چھ چھکے بتیس، سعید جونیئر، آخری محلّہ، کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ (۸۸)، پوری جان کاری، قلارے، بدنی ضرورت، بولتا بندر، کوٹ ودود پاور ہاؤس۔

نئے رفیق، نئے راستے:

اشفاق احمد کا افسانہ ''نئے رفیق نئے راستے'' دسمبر ۱۹۵۷ میں ''صحیفہ ۳'' میں چھپا (۸۹)۔ یہ افسانہ اشفاق احمد کے کسی افسانوی مجموعے میں موجود نہیں ہے۔ یہ افسانہ صفحہ نمبر ۱۲۷ تا ۱۵۶ ہے۔

بدی بلی:

اشفاق احمد کا افسانہ ''بدی بلی'' ۱۹۹۴ میں سہ ماہی ''ادبیات'' اسلام آباد میں شائع ہوا۔ (۹۰) یہ افسانہ اشفاق احمد کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ صفحہ ۱۲ تا ۱۹ ہے۔

جیون جوت:

اشفاق احمد کا یہ غیر مطبوعہ افسانہ ''جیون جوت'' (۹۱) بانو قدسیہ کے افسانوی مجموعے ''ہجرتوں کے درمیاں'' میں لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز سے ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ یہ صفحہ ۱۲۴ تا ۱۳۵ ہے۔

کھیل تماشا (ناول):

اشفاق احمد کا سوانحی ناول ''کھیل تماشا'' پہلی مرتبہ ۲۰۰۰ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا، اس کے صفحات کی تعداد ۲۱۶ ہے۔ اس کا انتساب ''اپنے والد اور ان کے دوستوں چاچا شیر سنگھ، بھائی کرتار سنگھ اور تایا لابھ سنگھ کے نام'' ہے۔

مہمان بہار (ناولٹ):

''مہمان بہار'' اشفاق احمد کا واحد ناولٹ ہے جو پہلی مرتبہ ''مکتبہ لائبریری'' کے تحت اکتوبر ۱۹۵۵ میں شائع ہوا۔''(۹۲)

بعدازاں اشفاق احمد کے افسانوی مجموعے سفر مینا نے میں شامل ہو کر ۱۹۸۳ میں سنگ میل لاہور سے شائع ہوا۔

توتا کہانی (ڈراما سیریز):

ٹیلی ویژن ڈراما سیریز کو کتابی شکل میں اکتوبر ۱۹۸۳ میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ یہ کتاب ۴۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں کل تیرہ ڈرامے ہیں۔ ڈراموں کے الگ الگ نام نہیں بلکہ نمبرز دیئے گئے ہیں۔ اس کا انتساب ''ممتاز مفتی کے نام'' ہے۔

ایک محبت سو ڈرامے (ڈراما سیریز):

اشفاق احمد کی ٹی وی سیریز ایک محبت سو افسانے کا مجموعہ ہے۔ اسے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ اس میں ۲۲ ڈرامے ہیں۔ صفحات کی تعداد ۷۰۹ ہے۔ اس کا انتساب اشفاق احمد نے ایک ایسے بابا کے نام کیا ہے جس کو وہ نہیں جانتے۔ اس کتاب کے تعارف میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''پتہ نہیں اس بابے کا کیا نام تھا اور پتہ نہیں کہ اب وہ اس دنیا میں ہے بھی یا نہیں! میں اپنی یہ کتاب اس کی ذات گرامی سے معنون کرتا ہوں۔'' (۹۳)

ڈراموں کی تفصیل درج ذیل ہے:

قرۃ العین، اشتباہ نظر، دادا اور دلدادہ، معکوس رابطے، مراعات محبت، آغوش وداع، داستان حبیب، ڈولے کول، صنم گزیدہ، دیدہ پرخون، شانہ صبا، ثمن گوٹھ جو ڈرائیور، نسوں خواب، چانگھڑ، غریب شہر، ماہ کنعان، ہمت باطل، اجر اسود، زود پشیمان، معدن محبت، نردبان عرفان، لبیک لبیک۔

قلعہ کہانی (ڈراما سیریز):

اشفاق احمد کے ٹی وی ڈراموں کی سیریز قلعہ کہانی کی کتابی شکل ۱۹۹۰ء میں ماورا پبلشرز نے شائع کی۔ اس کے ڈراموں کی تعداد چھ ہے اور صفحات ۱۷۶ ہیں۔

ڈراموں کی تفصیل یہ ہے۔

مسعود سعد سلمان، پاداش، بلقیس دوراں، شہر آشوب، راہ راست، پاپ روپ۔

ننگے پاؤں (ڈراما سیریز):

اشفاق احمد کے منتخب ڈراموں کا مجموعہ ۱۹۹۱ء میں فیروز سنز سے شائع ہوا اس میں صفحات کی تعداد ۶۶۵ ہے اور کل ڈرامے سولہ ہیں اس کا انتساب ''اپنی آپا فرخندہ اور آپا فرحت کے نام'' ہے۔

ڈراموں کی تفصیل درج ذیل ہے:

چور بخار ڈراما ۸۲، ننگے پاؤں ڈراما ۸۳، متاعِ غرور ڈرامہ ۸۴، آسان سی بات ڈرامہ ۸۵، فہمیدہ کی کہانی، استانی راحت کی زبانی ڈرامہ ۹۵، طلسم ہوش افزاء، برگ آرزو، گوشہ نشین، تلاش وجود، گھاس، ڈھور ڈنگر، ٹوٹکا، پھول والوں کی سیر، تقریب امتحان، کوئی نہ ادا سنج ملا، نور باف۔

اور ڈرامے (ڈراما سیریز):

اشفاق احمد کی ٹی وی سیریز ''اور ڈرامے'' کو ۱۹۹۳ میں سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ اس میں ۱۱۴۲ صفحات ہیں اور ڈراموں کی تعداد ۲۵ ہے۔ کتاب کے آخر میں اشفاق احمد کی تحریر ''آخری بات'' کے عنوان سے شامل ہے۔

ڈراموں کی تفصیل درج ذیل ہے:

بندر جاتی اور مامتا، سردی اور سارو، قصائی اور مہنگائی، سگنل اور سنگل بیڈ، مائی اور کمائی، بابل اور بدلیس، گونگا اور کمپنی بہادر، مایا اور مون سون، عارف اور سکندر، آوارہ اور آواری، یٰسین اور ابا یٰسین، فرماں اور بردار، سنڈریلا اور سکینہ، طمع اور حطمہ،

چابی اور چابیاں (۹۴)، خواری اور سرداری، درد اور درمان، ایسی بلندی ایسی پستی، جبل شاہ اور سمندر خان، خسارے کی رات اور طفل خود معاملہ، مسئلہ اور مسائل، بند گلی اور کھلا راستہ، سائیں اور سکائی ٹرسٹ، احساس اور کمتری، گڈریا اور گھمنڈ۔

بند گلی (ڈراما سیریز):

اشفاق کے ڈراموں کی یہ سیریز سنگ میل لاہور نے ۱۹۹۵ میں شائع کی اس کے صفحات کی تعداد ۵۳۲ ہے اور اس میں ۷ ڈرامے شامل ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

دو دھاری تلوار، ناطے دار، ماما سیمی، گرین کارڈ ہے گھاٹ میں تگاہ ستم گر لگی ہوئی، دمی سٹی، یزمان کا موچی۔

مہمان سرائے : (مشہور زمانہ ٹی وی سیریل کارواں سرائے):

اشفاق احمد کے ٹی وی سیریل۔ کارواں کی مطبوعہ صورت ''مہمان سرائے'' سنگ میل نے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے صفحات ۲۱۵ ہیں۔ یہ تیرہ اقساط پر مشتمل ہے۔ اس کا انتساب ''ارثیہ، ارسلہ، بلال اور فاطمہ کے نام'' ہے۔

من چلے کا سودا (ڈراما سیریل):

''من چلے کا سودا'' ڈراما سیریل پہلی مرتبہ ۱۹۹۶ء میں القمر انٹرپرائز لاہور نے شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں اس کے صفحات کی تعداد ۴۵۵ ہے۔ دوسری مرتبہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۵ء میں شائع کی اس میں صفحات کی تعداد ۳۱۹ ہے۔ اس کا انتساب ''نور والوں کے ڈیرے کے نام'' ہے۔

حیرت کدہ (ڈراما سیریز):

اشفاق احمد کے ٹی وی ڈراموں کی یہ سیریز سنگ میل پبلی کیشنز نے ۱۹۹۵ء میں شائع کی۔ اس کے صفحات کی تعداد ۳۱۹ ہے اس کا انتساب ''انیق احمد کے نام'' ہے یہ سیریز ۱۳ ڈراموں قر مشتمل ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سونا ملا نہ پی ملے، میل ملاپ، بزغالہ اور بچہ زاغ، بہن بھائی، فرار، پیغام زبانی اور ہے، ایسی بلندی ایسی پستی، نیلی چڑیا، آدم زاد، بھوت نکالا، ہیرا من، ماسٹر رحمت علی، یہ تیرے پراسرار بندے۔

شاہلا کوٹ (ڈراما سیریل):

یہ ٹیلی ویژن ڈراما، ۲۰۰۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ تیرہ اقساط پر مشتمل ہے۔ صفحات کی تعداد ۳۸۸ ہے۔ اس کا انتساب کی جگہ ایک نوٹ درج ہے۔ انتساب کسی کے نام نہیں ہے۔

شہرآرزو (ڈراما سیریل):

یہ ٹی وی سیریل ۲۰۰۶ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔صفحات کی تعداد ۳۷۵ ہے۔چھبیس (۲۶) اقساط پر مشتمل ہے۔اس کا انتساب ''فہیم اور ممتاز'' کے نام ہے۔

ٹاہلی تھلے (ڈراما سیریل):

یہ پنجابی ٹی وی ڈرامہ سیریل ۱۹۹۰ء میں عزیز پبلشرز لاہور نے شائع کیا۔اس میں سب سے آخر میں ریڈیائی ڈراما ''ٹاہلی دے تھلے'' بھی شامل کیا گیا ہے جو الگ صورت ۱۹۷۲ء میں مکتبہ میری لائبریری سے شائع ہو چکا تھا۔

اُچے برج لہور دے (ڈراما سیریل):

اشفاق احمد کا ٹی وی سیریل ''اُچے برج لہور دے'' پہلی مرتبہ ۱۹۹۳ء میں عزیز پبلشرز نے شائع کیا۔

سفر در سفر (سفرنامہ):

اشفاق احمد کے اندرون ملک سفر کی یہ روداد ۱۹۸۱ میں غالب پبلشرز لاہور نے شائع کی۔اس کے صفحات کی تعداد ۲۶۳ ہے۔اس کا انتساب ''مفتی، مسعود عاد، اعظمی اور عمر'' کے نام ہے۔

سفر مینا (سفرنامہ):

اشفاق احمد کے امریکہ، چین، اٹلی اور سپین کے سفر ناموں پر مشتمل اس کتاب کو ۱۹۸۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ یہ سفر نامے گیارہ افسانوں اور ایک ناولٹ کے ساتھ شائع ہوئے۔اس میں ۷ سفر نامے شامل ہیں۔

سواد رومتہ الکبریٰ، خوابوں کا جزیرہ، عرش منور، ہے تورو، چنگھو پاکستان، چچا سام کے ساتھ، ماؤزے تنگ، ایک یاد

حسرت تعمیر۔تلقین شاہ (ریڈیائی فیچر):

اشفاق احمد کے ریڈیائی فیچر تلقین شاہ کے ۳۰ پروگرام ۲۰۰۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیے۔اس کے صفحات کی تعداد ۳۵۷ ہے۔

جنگ بجنگ۔تلقین شاہ (ریڈیائی فیچر):

اشفاق احمد کے ریڈیائی فیچر۔تلقین شاہ کے ۲۵ پروگرام کا مجموعہ ۲۰۰۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا اس کے صفحات کی تعداد ۳۰۲ ہے۔

گلدان۔ تلقین شاہ (ریڈیائی فیچر) :

اشفاق احمد کے ریڈیائی فیچر تلقین شاہ کے ۳۵ پروگرامز کا مجموعہ ۲۰۰۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ یہ جنگ بجنگ تلقین شاہ کا دوسرا حصہ ہے۔اس میں کل ۳۲۸ صفحات ہیں۔

دھینگا مشتی۔ تلقین شاہ (ریڈیائی فیچر) :

اشفاق احمد کے ریڈیائی فیچر کے پروگرامز ۲۰۰۴ء میں سنگ میل لاہور نے شائع کئے۔ اس میں ۳۴ پروگرام اور ۳۳۵ صفحات ہیں۔

ڈھنڈورا۔ تلقین شاہ (ریڈیائی فیچر) :

ریڈیائی فیچر تلقین شاہ کے ۴۱ پروگراموں کی مطبوعہ صورت ۲۰۰۴ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔اس میں صفحات کی تعداد ۴۱۴ ہے۔

شوراشوری۔ تلقین شاہ (ریڈیائی فیچر) :

ریڈیائی فیچر ''تلقین شاہ'' کی مطبوعہ صورت ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آئی۔اس میں ۴۵ پروگرام شامل ہیں۔سنگ میل لاہور نے اسے شائع کیا۔صفحات کی تعداد ۴۲۵ ہے۔

آسودگی۔ تلقین شاہ (ریڈیائی فیچر) :

ریڈیائی فیچر ''تلقین شاہ'' کی مطبوعہ صورت ۲۰۰۷ء میں جسے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔اس میں ۵۲ پروگرام شامل ہیں۔صفحات کی تعداد ۵۱۲ ہے۔

بندہ زمانہ۔ تلقین شاہ (ریڈیائی فیچر) :

ریڈیائی فیچر 'تلقین شاہ' کے ۳۸ پروگرام، ۲۰۰۷ء میں سنگ میل لاہور نے شائع کیے۔صفحات کی تعداد ۳۶۰ ہے۔

آشیانے۔ تلقین شاہ (ریڈیائی فیچر):

اشفاق احمد کے ریڈیائی فیچر ۲۰۰۷ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیے۔اس میں ۲۴ پروگرام شامل ہیں۔ ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

زنجیر تعلق ۔ تلقین شاہ (ریڈیائی فیچر) :

اشفاق احمد یہ ریڈیائی فیچر ۲۰۰۸ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا اس میں ۵۲ پروگرام شامل ہیں۔ صفحات کی تعداد۵۱۲ ہے۔

کھٹیا وٹیا (پنجابی شاعری):

اشفاق احمد کی پنجابی شاعری کا مجموعہ ''کھٹیا وٹیا'' کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۹۸ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں صفحات کی تعداد ۱۲۰ ہے۔ اس میں اشفاق احمد نے نظموں کے عنوان نہیں دیئے۔ بلکہ ساری نظموں کے نمبر دیئے ہیں اس کا انتساب اشفاق احمد نے ''میری دسویں تے ایف اے دی درمیانی مدت وچکار جیون والی سعدیہ مرحومہ کے نام'' ہے۔ اس میں ۴۹ نظمیں شامل ہیں۔

عرض مصنف:

اشفاق احمد کی یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کا پیش لفظ بانو قدسیہ نے تحریر کیا۔ اس کا انتساب ''ادیب برادری کے نام......محبت کے ساتھ'' ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۴۳۲ ہے۔ اس میں مضامین کے چھ حصے ہیں جس میں مختلف مضامین شامل ہیں۔ جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

عرض مصنف	......	۱۵ مضامین
وطن، وطن، وطن	......	۷ مضامین
شخصیات	......	۷۷ مضامین
ریڈیو کالم	......	۱۷ مضامین
اردو اور اس کے مسائل	......	۱۰ مضامین
کلچر اور ثقافت	......	۱۰ مضامین

بابا صاحبا:

اشفاق احمد کی یادوں پر مشتمل یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کے آغاز میں ''بابا صاحبا......ایک واجبی سا تعارف'' بانو قدسیہ نے تحریر کیا ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۶۲۸ ہے۔

زاویہ:

اشفاق احمد کی عارفانہ گفتگو پر مشتمل ٹیلی ویژن کے ۴۷ پروگراموں کی مطبوعہ صورت، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۴ء میں شائع کی۔صفحات کی تعداد ۳۲۰ ہے۔

زاویہ ۲:

اشفاق احمد متصوفانہ ٹیلی ویژن پروگراموں کی مطبوعہ صورت زاویہ (جلد دوم) ۲۰۰۵ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی۔اس میں ۵۲ پروگرام شامل ہیں۔صفحات کی تعداد ۳۲۰ ہے۔

زاویہ ۳:

زاویہ جلد سوم کا تیسرا حصہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۶ میں شائع کی۔اس میں ۵۵ پروگرام شامل ہیں۔اس کے صفحات کی تعداد ۳۲۰ ہے۔۵۶ نمبر پر کتاب کے آخر میں بانو قدسیہ کی تحریر ''زاویہ سے زاویہ تک'' شامل ہے۔

میرا وطن میرا پاکستان:

اس کتاب میں پاکستان کی مختصر تاریخ ہے۔ یہ کتاب ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔تحریک پاکستان سے قیام پاکستان تک مختصر حالات و واقعات قلم بند کیے گئے ہیں۔

ودائِ جنگ (ترجمہ):

یہ ارنسٹ ہیمنگوے کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔اس کے تعارف میں درج ہے کہ ''ارنسٹ ہیمنگوے کی شہرہ آفاق تصنیف "A fare well to arms" کا ترجمہ ''وداع جنگ'' دو جلدوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ترجمہ اشفاق نے کیا ہے جو جانے پہچانے ادیب اور صحافی ہیں۔'' یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۶۰ میں یونائیٹڈ بک لمیٹڈ لاہور سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔جلد اول ۲۱۶ اور جلد دوم ۲۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۰ء میں اسے مکمل ایک جلد میں شائع کی۔ اور یہ ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

چنگیز خان کے سنہرے شاہین (ترجمہ):

یہ تصنیف ریٹا رچی کے ناول "Golden Hawks of Genghis Khan" کا اردو ترجمہ ہے۔اسے

پہلی مرتبہ مکتبہ معین الادب نے ۱۹۶۰ میں شائع کیا۔اس کے صفحات کی تعداد ۳۹۸ ہے۔

دوسروں سے نباہ (ترجمہ):

یہ تصنیف ہیلن ہیکٹر کی کتاب "Getting Along With Others" کا ترجمہ ہے اسے گوشہ ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔

قہکار (ترجمہ۔لطائف):

یہ لطائف پر مشتمل کتاب ہے جو داستان گو پبلشرز سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔اس میں غیرملکی زبان کے لطائف کے تراجم پیش کیے گئے ہیں۔

گرما گرم (ترجمہ۔لطائف):

یہ انگریزی اور فارسی زبان کے لطائف کے تراجم پر مشتمل ہے۔اسے مکتبہ میری لائبریری نے ۱۹۵۲ء میں شائع کیا۔

اردو کے خوابیدہ الفاظ (ترتیب وتدوین):

اشفاق احمد، محمد اکرام چغتائی اور ادارت کے عملے کے دیگر افراد کی کاوشوں سے اپریل ۱۹۷۲ء کو مرکزی اردو بورڈ کے ''اردو کے خوابیدہ الفاظ'' کے نام سے شائع ہوئی۔اردو کے وہ الفاظ جو غیر مستعمل ہو چکے ہیں۔انھیں زندہ کرنے کی کاوش ہے۔اس میں الف سے ی تک حروف سے شروع ہونے والے خوابیدہ الفاظ کی فہرست ہے۔صفحات کی تعداد ۹۵ ہے۔

ہفت زبانی لغت (ترتیب وتدوین):

اس لغت کو اشفاق احمد، محمد اکرام چغتائی اور فضل اقدر فضلی نے ترتیب دیا۔اس کی اشاعت ۱۹۷۴ء میں مرکزی اردو بورڈ کے زیر اہتمام ہوئی۔اس کے صفحات کی تعداد ۱۸۰ ہے۔

فرہنگ اصطلاحات (ترتیب وتدوین):

یہ تین جلدوں پر مشتمل فرہنگ ۱۹۸۴ء میں اردو سائنس بورڈ لاہور سے شائع ہوئی۔یہ ۱۹۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ کتاب اشفاق احمد اور محمد اکرام چغتائی کی کاوشوں سے ترتیب دی گئی۔

قاموس مترادفات:

یہ کتاب ۱۹۸۶ء میں مرکز اردو بورڈ لاہور سے شائع ہو۔ ۱۱۱۶صفحات پر مشتمل ہے۔ وارث سرہندی، اخلاق احمد دہلوی اور اشفاق نور کی کاوشیں بھی اس میں شامل ہیں۔

ذکر شہاب:

قدرت اللہ شہاب (مرحوم) کی یاد میں اردو سائنس بورڈ کے لیے ان کی خدمات کو خراج عقیدت کے طور پر اس کتاب کو مرتب کیا گیا۔ یہ کتاب ۱۹۸۷ میں اردو سائنس بورڈ لاہور سے شائع ہوئی۔

....

علم و دانش، دانش وحکمت، محبت و خدمت کا یہ استعارے ستمبر۲۰۰۴ء بروز منگل اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

روزنامہ مساوات کے مطابق:

''معروف مصنف اور دانشور اشفاق احمد منگل کو لاہور میں انتقال کر گئے ان کی عمر اسی سال تھی۔'' (۹۵)

منگل کی شام ان کو ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں دفنایا گیا۔

"He was laid to rest on Tuesday evening at graveyard of Model Town." (۹۶)

اشفاق احمد کو اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں بے پناہ شہرت نصیب ہوئی اور وہ جب تک زندہ رہے، خواص عام سب میں یکساں مقبول رہے۔ مثلاً:

''اشفاق احمد نے پہلے افسانے ''گڈریا'' نے ہی اردو ادب میں دھوم مچا دی۔'' (۹۷)

اشفاق احمد نے اپنی زندگی میں کامیابی سے بھرپور لطف اٹھایا۔ بہت کم ادیب ایسے ہوتے ہیں جو اپنی زندگی میں ہی عوام کے دلوں میں جا بستے ہیں اشفاق احمد ایسے ہی ادیب تھے۔

''اشفاق احمد کو زندگی میں بہت عروج ملا۔'' (۹۸)

۷ستمبر۲۰۰۴ء کا دن ساری قوم کے لیے تاریکی کا دن بن کر رہ گیا۔ ۸ستمبر۲۰۰۴ء کو پاکستان کے ہر انگریزی و اردو اخبار میں یہ سنسنی خیز خبر موجود تھی۔ جس پر ساری قوم افسردہ تھی۔ اشفاق احمد ایسی شخصیت کے مالک تھے کہ ان کی وفات پر حکمران، سیاست دان، دانش ور، صوفی اور ادیب سب خستہ حال اور شکستہ دل دکھائی دیتے تھے۔ ان کی وفات پر ''اشفاق

احمد......ایک اجمال''، ''گمشدہ لوک دانش کا کھوجی''، ''تلقین شاہ کی آواز مرگئی''، ''خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا'' (داستان سرائے کا داستان گو......ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے، ''چوپال اجڑ گئے''، ''اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا'' جیسے تعزیت نامے شائع ہوئے۔علمی و ادبی حلقوں میں آہ و بکا کا شور مچ گیا۔ ملاحظہ فرمائیے:

ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا کے مطابق ''کسی کو عہد ساز کہا جا سکتا ہے تو وہ بلا شبہ اشفاق احمد ہیں جن کے افکار و خیالات نے دوستوں کو متاثر کیا۔

حکیم سرو سہارنپوری: ''اشفاق احمد کی رحلت ہماری ادبی اور ثقافتی زندگی کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

افتخار عارف: ''اشفاق احمد کی وفات ایک قومی اور تہذیبی سانحہ ہے۔'' (۹۹)

امجد اسلام امجد: ''اشفاق احمد ہمارے دور کے Greats میں شامل تھے۔ اردو ادب میں ان کی حیثیت ''آل راؤنڈر'' کی تھی۔(۱۰۰)

ڈاکٹر وحید قریشی: ''اس کی محبت دوستوں تک محدود نہیں رہی بلکہ ہر شخص کے لیے اس کے دل میں محبت کا جذبہ بیدار رہتا تھا اور آج اس کی ٹکر کا کوئی ادیب مجھے دکھائی نہیں دیتا۔'' (۱۰۱)

ڈاکٹر اختر شمار: ''آپ ایک پہلو وار شخصیت کے مالک تھے ان کی موت ایک عہد کی موت ہے۔'' (۱۰۲)

اے۔جی جوش: انھوں نے جو لکھا اور جتنا لکھا آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔(۱۰۳)

عدنان اقبال: ''اشفاق احمد قوم کا قیمتی اثاثہ ہے۔'' (۱۰۴)

ابصار عبدالعلی: ''اشفاق احمد کی وفات سے اردو ادب کا زریں عہد ختم ہو گیا لیکن ان کی تخلیقات کی زندگی خضر سے کم نہیں۔'' (۱۰۵)

ڈاکٹر انور سدید: ''انھوں نے جس انسان کو اپنے افسانوں میں چلتے پھرتے، بولتے اور سماجی واقعات پر اپنا تاثر ظاہر کرتے دکھایا ہے وہ آج کا حقیقی انسان ہے۔'' (۱۰۶)

اعجاز رضوی کی نظم ملاحظہ فرمائیے:

وہ صوفی تھا:

اپنی چادر خود بنتا تھا

اس کی چادر رنگ برنگے پھولوں سے ملتی جلتی تھی

وہ صوفی تھا

وہ صوفی تھا(۱۰۷)

عمران نقوی:

جادو مزاج مسافر تھا۔ چند پل یہاں مقیم رہا، اپنے سحر سے دلوں کے قلعے مسخر کرتا رہا۔ اپنی باتوں کے طلسم سے باطن کے در وا کرتا رہا۔''(۱۰۸)

علمی وادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ حکمرانوں اور سیاستدانوں نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

سابق صدر پرویز مشرف نے اپنے دکھ کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ:

President Pervez Musharaf in his condolence message said "the literary world has indeed lost one of its distinguished personalities."(۱۰۹)

اسی طرح شوکت عزیز نے کہا کہ

Minister Shaukat Aziz said Ashfaq Ahmed who had authered 20 books was a great social reform of his age and a torch bearer in high lighting the social issues."(۱۱۰)

اس وقت کے گورنر پنجاب خالد مقبول نے شدید غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

Punjab governer Maqbool has expressed his deep sense of grief and sorrow over the death of eminent intellectual, writer and broadcaster Ashfaq Ahmed Khan. (۱۱۱)

وزیراعلیٰ پرویز الٰہی نے ''داستان سرائے'' جا کر اہل خانہ کے ساتھ تعزیت کی اور کہا کہ:

''اشفاق احمد کا انتقال علمی اور ادبی ہی نہیں پورے ملک کا نقصان ہے۔''(۱۱۲)

پنجاب اسمبلی میں اشفاق احمد سے عقیدت کا اظہار کیا گیا اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت بھی کی گئی۔

''گزشتہ روز پنجاب اسمبلی میں ملک کے معروف دانشور اشفاق احمد مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔''(۱۱۳)

پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور سابق وزیراعظم چوہدری شجاعت حسین نے بھی گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

''اشفاق احمد کے انتقال سے ملک صوفی دانشور سے محروم ہو گیا۔'' (۱۱۴)

سابق ناظم میاں عامر نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ: ''لاہور کی اہم شاہراہ ''صوفی دانشور'' سے منسوب کریں گے۔'' (۱۱۵)

معراج الہدین نے روزنامہ جسارت سے کہا کہ: ''عظیم قومی نقصان ہے۔'' (۱۱۶)

اس موقع پر بشریٰ رحمٰن نے کہا کہ ''اشفاق احمد ادب کے حوالے سے روشنی کا مینار تھے'' (۱۱۷)

ادیبوں، دانش وروں، حکمرانوں، سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ اداکاروں، فنکاروں اور گلوکاروں کی طرف سے بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف ہمیشہ ہوا، ۲۳ اکتوبر ۲۰۱۰ء میں پی ٹی ہوم کی طرف سے انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا جس میں اداکاروں، ہدایتکاروں، صداکاروں اور ادبا برادری کی طرف سے ہدیہ عقیدت پیش کیا گیا جو پیش خدمت ہے۔ اس موقع پر فردوس جمال نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اشفاق احمد مذہب کی اصل روح سے واقف تھے، وہ کہتے ہیں کہ:

''وہ دوزخ اور جنت کے چکر میں نہیں رہتے تھے بلکہ اللہ سے محبت میں رہتے تھے۔'' (۱۱۸)

اشفاق احمد کی اسی مذہبی قدر کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ:

> ''اشفاق احمد بنیادی طور پر بے حد مذہبی تھے مگر مذہب کو انھوں نے صوفیا کی تعلیمات کے توسط سے حاصل کیا اس لیے ملا کی پسندیدگی کے باوجود خود نہ تو ملا بنے اور نہ ہی ملائیت پر مبنی بنیاد پرستی کو شعار زیست بنایا۔'' (۱۱۹)

اشفاق احمد ہمیشہ اپنے سے جونیئر لوگوں کے لیے ترقی کی راہیں پیدا کرتے رہتے اور ان کو مکمل گائیڈنس دیتے ان کی اس صفت کے بارے میں یونس جاوید کہتے ہیں کہ:

''جونیئر ادیبوں کو آگے آنے کا موقع دیں ان میں یہ خوبی تھی۔'' (۱۲۰)

اشفاق احمد کی وفات نے کسی مخصوص حلقے یا گروہ کو نہیں بلکہ سارے معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ واقعی درحقیقت قوم کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اشفاق احمد بطور ''صوفی بابا'' اس بات کا دھیان گیان رکھتے تھے۔ سفر در سفر میں ''میرے مرنے پر کیا ہوگا'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''لوگ میری کمی کو شدت سے محسوس کریں گے، رات کو جب ٹی وی پر خبرنامہ میں یہ خبر نشر ہو گی تو بڑے لوگوں کو صدمہ ہوگا۔'' (۱۲۱)

آفتاب احمد کا بچپن سے ہی اپنے چچا سے بے حد لگاؤ تھا اور ان کی آخری عمر تک اس محبت اور عقیدت میں ذرا بھر

بھی فرق نہ آیا۔ اشفاق احمد کے بغیر ان کے لیے زندگی کا تصور سوہان روح تھا اور اشفاق احمد اس بات سے بخوبی واقف تھے یہی وجہ ہے کہ ''میرے مرنے پر کیا ہوگا'' میں آفتاب احمد کو چشم تصور سے یوں دیکھتے ہیں کہ:

''آفتاب احمد کو جب ٹیلی فون پر یہ دلدوز خبر ملے گی تو وہ جی بھر کر روئے گا اور پھر رات بھر روتا ہی رہے گا۔ اس شام ضرور کوئی اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے گھر چھوڑنے جائے گا۔ پتہ نہیں آفتاب کو کیا ہو گیا ہے۔ بات بے بات رونے لگتا ہے اور اس کی آنکھیں ہر وقت بھری رہتی ہیں۔ پھر میرا گزر جانا تو اس کے لیے قیامت سے کم نہیں ہوگا۔''(۱۲۲)

اشفاق احمد سچ کہتے تھے ان کا جانا قیامت سے کم نہیں۔ ان کے جانے کے بعد اردو علم و ادب میں جو خلا آیا ہے وہ کسی صورت پر تو کیا ہونا تھا اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ نہ کوئی تلقین شاہ ہے اور نہ ہی ''زاویہ'' کے ''بابا جی'' ہیں۔ داستان سرائے خاموش ہے۔ اک ہو کا عالم ہے جو در و دیوار سے لپٹا ہے۔ لیکن اپنی تحریروں کے ہر حرف میں وہ آج بھی زندہ ہیں۔ ان کا قاری، ان کا دوست بھی ہے اور بھائی بند بھی ہے۔ مرید بھی ہے اور مخالف بھی ہے لیکن بہرصورت عوام سے جڑے رہنے کا ہنر صرف انہی کا خاصہ ہے۔ معاشرے کی فلاح، انسان کی انفرادی و اجتماعی نشوونما اور روح کی بقاء کے لیے انھوں نے بے شمار اور ان گنت کاوشیں کیں۔ چاہے وہ مہاجرین کے کیمپوں میں جگہ جگہ پھرتی ہوئی گاڑی میں صداکار کی صورت میں ہوں یا ''زاویہ، ٹیلی ویژن پروگرام میں سرتا پا پیکر تصوف ہوں ہر صورت ایک ہی مقصد پیش نظر رہا اور وہ تھا انسانیت کی فلاح اپنی کوشش میں اشفاق احمد مکمل طور پر کامیاب ہیں۔

حواشی

۱۔ اردو انسائیکلو پیڈیا، لاہور، فیروز سنز، چوتھا ایڈیشن، ۲۰۰۵، ص ۱۲۰

۲۔ اشفاق احمد کے شناختی کارڈ سے ان کی تاریخ پیدائش لی گئی ہے۔

۳۔ رابطہ، ماہنامہ، کراچی، مئی ۱۹۸۷، ص ۳۵

۴۔ http://urduadab4u.blogspot.com/2010/09/ashfaq-ahmed-autograph.html

۵۔ http://column.com.pk/category/shortstories/ashfaqahmed

۶۔ ''بیاض'' (ماہنامہ)، جلد ۱۲، شمارہ ۱۱۰، لاہور، نومبر ۲۰۰۴ء

۷۔ http://forum.urduworld.com/f135/ashfaq-ahmed.

۸۔ ادب لطیف (ماہنامہ)، لاہور، جلد ۷۰، شمارہ ۵، مئی ۲۰۰۵ء

۹۔ http://www-forum pakistan.com/ashfaq-ahmed thuAugust 09,2007, 10:43pm

۱۰۔ http://en.wikipedia.org/wiki/Ashfaq-Ahmed

۱۱۔ ''ماورا'' (ماہنامہ)، لاہور، جلد ۸، شمارہ ۹، ۲۰۰۷ء

۱۲۔ Dawn: Wednesday Sep, 2004

۱۳۔ خبریں، روزنامہ، سنڈے میگزین، لاہور، ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۰

۱۴۔ پاکستان روزنامہ، سنڈے میگزین، لاہور ۳۱ جولائی ۲۰۰۳

۱۵۔ جنگ، روزنامہ، سنڈے میگزین، لاہور، ۱۸ نومبر ۲۰۰۱

۱۶۔ فرمان فتحپوری، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار'' کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۲ء، ص ۲۷۲

۱۷۔ طاہر مسعود ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' کراچی، مکتبہ تخلیق ادب ۱۹۸۵، ص ۲۰۳

۱۸۔ مشمولہ: داستان سرائے کا ساز'' (مرتب: ابوعلی عبدالوکیل) لاہور، علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۴، ص ۹

۱۹۔ http://u4u.com/pub/index.u4u

۲۰۔ Yousaf Alamgirian :An Unforgettable personality" http:// www.hmari web.com/ articles/ articles.aspxid= 1788

۲۱۔ ثمینہ شہناز، ''اشفاق احمد کی افسانہ نگاری'' مملوکہ لائبریری، اورنٹیل کالج، ص۲

۲۲۔ شازیہ صدف ''اشفاق احمد کی ادبی خدمات۔ اردو ادب کے تناظر میں'' مملوکہ لائبریری پنجاب، ص۶۴

۲۳۔ اشفاق احمد کے اسسٹنٹ میاں مسعود سے راقمہ کی ملاقات کے دوران میں انھوں نے سدرہ ندیم کے مقالے سے دیکھ کر لکھ کر دیا۔

۲۴۔ راقمہ کی بانو قدسیہ سے ملاقات

۲۵۔ راقمہ کی انیق احمد کے ساتھ فون پر گفتگو

۲۶۔ ممتاز مفتی ''داستان گو'' مشمولہ ''اور اوکھے لوگ'' لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۱، ص ۱۰۷۔۱۰۶

۲۷۔ راقمہ سے ملاقات کے دوران بانو قدسیہ نے بتایا۔

۲۸۔ http://novelpk.com/ about-ashfaq-ahmed-www.googleadservices.com/ paged/ ack,/ and-complete-novels posted by umerlist/farooq 24 October 2011

۲۹۔ http// www.forumpakistan.com/ashfaq-ahmed-thuAug09-2007

۳۰۔ میاں مسعود نے اشفاق احمد کے ذاتی کاغذات میں سے دیکھ کر بتایا۔

۳۱۔ راوی، ''اشفاق احمد نمبر''، لاہور، جی سی یو، ۲۰۰۵ء، ص ۱

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ بحوالہ طاہر مسعود ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' مکتبہ، کراچی، تخلیق ادب، ۱۹۸۵، ص ۲۰۹

۳۴۔ اشفاق احمد ''اشفاق احمد'' مشمولہ: ''بالمشافہ۔ حسن رضوی'' لاہور، عمیر پبلشرز، ۱۹۹۵، ص ۴۹

۳۵۔ ریاض محمود، ''داستان گو'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۲۷

۳۶۔ http://www.urdumania.com/tag/ashfaq-ahmed-urdu-writer

۳۷۔ http:/www.bashoorpakistan.com/category/writers/ashfaq-ahmed

۳۸۔ راوی، ''اشفاق احمد نمبر'' لاہور، گورنمنٹ کالج، ۲۰۰۵ء، ص۲

۳۹۔ KhaleejTimes,Wednesday, September 8, 2004

۴۰۔ راوی، ''اشفاق احمد نمبر''، لاہور، جی سی او، ۲۰۰۵ء، ص۲

۴۱۔ اے حمید، ''داستان گو۔ اشفاق احمد'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۷

۴۲۔ http:/urduadab4u.blogspot.com/2010/09/ashfaq/ahmed/auotgraph

۴۳۔ محمد اکرام چغتائی ''اشفاق احمد اور السنہ غربیہ'' مشمولہ: ''راوی'' اشفاق احمد نمبر، لاہور، گورنمنٹ کالج۔ جلد۹۲، واحد شمارہ، اکتوبر۲۰۰۵، ص ۳۵

۴۴۔ http://www.urdumania.com/tag/ashfaq-ahmed-urdu-writer

۴۵۔ احمد ندیم قاسمی، ''اشفاق احمد'' مشولہ: ''معاصر'' لاہور، ادارہ معاصر، جلد۲ شمارہ ۳، ۲۰۰۲، ص

۴۶۔ فرمان فتحپوری، ڈاکٹر ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار'' کراچی، اردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۸۲، ص ۲۷۷

۴۷۔ http:/www.khalidhassan.net/2004/09/10/ashfaq-ahmed

۴۸۔ اے حمید، ''داستان گو۔ اشفاق احمد'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۱۶۔۱۵

۴۹۔ Business Recorder: Wednesday, sep 8, 2008

۵۰۔ http://u4u.com/pub/index.u4u

۵۱۔ The Pakistan Times, September 8,2004

۵۲۔ The News: Wednesday 8, 2004

۵۳۔ http:/www.mwf.com.pk/index/php/ashfaq-ahmed-writer-broadcaster

۵۴۔ اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروزسنز، چوتھا ایڈیشن، لاہور، فیروزسنز، ۲۰۰۵، ص ۱۲۳

۵۵۔ Daily Times: Wednesday Sep, 2004

۵۶۔ Dawn: Wednesday Sep, 2004

۵۷۔ http:/www.bashoorpakistan.com

۵۸۔ امجد اسلام امجد ''رجحان ساز ڈراما نگار'' مشمولہ: ''راوی''، گورنمنٹ کالج لاہور، ۲۰۰۵، ص ۸۸

۵۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر ''داستان سرائے کا داستان گو'' مشمولہ: ''راوی اشفاق نمبر'' ۲۰۰۵، ص ۸

۶۰۔ جمیل ملک، ''اشفاق احمد...... Top Shot'' مشمولہ: ''راوی اشفاق نمبر'' ۲۰۰۵، ص ۹۴

۶۱۔ شوکت زین العابدین ''زاویہ کی تاریخ'' مشمولہ: ''راوی۔ اشفاق نمبر'' ص ۸۵

۶۲۔ ''توبہ'' مشمولہ: ''ادبی دنیا''، لاہور، جلد نمبر ۲۴، شمارہ نمبر ۶، ۱۹۴۶

۶۳۔ ''مسکن'' مشمولہ: راوی، لاہور، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، مئی۔ جون ۱۹۴۹

۶۴۔ ''امی'' مشمولہ: ''نقوش''۔ لاہور

۶۵۔ ''توتا کہانی''، مشمولہ: ''ماہ نو'' جلد دوم چالیس سالہ مخزن، پاکستان، ادارہ مطبوعات، جولائی ۱۹۶۷

۶۶۔ ''گڈریا''، مشمولہ: ''نقوش''، لاہور، افسانہ نمبر ۳۷، ۳۸، جنوری، ۱۹۵۴

۶۷۔ ''گڈریا''، مشمولہ: ''نقوش''، ۵۲۔۵۳، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۲

۶۸۔ ''گڈریا''، مشمولہ ''بیسویں صدی کے بیس افسانے'' لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰

۶۹۔ ''بیاجاناں''، مشمولہ: ''سویرا'' لاہور، جنوری، فروری، مارچ ۱۹۷۸

۷۰۔ ''ہےتورو''، مشمولہ: ''داستان گو''، لاہور، جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۹، جولائی ۱۹۵۸

۷۱۔ ''چند روز چچا سام کے ساتھ'' مشمولہ: ''فنون''، لاہور: اشاعت خاص اکتوبر، نومبر ۱۹۶۲ میں سفر نامہ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ ''چچا سام کے ساتھ'' کے تعاون سے ''سفر مینا'' میں شامل ہوا۔

۷۲۔ ''ماوزے تنگ ایک یاد''، مشمولہ: سویرا: ۵۴، ۵۳، مارچ ۱۹۷۷

۷۳۔ ''خود بدولت''، مشمولہ: فنون، لاہور: شمارہ ۳ جون۔ جولائی ۱۹۹۰

۷۴۔ ''آڑھت منڈی''، مشمولہ: افکار، کراچی دسمبر ۱۹۹۰

۷۵۔ ''خانگی سیاست''، مشمولہ: افکار، بھوپال، ستمبر ۱۹۴۷

۷۶۔ ''مسرور مرثیہ''، مشمولہ: علامت، لاہور، اپریل ۱۹۹۰

۷۷۔ ''بے غیرت مدت خان''، مشمولہ: نقوش، لاہور، فروغ اردو، ستمبر ۱۹۸۶

۷۸۔ ''بندر لوگ''، مشمولہ: نیا دور، کراچی، شمارہ ۵۹، ۶۰

۷۹۔ ''راز داں''، مشمولہ: ''ہمایوں''، لاہور: جلد ۲۷، سالنامہ ۱۹۵۸

۸۰۔ ''پل صراط اور پاسپورٹ''، مشمولہ: ''رابطہ''، کراچی: مئی، جون، ۱۹۹۱

۸۱۔ ''وکھووکھ''، مشمولہ: رابطہ، کراچی: جنوری ۱۹۹۰

۸۲۔ ''قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا''، مشمولہ: ''ادب لطیف''، لاہور: گولڈن جوبلی نمبر، جلد ۵۲، شمارہ ۱۱۔۱۲، ۱۹۸۶

۸۳۔ ''مہمان عزیز''، مشمولہ: ادب خیمہ، اوکاڑہ: ۱۹۹۱

۸۴۔ ''بیک گراؤنڈ''، مشمولہ: ''تخلیق'' لاہور ۱۹۹۰

۸۵۔ ''زرناب گل'' مشمولہ: رابطہ، کراچی: جنوری ۱۹۸۹

۸۶۔ ''قصاص''، مشمولہ: پاکستان کے شاہکار اردو افسانے (مرزا حامد بیگ) اسلام آباد، الحمرا پبلشنگ، ۲۰۰۰

۸۷۔ ''سونی''، مشمولہ: ''ادب لطیف، لاہور، جلد نمبر ۴۹، شمارہ نمبر ۳، ۴ اپریل ۱۹۸۳، یہی افسانہ ''ملک سونی'' کے عنوان

سے طلسم ہوش افزا میں شامل ہوا

۸۸۔ ’’کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ‘‘ مشمولہ: ادبیات سہ ماہی، شمارہ ۶۳۔۶۴، جلد ۱۵۔۱۶، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۴

۸۹۔ اشفاق احمد، ’’نئے رفیق نئے راستے‘‘ مشمولہ: ’’صحیفہ۔۳‘‘ دسمبر، ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۷

۹۰۔ اشفاق احمد ’’بدی بلی‘‘ مشمولہ: ’’ادبیات‘‘ اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲

۹۱۔ اشفاق احمد، ’’جیون جوت‘‘، مشمولہ: ’’ہجرتوں کے درمیاں‘‘، بانو قدسیہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۴

۹۲۔ قاسم محمود، سید ’’اشفاق احمد کا واحد ناولٹ‘‘ مشمولہ: جریدی کتاب، ۲۰۰۹، ص ا

۹۳۔ اشفاق احمد ’’ایک محبت سو ڈرامے‘‘ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰، ص ۷

۹۴۔ ’’چابی اور چابیاں‘‘ مشمولہ: ’’پاکستانی ادب‘‘ چھٹی جلد، حصہ دوم، ترکیب: رشید احمد، راولپنڈی، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، ۱۹۹۸

۹۵۔ روزنامہ مساوات، لاہور، بدھ ۸ ستمبر ۲۰۰۴

۹۶۔ Pakistan Observer, Wednesday 8, September 2004

۹۷۔ روزنامہ انصاف، لاہور، ۸ ستمبر ۲۰۰۴

۹۸۔ روزنامہ خبریں، لاہور، ۸ ستمبر ۲۰۰۴

۹۹۔ ’’پیارا دوست، کھرا انسان‘‘ مشمولہ: نوائے وقت، ادبی ایڈیشن، ۱۰ ستمبر ۲۰۰۴

۱۰۰۔ ایضاً

۱۰۱۔ ایضاً

۱۰۲۔ اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا‘‘ مشمولہ: ’’نوائے وقت‘‘ ادبی ایڈیشن ۱۰ ستمبر ۲۰۰۴

۱۰۳۔ ایضاً

۱۰۴۔ ایضاً

۱۰۵۔ ایضاً

۱۰۶۔ ایضاً

۱۰۷۔ ’’چوپال اجڑ گئے‘‘ مشمولہ: ’’نوائے وقت‘‘ ادبی ایڈیشن، ۱۰ ستمبر ۲۰۰۴

۱۰۸۔ ایضاً

۱۰۹۔ پاکستان، لاہور، ۹ ستمبر ۲۰۰۴

۱۱۰۔ ایضاً

۱۱۱۔ ایضاً

۱۱۲۔ ایضاً

۱۱۳۔ ایضاً

۱۱۴۔ روزنامہ مساوات، لاہور، بدھ ۸ ستمبر ۲۰۰۴

۱۱۵۔ روزنامہ انصاف، لاہور، ۸ ستمبر ۲۰۰۴

۱۱۶۔ روزنامہ جسارت، کراچی، ۹ ستمبر ۲۰۰۴

۱۱۷۔ پاکستان، لاہور، ۹ ستمبر ۲۰۰۴

۱۱۸۔ ''خراج تحسین'' پی ٹی وی ہوم، لاہور اسٹیشن، ۲۳ ۱ کتوبر ۲۰۱۱

۱۱۹۔ ''روزنامہ جنگ'' لاہور، ۱۰ ستمبر ۲۰۰۴

۱۲۰۔ ''خراج تحسین'' پی ٹی وی ہوم، لاہور اسٹیشن، ۲۳ ۱ کتوبر ۲۰۱۱

۱۲۱۔ روزنامہ خبریں، لاہور، ۸ ستمبر ۲۰۰۴

۱۲۲۔ ایضاً

باب دوم

فلسفہ اخلاق اور ادب

الف۔ فلسفہ اخلاق (بنیادی مباحث)

ب۔ مذاہب کی روشنی میں اخلاقیات

ج۔ ادب اور اخلاقیات

۱۔ فلسفہ اخلاق (بنیادی مباحث)

حیات انسانی میں علم اخلاق انسان کو اچھے برے کی تمیز سکھاتا ہے، خیر اور شر، صائب اور غیر صائب کا فرق واضح کرتا ہے۔ اخلاقیات سے کیا مراد ہے؟ یا فلسفہ اخلاق کسے کہتے ہیں۔ اس کی اہمیت انسانی زندگی میں کیا ہے۔ اس کو جاننے کے لیے ہم سب سے پہلے ''فلسفہ اخلاق'' کے معانی دیکھتے ہیں کہ فلسفہ اخلاق کیا ہے۔

امولیہ رنجن مہاپتر فلسفہ کے معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''لفظ (Philosphy) (فلسفہ) یونانی الفاظ "Philos" یعنی محبت اور "Sophia" یعنی دانش سے ماخوذ ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب محبت سے بنا۔'' (۱)

ڈاکٹر ابصار احمد اپنے مضمون ''فلسفہ کیا ہے'' میں فلسفہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''فلاسفی ''یونانی لفظ ''سوفیا'' سے بنا ہے جس کا عام طور پر ترجمہ حکمت یا دانائی کیا گیا ہے اور مرکب لفظ فلوسوفیا (Philosophia) جس سے فلاسفی رائج العام ہوا ہے کا مفہوم حکمت یا دانائی سے رغبت یا محبت (Love of Wisdom سے زیادہ وسیع ہے اس کا اطلاق پر اس مضمون یا عمل پر ہوتا ہے جس میں ذہانت استعمال کی گئی ہو۔ خواہ وہ عملی معاملات ہوں''۔ میکانکی علوم ہوں یا عام تجارتی مصروفیات''۔ (۲)

مولف کنز العمال نے اخلاق کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ ''ونفی بالاخلاق ما مومن اعمال القلوب''
''یعنی اخلاق سے ہماری مراد اعمال دل ہیں۔'' (۳)

لفظ ''اخلاق'' اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتا ہے۔ مثلاً

فرہنگ آصفیہ کے مطابق:

''اخلاق۔ ع، اسم مذکر۔ خلق کی جمع۔

(۱) عادتیں۔ خصلتیں

(۲) خوش خوئی، ملنساری، کشادہ پیشانی سے ملنا، خاطر مدارت، آؤ بھگت

(۳) وہ علم جس میں معاد و معاش، تہذیب، نفس، سیاست مدن وغیرہ کی بحث ہو۔'' (۴)

امیر اللغات کے مطابق:

''اخلاق۔ مذکر۔ خلق کی جمع۔ اردو میں بیشتر واحد بولا جاتا۔ امیر اللغات کے مطابق اردو میں بیشتر واحد بولا جاتا ہے۔

(۱) خصائل و عادات

(۲) انسانیت، ملنساری، مروت، آؤ بھگت

(۳) وہ علم جس میں تہذیب نفس اور معاد و معاش وغیرہ سے بحث ہو۔''(۵)

لغات نظامی کے مطابق:

''اخلاق (ع مذکر۔ خلق کی جمع) عادتیں۔ خصلتیں۔ انسانیت۔ مروت۔ وہ علم جس میں سیاست۔ تہذیب نفس اور معاد و معاش وغیرہ کا بیان ہو۔''(۶)

نسیم اللغات کے مطابق:

''اخلاق (ع) خلق کی جمع۔ عادتیں۔ خصائل، انسانیت، ملنساری، مروت، ملنے جلنے کا مہذب طریقہ، وہ علم جس میں تہذیب، نفس، تدبیر، منزل اور سیاست ملکی کے اصول بیان کیے جاتے ہیں۔''(۷)

نور اللغات کے مطابق:

''اخلاق (ع) خلق کی جمع۔ اچھی عادت۔ تہذیب مذکر اردو میں بیشتر بجائے واحد بولا جاتا ہے۔

(۱) عادات و خصائل

(۲) انسانیت، ملنساری، مروت، آؤ بھگت

(۳) وہ علم جس میں تہذیب، نفس اور معاد و معاش وغیرہ سے بحث ہوتی ہے۔ اخلاق معاشرت، باہم ایک جگہ رہنے سہنے کے آداب''۔(۸)

آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری کے مطابق:

''اسم: اخلاقی ضابطہ Ethic

(۱) اخلاقیات سے متعلق خصوصاً افسانوں کے باہمی روابط یا سماجی تعلقات کی نسبت سے Ethical اخلاقی طور پر Ethically، اخلاقیات Ethicality انسانی زندگی میں اصول، Ethic معیار اخلاق سے تعلق رکھنے والا علم، علم الاخلاق''۔(۹)

قومی انگریزی اردو لغت کے مطابق:

''اخلاقی، اخلاقیاتی، چال چلن سے متعلق، (اسم) Ethic کردار و اصول کا کوئی نظام یا فلسفہ جس میں کوئی شخص یا جماعت عمل پیرا ہو، جیسے (The Christian Ethic, the Personal Ethics) اخلاق۔''(۱۰)

ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق:

Ethic (eth'iks) nopl. (construed as singular in defs 1 and 3)

1- The study and Philosphy of human conduct with emphasis on the determination of right and wrong: one of the normative science.

2- The basic principles of right action.

3- A work of treatise on morals.(۱۱)

اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے مطابق:

''معاشرتی معاملات طے کرنے کے اصول، وہ بات جو بھلائی اور برائی کی تمیز پیدا کرے۔ جو فضائل و رذائل کا علم بخشے۔ ایسا ضابطہ جس کی پابندی کے بغیر اجتماعی زندگی کا تصور محال ہے۔''(۱۲)

ہندوستان میں فلسفہ کا مفہوم مغربی نقطہ نظر سے مختلف ہے۔ ہندوستان میں فلسفہ کے تصور کے بارے میں ''فلسفہ مذاہب'' میں درج ہے کہ:

''مغرب میں فلسفہ کا تصور ہندوستانی تصور کے ہم پلہ نہیں ہے۔ فلسفہ کے لیے بالعموم سنسکرت کا لفظ ''درشنم'' استعمال ہوتا ہے جس کا مطلب ''دیکھنا'' ہے اور ہندوستانی فلسفیانہ نظاموں کا آغاز کسی قدیم اصول سے ہوا اور نہ ہی مشاہدہ کردہ حقیقتوں سے (جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے) بلکہ اس کی ابتدا کسی ماورائی احساس سے ہے جس میں کائنات کی نوعیت کے مطابق سچائی براہ راست حاصل ہوتی ہے۔''(۱۳)

اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے مطابق اخلاق سے مراد یہ ہے کہ:

''خلق کی جمع ہے عادتیں، سیرتیں، خصائل، اس علم کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے جس میں انسانی خصائل کے متعلق بحث کی جاتی ہے اور اس علم کی کتابوں کے نام میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے مثلاً اخلاق محسنی، اخلاق ناصری، اخلاق جلالی وغیرہ''۔(۱۴)

ہیومن جغرافیائی لغت (The Dictionary of Human Geography) کے مطابق:

"Ethics concerns not only the actions of individual people but social, economic and political structures and arrangement that also effect human and non human beings."(۱۵)

آکسفورڈ ڈکشنری آف سوشیالوجی (Oxford Dictionary of Sociology) کے مطابق:

A branch philosphy concerned with moral principles and values, with what ought to be the case a how people ought to live their lives, Ethical Philosphers and concerned with the ideas of 'good' and 'bad' as they apply to human affairs."(۱۶)

بیسویں صدی کی بلیک ویل ڈکشنری کے مطابق:

"In its broadcast sense, ethics refers to the normative appraisal of the actions and character of individuals and social group."(۱۷)

ڈاکٹر سی۔اے قادر کے مطابق:

''انگریزی زبان میں اخلاقیات کو ایتھکس (Ethics) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ ایتھوز (Ethos) سے مشتق ہے جس کے معانی عوائد وسوم اور خصوصاً وہ عوائد و رسوم جو ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ممتاز کرتی ہیں۔''(۱۸)

ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:

''اخلاق انسان اتنا ہی قدیم ہے اور اتنی ہی قدیم اخلاقیات، فلسفے کے ایک شعبے کے لحاظ سے تو

اخلاقیات خود فلسفہ اتنی قدیم قرار دی جا سکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحش قبائل اور غیر متمدن معاشروں میں تحریمات (Taboos) سے لے کر مذہبی اوامر و نہی تک ہر وہ اعتناعی حکم جو فرد کو معاشرے کے مقرر کردہ معیار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین کرے۔'' (۱۹)

یعنی اخلاقیات سے مراد مہذب معاشرے کی تعمیر کے لیے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا اطلاق ہے اور اس کے لیے مذہب اور معاشرے کے مقرر کردہ اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زندگی بسر کرنا ہے۔

طاہر القادری اسلام کے اخلاقی اصول بیان کرتے ہوئے مختلف مفکرین کی رائے بیان کرتے ہیں کہ:

''اخلاق خلق سے ہے جس کے معنی پختہ عادت کے ہیں، اصطلاحاً خلق سے مراد وہ اوصاف ہیں جو کسی فطرت وطبیعت کا اس طرح سے لازمی جزو بن جائیں کہ زیادہ غور وفکر کے بغیر روزمرہ زندگی میں ان کا اظہار ہوتا ہو۔حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک خلق انسان کی اس کیفیت کا نام ہے جو اس کی طبیعت کے مختلف اوصاف وکمالات کو جدوجہد کر کے اپنی طرف راجع کرے۔'' (۲۰)

''امام غزالیؒ کے نزدیک خلق انسان کی اس کیفیت اور ہیت راسخہ کا نام ہے جس کی وجہ سے بغیر کسی فکر وتوجہ کے نفس سے اعمال سرزد ہوں۔

''جلال الدین دوانیؒ فرماتے ہیں ''جب افعال کسی فکر و تردد کے بغیر نفس سے سرزد ہونے لگیں تو اس کیفیت کو خلق سے تعبیر کرتے ہیں۔'' (۲۱)

اسی طرح واصف علی واصف کے نزدیک اخلاقیات سے مراد وہ تمام کاوشیں ہیں جو تمام بنی نوع انسان کی بھلائی کا باعث ہوسکتی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

''اخلاقیات کی تعریف کرنا آسان نہیں، کسی ایک دور کا قانون اخلاقیات کسی دوسرے دور میں بداخلاقی بھی ہوسکتا ہے۔کسی خاص جغرافیائی حالات کا ضابطہ اخلاق کسی مختلف جغرافیائی حالات کے ممالک میں کچھ اور صورت اختیار کر جاتا ہے۔ بہرحال اخلاقیات بالعموم قواعد کچھ یوں ہیں کہ لوگوں کی خدمت کرنا...... بھوکے کو کھانا کھلانا...... اخلاق کا سارا سفر مختصر طور پر کیا جا سکتا ہے کہ یہ بے ضرر ہونے سے شروع ہوتا ہے اور منفعت بخش ہونے پر ختم ہوتا ہے۔ وہ جذبات اور وہ کوششیں جو انسان کے مجموعی ارتقاء کے لیے کی جائیں اخلاقیات کا حصہ ہیں۔'' (۲۲)

یعنی اخلاقیات سے مراد مجموعی ترقی اور اجتماعی خوشحالی کے لیے کوشاں رہنا ہے اور ہر دور اور معاشرے کے اپنے اخلاقی دائرے ہوتے ہیں اور ایک ہی معاشرے کے اخلاقی پیمانے یا معیار مختلف ادوار میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ہوسکتا ہے ایک دور میں ایک معاشرے میں اعلیٰ ذات کو عزت وتکریم سے نوازا جائے لیکن آنے والے دور میں ذات پات کی تخصیص کو ادنیٰ اور حقیر فعل اور عمل سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھا جائے۔

امام الغزالی بلند پایہ اخلاقیات مفکر ہیں۔ انہوں نے انسانیت کی فلاح کے لیے مختلف ''اخلاقیات'' کے تصورات پیش کیے جاوید اقبال ندیم اس بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

''امام الغزالی کے نزدیک خلق کی بہت سی اقسام ہیں لیکن بنیادی اخلاق صرف چار ہیں اور باقی تمام شاخیں اس سے نکلتی ہیں۔

۱۔ علم ۲۔ غضب

۳۔ شہوت ۴۔ عدل

انہی چار قوتوں میں اعتدال کا نام حسن خلق ہے۔ امام صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ ان چاروں قوتوں میں اعتدال تعلیم وتربیت کے ذریعے پیدا کیا جاسکتا ہے۔'' (۲۳)

غزالی کے تصور اخلاق کے مطابق اخلاق، بداخلاقی اور اخلاقی کے درمیان تناسب قائم کرنے کا نام ہے کیونکہ بااخلاق شخص نیکی اور بدی کے بارے میں غیر جانبداری برتتا ہے اور اس کے مقاصد بلند تر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نفس پر قابو پانا جانتا ہے۔ امام الغزالی کے اخلاقیاتی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے نورالحسن خان لکھتے ہیں کہ:

''اچھے یا برے کام کرنا یا اچھے اور برے کاموں پر قدرت رکھنا یا اچھے اور برے کاموں میں تمیز کر لینا خلق نہیں کہلاتا بلکہ خلق اس ہیئت کا نام ہے جس کی وجہ سے نفس کسی کام کو کرنے یا اس سے باز رہنے کے لیے اپنے آپ کو مستعد اور آمادہ کر لیتا ہے تو گویا نفس کی ہیئت وصورت باطنی ہی نام خلق ہے۔'' (۲۴)

اخلاقیات سے مراد ''خیر'' اور ''شر'' اور ''صائب'' اور ''غیر صائب'' کے تصور تک محدود نہیں ہے بلکہ اخلاق سے مراد ''نیکی''، ''خیر'' اور ''صوائب'' کا عملی اظہار ہے لیکن اس میں کسی بھی شخص کو ''نیک'' یا ''اچھا'' قرار دینے کے لیے ضروری نہیں کہ صرف یہ دیکھا جائے کہ وہ کیا کہتا ہے؟ اس کی نیکی اور بدی کے بارے میں تصورات کیا ہیں اور اس کے ارادہ اور نیت کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اچھی نیت کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر کوئی نیک فعل برے ارادے کے ساتھ سرانجام دیا جائے

تو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اس سلسلے میں پروفیسر یوسف شیدائی لکھتے ہیں کہ:

''اخلاق کا تعلق نیت، مقصد، ارادے کی درستی کے ساتھ ظاہر نتائج وعواقب کے ساتھ بھی ہے۔ اخلاقی فتویٰ صادر کرتے وقت دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ الگ بات زیادہ زور نیت اور ارادے کی درستی پر دیا جاتا ہے۔ نیکی یہ نہیں کہ کوئی شخص نیکی کے تصور سے کس حد تک آشنا ہے بلکہ یہ ہے کہ کوئی شخص عملاً کس حد تک اپنے آپ کو معیار اخلاق سے قریب تر کرتا ہے۔'' (۲۵)

علم اخلاق ایک ایسا علم ہے، جو معاشرے میں بسنے والے انسانوں پر نیک اور بد اور اچھے اور برے ہونے کے معیار کا تعین کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ''تعارف اخلاقیات'' میں ولیم للّی بیان کرتے ہیں کہ:

''بہتر یہی ہے کہ اخلاقیات میں کسی فعل کے متعلق نیک و بد کا لفظ اس وقت استعمال کیا جائے جب وہ کسی نہ کسی معنی میں اچھے یا برے نتائج پیدا کرتا ہو۔'' (۲۶)

انسان کے اندر فطری طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ نیکی کیا ہے اور برائی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ظاہری قوت کے ساتھ باطنی شعور کے ساتھ بھی کائنات میں بھیجا ہے۔ اور اس کا اظہار روزمرہ زندگی میں بارہا دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں بصارت، سماعت، لامسہ، شامہ اور ذائقہ جیسی حسّوں سے مزین کر کے بھیجا ہے اسی طرح انسان اور دوسری مخلوقات میں ایک بڑا فرق پہچان اور امتیاز کا بھی ہے۔ اور ظاہری اور مادی ماحول میں تبدیلیوں کے باوجود فطرت انسانی میں یہ اوصاف موجود رہتے ہیں۔ اس بارے میں بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں کہ:

''انسانی فطرت درحقیقت خدائی فطرت ہی کا دوسرا نام ہے اور صراط مستقیم یعنی خیر کے راستے پر گامزن ہونے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس فطرت کے مطابق انسان اپنی زندگی ڈھال لے...... اخلاقی زندگی کی نشوونما بھی اس سے ہوتی ہے اور انسان کی زندگی کے عقلی پہلو کا ارتقاء بھی اسی کے ذریعے وقوع پذیر ہوتا ہے۔'' (۲۷)

خدا کو مانے بغیر اخلاقیات کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہوتی اور انسان کو فطرت میں دراصل یہ صفات شامل ہیں اور اسی فطرت میں اس باری تعالیٰ نے انسان کی بھلائی کی خواہش پوشیدہ رکھ دی ہے۔ مثلاً سچ بولنا، وعدہ پورا کرنا، دوسروں کی خدمت کے لیے تیار رہنا، بھوکے کو کھانا کھلانا، مسافر پروری کرنا، ترس کھانا، فطرت انسانی کے وہ عناصر ہیں جو ازمنہ قدیم سے اسی کی فطرت کا حصہ ہے اور اسی اعتبار سے وہ معاشرے میں رہتے ہوئے باہم تعاون سے زندگی گزارنا پسند کرتا ہے۔

محمد حفیظ الرحمٰن ''اخلاق اور فلسفہ اخلاق'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جو علم بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر، انسانوں کو آپس میں کس طرح معاملہ کرنا چاہیے اس کو بیان، لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منتہائے غرض اور مقصد عظمیٰ کو پیش نظر رکھنا چاہیے اس کو واضح کرے اور مفید کارآمد باتوں کے لیے دلیل راہ بنے ''علم اخلاق'' کہلاتا ہے۔'' (۲۸)

انسان کے اندر فطری طور پر نیکی اور بدی کی جبلتیں موجود ہیں اور انسان کی فطرت میں اخلاق موجود ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابصار احمد لکھتے ہیں کہ:

''اللہ نے جس طرح انسان کو ظاہری استعدادات مثلاً سماعت، بصارت، قوت گویائی، صلاحیت تعقل وغیرہ دی ہے ویسے ہی فطرت انسانی میں کچھ باطنی استعدادات بھی ہیں جن کو دے کر انسان کو اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان فطری طور پر یہ جانتا ہے کہ نیکی کیا ہے اور برائی کیا ہے چنانچہ اس طرح بہت سی اقدار دائمی ہیں۔ (۲۹)

چنانچہ انسان ابتدا ہی سے فطرت کا پابند رہا ہے اور لاکھوں سالوں کی تربیت کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اخلاق ہماری فطرت کا حصہ ہے اور روح انسانی کی نشوونما کا لازمی جزو ہے۔ انسان کی فطرت کا حصہ ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارے، اپنی ذات کی نشوونما کے لیے اجتماعی تعاون اس کی ضرورت ہے۔ انسان فطری طور پر نیکی اور بدی میں امتیاز رکھتا ہے اور اس کے اندر نیکی کرنے کے رجحانات موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ''نشاط فلسفہ'' میں سر فرانسس بیکن کے مطابق:

''بیکن نے کہا کہ تمام چیزوں میں دو طرح کی نیکی کے رجحانات موجود ہیں۔ ایک اپنی ذات کو قائم رکھنے کا رجحان اور یہ رجحان پہلے رجحان سے زیادہ قابل احترام اور قوی ہے کیونکہ اس کا مقصد ایک زیادہ وسیع کل کی بقا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بداخلاقی کی طرح اخلاق بھی انسانی فطرت کا ایک جزو ہے۔'' (۳۰)

علم الاخلاقیات ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ افراد کو کس طرح سے زندگی گزارنی چاہیے اور اپنے مقاصد کا تعین کن بنیادوں پر کنا چاہیے اور پھر اس کے حصول کے لیے اصول وضوابط ایسے مقرر کیے جائیں جو اجتماعی طور پر سب کی فلاح کا باعث بنیں۔ اس سلسلے میں ''تاریخ اخلاق یورپ'' میں ایڈورڈ پول لیکی کے مطابق:

''مختصر یہ کہ ''بڑی سے بڑی تعداد افراد کو بڑی سے بڑی مسرت'' بس یہ کلیہ ہر ماہر اخلاقیات کے لیے شمع

ہدایت ہونا چاہیے کہ یہی حسن اخلاق کا بہترین مظہر اور کمال تزکیہ نفس کا اعلیٰ ترین معیار ہے۔'' (۳۱)

چنانچہ اخلاقیات کا کام ہمیں وہ معیاری نقطہ نگاہ فراہم کرنا ہوتا ہے جس کی روشنی میں ہم اچھائی اور برائی کے بارے میں فیصلہ سناتے ہیں کہ فلاں شخص ''اچھا ہے'' اور فلاں ''برا ہے''۔

اس کا مقصد ہمارے اندر فہم و فراست پیدا کرنا ہوتا ہے تاکہ ہم زندگی کے معاملات کو بہتر انداز میں جاننے، سمجھنے اور برتنے کے قابل ہو جائیں۔ ''ابتدائی فلسفہ'' میں جان ہاسپرس لکھتے ہیں کہ:

''اخلاقیات میں ہمارا سروکار خیر و شر یا نیک و بد، صحیح اور غلط، فرض اور وجوب اور اخلاقی ذمہ داری سے ہے''۔ (۳۲)

اس طرح سے اخلاقی ذمہ داریوں سے آگاہی ہمارے شعور میں وسعت پیدا کرتی ہے اور اقدار حیات کی وضاحت کرتی ہے اور اس سے عملی استعداد میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور صحیح سمت میں ہمیں بھی راہنمائی ملتی ہے تاکہ ہم زندگی کے واقعات، حوادث اور معمولات کا تجزیہ ان اخلاقی اصولوں کی روشنی میں رہ کر لے سکیں اور باقاعدہ سائنسی عملی علم کو متعارف کروا سکیں اور اس کے نتیجے میں ہمارے اندر ایک ایسا شعور پیدا ہو سکے کہ ہم کسی بھی صورتحال میں اخلاقی اصولوں کی قدر و قیمت کا تعین کر سکیں۔

اخلاقیات انسانی شخصیت و کردار کے ''خیر'' اور ''شر''، ''اچھائی'' اور ''بھلائی'' سے متعلقہ نکات سے بحث کرتی ہے۔ فرد کی شخصیت اور کردار سے مراد وہ اعمال ہوتے ہیں جو وہ اپنی پوری آزادی، شعور اور ذمہ داری سے انجام دیتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر یوسف شیدائی لکھتے ہیں کہ:

''اخلاقیات کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ یہ ایک ایسا علم ہے جو کردار یعنی ارادی اعمال کا خیر اور صواب کے نقطہ نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔'' (۳۳)

انسان کی فطرت میں خیر اور شر موجود ہوتا ہے اور اخلاقیات سے مراد انسان کی شخصیت و کردار میں بہتری لانے والا علم ہے اور ان اخلاقی احکام کا عملی اطلاق طے شدہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جاوید اقبال ندیم لکھتے ہیں کہ:

''اخلاقی اقدار کے تجزیہ کے ساتھ تجربیت پر بھی زور دیا ہے یعنی علم کو عملی طور پر پرکھنے کی کوشش کی۔ جس سے اخلاقی اقدار کی جانچ پڑتال انسانی کردار و سیرت سے کی جانے لگی۔'' (۳۴)

فلسفیانہ اخلاقیات کے مطابق اخلاقیات خیر اور صائب کی حقیقت جاننے کے متعلق بحث کرتی ہے۔ وہ اس چیز سے

بحث کرتی ہے کہ عمل خیر کیا ہوتا ہے؟

چنانچہ بہت سے حکمائے اخلاقیات ''اخلاقیات'' کی تعریف کے سلسلے میں اس بات سے بحث کرتے ہیں کہ خیر کیا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر ''مور'' اپنی کتاب اصول اخلاقیات میں لکھتے ہیں کہ:

''پس ہمارا پہلا سوال یہ ہے کہ ''خیر کیا ہے؟'' اور ''شر کیا ہے؟'' میں اس سوال (یا ان سوالات) پر بحث کو اخلاقیات کا نام دیتا ہوں، کیوں کہ اسی علم میں یہ سوال بہرصورت شامل ہے۔'' (۳۵)

پس ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے علمائے اخلاقیات ''خیر'' اور ''شر'' کے وسیع معنوں کو جاننے کی طرف مائل ہیں کیونکہ ان لفظوں کی اصل حقیقت کو سامنے لانا ہی علم اخلاق ہے، مور کے نزدیک اشیاء کے اچھے اور برے ہونے کے بارے میں بحث کرنا چاہیے۔صرف کسی بھی شے کو اچھا اور برا یا خیر اور ''شر'' کی مہر ثبت کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ افعال کے درست اور غلط ہونے کے اسباب فراہم کرنا بھی اخلاقیات کے دائرے میں آتا ہے۔اس بارے میں پروفیسر مور لکھتے ہیں کہ:

جب ہم یہ کہنے کی کرتے ہیں کہ ''عفت فضیلت ہے اور مے نوشی رذالت'' تو بلا شبہ اخلاقیات ہی کام ہے کہ وہ اس قسم کے سوالات اور بیانات سے بحث کرے اور جب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کون سا فعل درست ہے تو وہ اس بارے میں کہ اس سوال کا صحیح جواب کیا ہے، وجوہات پیش کرے، علاوہ ازیں اخلاقیات کے ذمے یہ کام بھی ہے کہ وہ ہمارے ان بیانات کو جو افراد کے اخلاق سے یا ان کے افعال کے اخلاقی پہلو سے متعلق ہوتے ہیں، صحیح یا غلط ٹھہرانے کے اسباب بیان کرے۔'' (۳۶)

اخلاقیات نہ صرف ''خیر'' اور ''شر'' کے بارے میں بتاتی ہے بلکہ اخلاقی پہلوؤں کے معیار کا تعین بھی کرتی ہے۔صحیح اور غلط کا فیصلہ بھی کرتی ہے اور اوصاف و کمالات کے منضبط طریقے استعمال کی جانب بھی راغب کرتی ہے اس بارے میں ڈاکٹر ابصار احمد لکھتے ہیں کہ:

''فلسفہ اخلاق ذہنی کاوش کا نام ہے کہ اخلاقی تعارض اور شبہ کے موقع پر غور وفکر کے ذریعے مخمصے سے نکلنے کے لیے اصل سوال تو زیادہ شعوری طور پر اور زیادہ باقاعدہ طریق سامنے لایا جائے۔'' (۳۷)

فلسفہ اخلاق سے مراد اپنے مقاصد اور اعمال کا تعین سمجھ بوجھ سے صحیح سمت میں کرنا ہے فلسفہ اخلاق میں مرقوم ہے کہ:

''فلسفہ اخلاق رسوم و اقدار، درست و غلط، خیر و شر اور ''کیا کرنا چاہیے'' اور ''کیا نہیں کرنا چاہیے'' کے بارے میں فلسفیانہ تحقیق کا نام ہے۔''

اخلاقیات کے مختلف نظریات سے متعلق مطالعہ اخلاقیات میں پروفیسر یوسف شیدائی بیان کرتے ہیں کہ:

''سجوک کے نزدیک اخلاقیات ایک ایسا مطالعہ ہے جو بتاتا ہے کہ افراد کو کیا کرنا چاہیے اور یہ کہ کن مقاصد کی تکمیل کی خاطر انہیں ارادی اعمال سرانجام دینے چاہئیں''۔(۳۸)

راجر کا خیال ہے کہ اخلاقیات ایک ایسا علم ہے جو انسانی کردار کے انتہائی مقاصد کی صحیح نوعیت کو متعین کرنے والے اصول وضوابط کی جستجو کرتا ہے۔

ڈیوی کے مطابق اخلاقیات اسی اعتبار سے کردار کا علم ہے کہ اسی میں اچھے اور برے یا صائب اور غیر صائب یا خیر اور شر کے درمیان امتیاز کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔

ولیم للّی کے نقطہ نظر کے مطابق اخلاقیات معاشرتی اداروں میں رہنے والے بنی نوع انسان کے کردار کا ایسا معیاری مطالعہ ہے جو کردار کو صائب اور غیر صائب قرار دینے میں ہماری مدد کرتا ہے۔

''مسیکنز ی کے نزدیک اخلاقیات اس نصب العین کے مطالعے کا نام ہے جو انسانی زندگی میں مضمر ہے۔''(۳۹)

اخلاقیات کے مختلف مباحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب ہم کسی کو اچھا یا برا کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے اس میں کوئی ابہام یا اعتراض کی یا بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ''ابتدائی فلسفہ'' میں درج ہے کہ:

''اخلاقیات میں جو اہم الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں وہ ہیں کہ ''اچھا'' (نیک) ''برا'' ''صحیح'' اور ''غلط'' ان کے معنی کے متعلق اختلافات کی کوئی انتہا نہیں۔'' (۴۰)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بعض مفکرین ''خیر'' اور ''شر'' پر زبان کی لفظیات کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور بعض جیسے بیکن اسے فطرت کا حصہ قرار دیتے ہوئے یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ نیکی کی طرف جھکاؤ کسی بھی فرد کی فطرت کا حصہ ہے، لیکن مور اس بات سے اختلاف کرتا ہے اور یہ جاننے کو اخلاقیات کا نام دیتا ہے کہ خیر ہے کیا؟ اور اس کے نتائج کیا ہیں اور راسس بھی اس بات سے متفق نظر آتا ہے۔ اس کے نزدیک بھی ''خیر'' ایک ایسا تصور ہے جس سے کوئی اور قدر جڑی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سلسلے میں پروفیسر خواجہ غلام صادق لکھتے ہیں کہ:

''خیر کے بارے میں راسس کا خیال ہے کہ خیر ایک معروضی امر ہے۔ یہ درحقیقت ایک ایسی خصوصیت ہے جو سنجیدہ (Complex) معاملات سے وابستہ ہوتی ہے۔ یعنی خیر ایک ایسی خصوصیت ہے جو صرف

ذہنی کیفیات سے ہی وابستہ ہے اور ذہنی کیفیات سے یہ وابستگی تین باتوں کی وجہ سے ہے۔''نیکی، ذہانت اور مسرت یعنی ان ذہنی کیفیات سے خیر کی وابستگی ہوگی جن میں نیکی کے فروغ کی خواہش، ذہانت اور مسرت کی صفات پائی جائیں۔

مور کی طرح راسس بھی سمجھتا ہے کہ اخلاقیات کی بنیادیں کسی دوسرے تصور سے نہ ہی مشتق ہے اور نہ ہی کسی دوسرے تصور میں ڈھالی جاسکتی ہے۔'' (۴۱)

مور کے نزدیک ہم الفاظ خیر کو اس طرح سے استعمال کرتے ہیں جیسا کہ ان کا تصور ہمارے ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مجھے صرف اس شے یا تصور سے غرض ہے جس کے لیے میرا خیال ہے (جو صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی) یہ لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے جس چیز کو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں، وہ اس شے یا تصور کی ماہیت ہے اور اس بارے میں کسی اتفاق رائے پر پہنچنے کا میں دل سے متمنی ہوں۔'' (۴۲)

مور اور راس دونوں کے مطابق اخلاقی احکام نہ تو کسی تصور سے نکلے ہیں اور نہ تصوراتی بنیادوں پر انہیں ایک تصور سے دوسرے میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ لیکن اے یوئنگ، مور اور راسس سے اختلاف کرتے ہیں۔ خواجہ غلام صادق اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''اے سی یوئنگ مور اور راسس سے اختلاف کرتے ہوئے، چاہیے کو اخلاقیات میں بنیادی اور مرکزی اصطلاح تصور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ''چاہیے کہ لفظی تعریف نہیں ہوسکتی۔'' (۴۳)

اے سی یوئنگ کے مطابق اخلاقی احکام رویوں کے بارے میں ہوتے ہیں اور ''اچھے''، ''برے'' رویوں کے پس پردہ بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں اور ان تائیدی وجوہ کی روشنی میں جواز دیئے جاسکتے ہیں۔

مور کے نزدیک اخلاقی مفکر کا کام حقائق کو سامنے لانا ہوتا ہے اس سلسلے میں ذاتی مشورے اور نصیحتیں اس کا کام نہیں ہے۔

فلسفہ اخلاق ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی یہ بتاتا ہے کہ ہمیں فلاں فعل عمل میں لانا چاہیے اور فلاں سے اجتناب کرنا چاہیے بلکہ فلسفہ اخلاق محض ہماری راہنمائی کرتا ہے اور صحیح اور غلط کا فیصلہ ہمیں خود کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ''فلسفہ اخلاق'' میں ڈی۔ڈی رافیل لکھتے ہیں کہ:

''فلسفہ اخلاق ہمیں اپنے تصورات کی وضاحت کے ثانوی مقصد کے لیے حقی ارتقاء کی جانب گامزن کرتا ہے اورافرادکو تجربی استفسارات کے بارے میں ازخود فیصلہ کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔'' (۴۴)

ڈی۔ڈی رافیل کے مطابق ہمیں فلسفہ اخلاق سے یہ امید نہیں لگانی چاہیے کہ یہ ہمارے مسائل کا حل کر دے گا لیکن فلسفہ اخلاق کے مطالعے سے ہمیں زندگی کے نشیب وفراز کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔ڈی۔ڈی۔رافیل مزید لکھتے ہیں کہ:

''فلسفہ اخلاق مطالعہ بہرطور اتنا ضرور کرتا ہے کہ آپ کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی، خودتنقیدی اور خوداعتمادی کی اہلیت بخشے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے لیے ازخود انتخاب کرنے کی صلاحیت بھی عطا کرے اور یہ آپ کوزیادہ اعتدال پسند، ذمہ داراورزیادہ بہتر انسان بننے کا ہنر جانتا ہے۔'' (۴۵)

فلسفہ اخلاق عملی زندگی کے مسائل کوحل کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کی فطرت کے اندر اخلاقی پہلو پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ ہرانسان کوخدا نے نیک سیرت پیدا کیا ہے۔خیراورشر کی وضاحت کے ساتھ ہی انسان کے اندر فطری طور پر یہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ نیکی کی جانب جھکاؤ رکھتا ہے۔اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

''علم کی روشنی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اخلاق انسانی کوئی ایسا عطیہ نہیں ہے جوحسب اتفاق ہم کوعطا کر دیا گیا ہے بلکہ وہ اپنی صلاحیت، اپنے فساد، اپنی ترقی اور اپنے انحطاط میں (قدرت الٰہی کے) ایسے محکم ومضبوط قوانین کے تابع ہیں کہ کبھی ان سے جدانہیں ہوسکتی۔ پس اگر ہم کو ان قوانین کی معرفت ہو جائے اور ہم ان کے موافق عمل کریں تو ہم میں یہ قدرت پیدا ہوسکتی ہے کہ ہم اخلاق انسانی کو اس (انسان) کی صلاحیت طبع کے مطابق درست کرسکیں۔'' (۴۶)

انسان کی فطرت میں نیکی موجود ہے اخلاق کے عمدہ عناصر پائے جاتے ہیں اور تربیت کے ذریعے سے اس کو مزید سنوارا جا سکتا ہے اور عمدہ اخلاق سے نہ صرف اپنی ذات بلکہ مجموعی اجتماعی ماحول کو بھی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں ''محاسن الاخلاق' میں مرقوم ہے۔

''خوش اخلاقی کوخوشبو سے تشبیہہ دیتے ہیں یعنی جیسے کہ راحت روح کوخوشبو پہنچاتی ہے ایسے ہی خوش خلقی سے آدمی کوراحت پہنچتی ہے۔'' (۴۷)

اخلاق انسان کے اندر ابتدا سے فطرت میں موجود ہوتا ہے، اپنی مرضی سے اخلاقی احکامات اوامر ونواہی مقرر نہیں کیے جا سکتے اور اپنے ذوق اور جمالیاتی تصدیقات کے مطابق اخلاقی احکام کو تبدیل یا تحلیل نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر سی اے قادر کے مطابق:

''دوستووسکی (Dosto vesky) اپنے ناول (Crimes Punishment) میں اس نکتہ کی خوب وضاحت کرتا ہے...... اس کہانی سے دوستووسکی یہ بتلاتا ہے کہ اخلاقی حکم کی بنیاد انسانی اوامر ونواہی پر نہیں بلکہ اندرونی آواز پر ہے جس کے آگے تمام دلائل بے کار ہو جاتے ہیں۔ اس کا تعلق نہ تو ذاتی مفادات سے ہے، نہ طبقات سے اور نہ ہی مادی معاشی حالات سے۔'' (۴۸)

یہ سچ ہے کہ معاشرتی ماحول اور وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اخلاقیات میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے تاہم کچھ عناصر انسان کی فطرت اور سرشت میں شامل ہیں اور وہ وقت کی تبدیلی کے باوجود تبدیل نہیں ہو سکتے اس بارے میں جان ڈیوی لکھتے ہیں کہ:

''معاشرتی حالات اور تہذیب کے معیار میں تبدیلی کے ساتھ وقتاً فوقتاً اخلاقیات میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اگرچہ خواہش، مقصد، اجتماعی مطالبہ اور قانون ہمدردانہ پسندیدگی اور معاندانہ ناپسندیدگی وغیرہ کی حیثیت مستقل ہے اور جب تک انسانی طبیعت ہے اور دوسروں سے مل جل کر رہتا ہے۔ ہم ان حقائق کے ناپید ہونے کا تصور میں نہیں لا سکتے اس لیے اخلاقیات کے بنیادی تصورات نہ تو مطلق العنانہ ہیں اور نہ مصنوعی۔ یہ انسانی طبیعت پر باہر سے ٹھونسے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اس کے اپنے عمل اور ضروریات سے پیدا ہوئے ہیں۔ البتہ اخلاقیات کے بعض خاص پہلو ضرور عارضی ہیں اور ان کا اظہار ناقص اور مسخ شدہ صورت میں ہوتا ہے البتہ اخلاقی تصورات کا ڈھانچہ ایسے ہی پائیدار ہے جیسے خود زندگی۔'' (۴۹)

یعنی ہم فلسفہ اخلاق پر اعتماد کر سکتے ہیں کہ یہ ہماری مستقل راہ نمائی کر سکتا ہے۔

ب۔ مذاہب کی روشنی میں اخلاقیات

علمائے اخلاقیات نے فلسفہ اخلاقیات کو وسیع تناظر میں پرکھا اور اس کے اخلاقی مباحث کو نہ صرف وسعت دی بلکہ

نئے نئے رجحانات بھی ظاہر کیے اور عملی زندگی سے اس کا رشتہ بھی جوڑا اس وجہ سے فرد نے انفرادی اور اجتماعی اصلاح کے لیے اپنے حقوق و فرائض کے بارے میں جانا۔ اگرچہ علماء اخلاقیات کے ہاں ''اخلاق، کی شرح کے بارے میں کچھ اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مذاہب میں اخلاقیات کی بنیاد کیا ہے۔

اسلام کی اخلاقیات:

اسلام کے مطابق اخلاق کی حیثیت جزوی یا ثانوی نہیں بلکہ بنیادی ہے۔مثلاً

''حضرت محمد ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''عمدہ اخلاق کی تکمیل کے لیے میں معبوث ہوا ہوں۔'' (۵۰)

اسلام انسانیت کی بھلائی، سلامتی، طمانیت اور رضائے خدا پر سر جھکانے کا مذہب ہے۔اس کے بنیادی اصولوں میں اللہ کی محبت اور بندے کی محبت شامل ہے۔اسلام کے اخلاقی اصولوں کے بارے میں ''فلسفہ مذاہب'' میں درج ہے کہ:

''اسلام کے اخلاقی اصول مسلمانوں کے طرزعمل، برتاؤ، مذہبی سرگرمیوں کے ساتھ بہت ہی قریبی تعلق رکھتے ہیں۔قرآن میں کہا گیا ہے کہ غلاموں کے ساتھ انسانی سلوک روا رکھا جائے...... جوا بازی، شراب اور سور کے گوشت سے پرہیز......ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ برادرانہ اور فیاضانہ سلوک کرنا چاہیے۔ مذہب اسلام خدمت کو بہت زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے......مسلمان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ نرم دل، مخلص، حق پرست، مخیّر اور گناہ سے دامن بچانے والا بنے۔'' (۵۱)

اسلام میں اخلاقیات کا منبع قرآن حکیم ہی کو تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی کی بنیاد پر انسان کی عملی اور تہذیبی زندگی کی نشوونما کے لیے قوانین یا اخلاقی احکام وضع کیے جاتے ہیں۔اسلام کے مطابق انسان فطرتاً نیک پیدا کیا گیا ہے۔

قرآن حکیم کے مطابق:

''انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے۔''

اسلامی فلسفہ اخلاق میں ہمیں یہ تصور بھی ملتا ہے کہ انسانی فطری طور پر نیکی کی طرف رغبت رکھتا ہے اور انسان کی شخصیت کی تربیت اس نہج پر ہونی چاہیے کہ مجموعی ماحول کو کارآمد بنایا جا سکے۔تا کہ دین اور دنیا دونوں کو ذمہ داریاں احسن طریقے سے پہنچائی جاسکیں۔اس سلسلے میں ڈاکٹر مظفر حسن ملک لکھتے ہیں کہ:

''اگرچہ اسلامی اخلاقی نظام کا دائرہ عمل عملی اور عمرانی ہے مگر اس کی روح روحانی اور دینی ہے۔اس کا

سرچشمہ نیکی کی فطری صلاحیت ہے اور اس صلاحیت کی نشوونما کا احصار ایک طرف تو تقویٰ، تزکیہ اور طہارت پر ہے تو دوسری طرف عملی نفاذ تکرار، مشق اور عادات واطوار کی پختگی پر استوار ہے۔" (۵۲)

اسلام نے انسان کے لیے ایک نظام زندگی بنایا ہے اور ایک راہ بتائی ہے جس پر چل کر وہ ذاتی اور اجتماعی فلاح کا باعث بن سکتا ہے۔ جو ان احکام پر عمل کرتا ہے اور اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیتا ہے اس کے لیے جزا اور جو ان سے پھرتا ہے ان کے لیے سزا مقرر کی ہے۔

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان و ایتاء ذی القربیٰ والیتمی عن الفحشاء و المنکر والبغی

بیشک اللہ حکم دیتا ہے انصاف، احسان اور قرابت والوں سے سلوک کرنے کا اور منع کرتا ہے بیہودگی، برائی اور سرکشی سے، (۵۳)

من عمل صالحاً من ذکرا و انثیٰ و ھو مومن فلنحیینیہ حیاۃ طیبۃ ولنخرینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون ان اللہ لا یحب المفسدین (القصص)

جو مومن مرد یا عورت نیک عمل کرے گا ہم یقیناً اس کو اچھی زندگی بخشیں گے اور ان کے اعمال سے زیادہ اچھا اجر ان کو عطا کریں گے یقیناً اللہ تعالیٰ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔" (۵۴)

کیونکہ جن اعمال کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا یقیناً ان میں تمام عالم انسانیت کی بھلائی مضمر ہے اور ان سے انحراف کرنے سے اپنی ذات میں نہ صرف انتشار پیدا ہوتا ہے بلکہ اجتماعی سالمیت بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

مسلمان اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس لیے ان کے دلوں میں خدا کا خوف موجود رہتا ہے مثلاً قرآن پاک میں ہے کہ:

"لا خوف علیھم ولاھم یحزنون" (۵۵)

اللہ کا خوف اس کے دل سے دنیا کے باقی خوف نکال دیتا ہے اور یہ خوف اسے اخلاقیات کا درس دیتا ہے اور انسانیت کے دائرے میں لے آتا ہے، کیونکہ اسلامی احکام وقوانین ہی سے دنیا کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

اسلامی اخلاقیات صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے سلامتی اور بقا کا باعث بن سکتی ہے کیونکہ اسلام نے ہمیشہ دوسری تہذیبوں کو اپنے اندر جذب کر کے زندگی گزارنے کے بہتر طریقے وضع کیے ہیں۔ اس سلسلے میں کیرن

آرمسٹرانگ لکھتی ہیں کہ:

"Islam had always thirived on contact with other civilizations."(56)

یعنی اسلام نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ اقوام عالم کے لیے دین و دنیا میں اعتدال وتوازن قائم رکھ سکتا ہے۔

مسیحی اخلاقیات:

مسیحیت امن، سلامتی اور محبت کا مذہب ہے۔ انجیل مقدس میں محبت کو ہر شے پر فوقیت دی ہے اور دو احکامات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انجیل مقدس میں مرقوم ہے کہ:

''اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ اور دوسرا یہ کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ ان سے بڑا اور کوئی حکم نہیں۔'' (۵۷)

مسیحیت میں اپنے پڑوسی سے محبت رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں سے محبت رکھو۔ مسیحیت میں نہ صرف دوستوں سے محبت رکھنے کا درس موجود ہے بلکہ دشمنوں سے بھی اچھے سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ متی کی انجیل ۵ باب ۴۴ آیت میں مرقوم ہے کہ:

''لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا کرو۔'' (۵۸)

مسیحیت میں جہاں نہ صرف اپنوں اور دوستوں کے لیے محبت کا درس ہے وہاں غیروں اور دشمنوں کے لیے بھی بھلائی کا حکم اور دعا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ دیگر معاشرتی احکام بھی ملتے ہیں۔ مثلاً

''یسوع نے کہا یہ کہ خون نہ کرنا، زنا نہ کرنا، چوری نہ کرنا، جھوٹی گواہی نہ دے اپنے باپ اور ماں کی عزت کر اور اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ۔'' (۵۹)

مسیحیت محبت کا پیغام ہے اور اس میں فضیلت بھی محبت کو دی گئی ہے۔ مسیحیت کے مطابق دنیا میں ہر شے پر محبت کو فوقیت حاصل ہے۔ مسیحیت ایثار کا مذہب ہے کرنتھیوں کی کتاب ۱۳ باب میں مرقوم ہے کہ:

''اگر میں آدمیوں اور فرشتوں کی زبانیں بولوں اور محبت نہ رکھوں تو تو میں ٹھنٹھناتا پیتل یا جھنجھناتی

جھانجھ ہوں......" (٦٠)

محبت کی بنیاد پر کائنات تخلیق کی گئی ہے اور محبت کی دم سے ہی قائم رہ سکتی ہے کیونکہ محبت کو کبھی زوال نہیں ہوتا اور محبت بیہودہ کاموں، شیخی، حسد، بدگمانی، بدکاری سے خوش نہیں ہوتی۔ اسی باب میں آگے چل کر بیان کیا گیا ہے کہ

"غرض ایمان امید محبت یہ تینوں دائمی ہیں مگر افضل ان میں محبت ہے۔" (٦١)

محبت میں ہی لفظ اخلاقیات موجود ہے۔ انسانیت کی بھلائی اور بنی آدم کی بقاء کے لیے مسیحیت میں بھی ایسی اخلاقی تعلیمات دی گئیں ہیں جو انسان کی انفرادی، روحانی معاشرتی اور اخلاقی اجتماعی ترقی اور خوشحالی کے سبب بن سکتی ہیں اور دنیا کو امن وسلامتی گہوارہ بنانے میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔

یہودیت میں اخلاقیات:

یہودی مذہب میں ایک خدائے واحد پر ایمان کی ہدایت کی گئی ہے۔ ان کے نزدیک خدا کا تصور، خدائے یہواہ کا ہے۔

"حضرت موسیٰ نے توحید کی دعوت دی اور یہواہ (Yahwah) کی پرستش کی تلقین کی ہے۔ یہودی خدا کو یہواہ کہتے ہیں۔" (٦٢)

یہودیت کی روح سے تمام طاقت کا سرچشمہ خدائے واحد کی ذات ہے۔ وہ ہی تمام کائنات کا خالق و مالک ہے اور خدا نے انسان کو ایک مقصد کے ساتھ خلق کیا ہے۔ اس سلسلے میں امولیہ رنجن مہاپتر "فلسفہ مذاہب" میں لکھتے ہیں کہ:

"یہودیت کے مطابق زندگی اخلاقی تگ ودو کا نام ہے اور انسان کو خدا کی الوہی سرگرمیوں میں رفیق کار بننا ہوتا ہے۔ الوہیت، خدا کی برابری، بے لوث ہوکر نیکی کرنا یہودیت میں انسانی وجود کا اصل مقصد ہے۔" (٦٣)

یہودی مذہب انسان کو خدا کی صفات اپنا کر، نیک اور پاک طرز حیات کی ترغیب دیتا ہے اور نوع انسانی کی فلاح کی جانب راغب کرتا ہے۔ الغرض یہودیت اخلاقیات کی تعلیم کو عملی طور پر برتنے کی تلقین کرتی ہے۔ یہودیت میں سزا اور جزا کا تصور موجود ہے کہ نیک اعمال پر انعام اور بدی پر سزا دی جائے گی مثلاً خروج کی کتاب میں مرقوم ہے کہ:

"کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں اور جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں ان کی اولاد کو تیسری اور چوتھی پشت تک باپ دادا کی بدکاری کی سزا دیتا ہوں اور ہزاروں پر جو مجھ سے محبت رکھتے اور میرے حکموں کو

مانتے ہیں رحم کرتا ہوں۔'' (٦٤)

یہودیت میں خدا کے احکام ماننے کی سختی سے تنبیہہ کی گئی ہے اور واضح طور پر اخلاقی تعلیمات دی گئی ہیں اور انسان اور کائنات کی ترقی کی ذمہ داری انسان کو سونپی گئی ہے۔

دین ابراہیمی اور اخلاقیات:

دنیا کے قدیم مذاہب میں سے دین ابراہیمی نے خدائے واحد کا تصور پیش کیا تھا۔اس کے بارے میں قرآن پاک میں مرقوم ہے کہ:

''(حضرت ابراہیم نے) کہا اے میری قوم جن چیزوں کو تم شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ میں تو اپنا رخ اس کی طرف کر چکا ہوں، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''(٦٥)

دین ابراہیمی میں اللہ واحدہٗ لاشریک کو اپنے دل میں جگہ دے کر دنیاوی برائیوں سے پرے رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر تم اپنے دل میں جگہ دو گے تو ایسی صفات تمہاری خلوت کا حصہ بن جائیں گے اور تم نفسانی اور دنیوی خواہشات سے دور رہو گے اور پاکیزگی اور راستبازی سے زندگی بسر کر کے طمانیت قلب حاصل کر سکو گے۔

ہندومت اور اخلاقیات:

ہندو بہت سے خداؤں کی پرستش کرتے ہیں۔لیکن خدا کی واحدانیت پر یقین بھی رکھتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں ہر خدا واحد ہے۔اس بارے میں ''فلسفہ مذاہب'' میں درج ہے کہ

''اگر چہ ہندومت دیوتاؤں کی ایک بہت بڑی تعداد کو مانتا ہے، لیکن درحقیقت وہ انہیں خدائے واحد کے مختلف روپ خیال کرتا ہے۔''(٦٦)

خدا کے متعلق ہندو مذہب میں مختلف النوع عقائد موجود ہیں۔ ہندو مذہب میں بھی ایشور، برہما، ہی تمام کائنات کا خالق ہے اور وہ ہی کائنات کا محافظ ہے۔اس بارے میں پروفیسر ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''ہندو مذہب میں انسان کے چار دور ہیں۔ ایک ابتدائی عمر کا دور جو طالب علمی کا زمانہ ہے، جس میں

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی ذات پر حکمرانی حاصل کرے وہ یوں کہ غصے اور خواہشات نفسانی سے پرہیز کرے۔ دوسرا دور شادی اور گھرداری سے متعلق ہے اور تیسرے دور میں انسان دنیا سے اپنا رشتہ توڑ کر اور گھر کی ذمہ داریاں بچوں کے سپرد کر کے حصول عرفان کے لیے گھر بار چھوڑ دیتا ہے۔ چوتھے دور میں برہما یا خدا سے وصال حاصل کرتا ہے۔'' (۶۷)

چنانچہ ہندوازم میں انسان کو انفرادی طور پر منضبط کر دیا گیا ہے اور عمر کے مختلف حصوں کو چار ادوار میں تقسیم کر کے انسان کو انفرادی یا ذاتی بقا کے حصول کے لیے اعلیٰ اخلاقی صفات اپنانے کا لائحہ عمل تیار کیا گیا ہے۔

بدھ مت اور اخلاقیات:

بدھ مت میں خدا کا تصور موجود نہیں ہے۔ گوتم بدھ نے انسان کی عملی زندگی کے لیے مخصوص اخلاقی اور سادہ اصول وضع کیے ہیں۔ اس سلسلے میں فلسفہ مذاہب میں درج ہے کہ:

''اس کی تعلیمات نہایت سادہ اور واضح ہیں، جو چار اعلیٰ اخلاقی نیکیوں اور سچائی پر مشتمل ہیں...... دکھ، دکھ کی جڑ، دکھ کا خاتمہ اور دکھ کے خاتمہ تک پہنچانے والی راہ یہ حصول نروان کے معاون ہیں۔'' (۶۸)

بدھ مت میں ''نروان حاصل کرنا ہر سچے بدھسٹ کی خواہش ہوتی ہے اور بدھ ازم کے مطابق انسان زندگی میں کئی بار جنم لیتا ہے اور نروان سے مراد حیات وموت کے سلسلے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہے۔ گوتم بدھ نے اسی کے ذریعے انسانوں میں اخلاقیات کی طرف راغب کر کے جزا اور سزا کا تصور دیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر صدیقی لکھتے ہیں کہ

''نروان حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان زندگی میں اسی ریاضت اور نیک کام کرے کہ یہ چراغ حیات، جو بار بار روشن ہوتا ہے اور بجھتا ہے۔ ہمیشہ کے لیے گل ہو جائے۔'' (۶۹)

بدھ مت میں بھی نیک اعمال زندگی کی راحتوں کے حصول کا ذریعہ ہے اور اس سے زندگی میں لالچ اور گناہ کی شرح بہت کم رہ جاتی ہے اور پاکیزگی زندگی کے رگ و پے میں سمو جاتی ہے۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی بدھ مت کے آٹھ اخلاقی اصول بھی واضح کرتے ہیں۔

''بدھ مذہب کے ہشتگانہ (آٹھ) اخلاقی اصول ہیں، عقیدہ پاک، ارادہ پاک، سخن پاک، رفتار پاک، روزی پاک، جدوجہد پاک، تفکر پاک اور تصور پاک۔'' (۷۰)

نیکی اور بھلائی خود اپنی ذات اور اجتماعی سطح پر بھی فلاح کا باعث بن سکتی ہیں۔ بدھ مت میں انہی اوصاف پر زور دیا گیا ہے۔

سکھ مت اور اخلاقیات:

سکھ مذہب دراصل ہندومت اور اسلام کا مرکب ہے۔ان کے ہاں بھی ذات پات کی تخصیص کو برا منایا جاتا ہے، غرور و تکبر سے دور رہنے کو نیکی تصور کیا جاتا ہے۔ دنیاوی آلائشوں سے قطع تعلق ہوکر پاکیزگی سے زندگی بسر کرنا ہی انسان کا مقصد حیات ہے۔اس سلسلے میں ''فلسفہ مذاہب'' میں مرقوم ہے کہ:

> ''مذہب کی ایک صورت کے طور پر سکھ مت اخلاقی اقدار رکھتا ہے۔گرونانک نے حصول خدا کے لیے دل و دماغ کی پاکیزگی پر زور دیا ہے۔انہوں نے ذہن کی پاکیزگی کا تعلق جسم کی صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ جوڑا۔ ہر فرد کو روحانی زندگی گزارنی چاہیے انسان کو نیک بننا اور تمام برائیوں سے دور رہنا چاہیے۔''(۷۱)

سکھ مت میں بھی نیک اعمال کی طرف ہی انسان کو راغب کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور محبت، انکساری، قناعت، بھائی چارے اور تزکیہ نفس جیسی اخلاقی تعلیمات دی گئی ہیں۔

تمام مذاہب میں انسان کے خدا اور انسان کے انسان کے ساتھ تعلق کو بہتر بنانے کے بارے میں تعلیمات دی گئی ہیں۔خواہ الہامی مذاہب ہیں یا نہیں۔لیکن اخلاقی اصول سب کے سب انسان کی فلاح و بہبود کے لیے تھے۔گو انسان نے ہمیشہ مذہب کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مذہب کی بنیادوں کے بغیر صحت مند معاشرے کی تشکیل ہو ہی نہیں سکتی، مذاہب کی بنیاد پر ہی ایک ایسا معاشرہ قائم ہوسکتا ہے جس میں امن و سلامتی ہو کیونکہ کسی بھی مذہب میں ایسی اخلاقی تعلیمات نہیں ہے جو انسان کی دل شکنی یا نسل شکنی کا باعث بنیں۔بہتر انسان وہی سمجھا جاتا ہے جس کا اخلاق بہتر ہو۔اس بارے میں مولانا رحمت اللہ سبحانی لکھتے ہیں کہ:

> ''انسان ہزار عالم و فاضل اور عابد و زاہد ہو اگر وہ اوصاف اخلاق سے محروم ہے تو اس کے علم وفضیلت اور عبادت و زہد سب ہیچ ہیں۔اعتقادی طور پر انسان خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو لیکن ہر انسان میں حقیقی جوہر انسانیت ہونا ضروری ہے۔''(۷۲)

اخلاق ہی وہ سب سے آسان ذریعہ ہے جس سے خدا اور انسان دونوں سے بہتر رشتہ استوار کیا جا سکتا ہے۔چنانچہ

موجودہ دور میں مذہبی اختلافات کی بناء پر دشمنی کرنا یا لڑنا جھگڑنا جہالت کے زمرے میں آتا ہے۔ ہر شخص کو حق ہے کہ اپنے مذہب اور عقیدے کے مطابق زندگی گزارے اور کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ دوسرے فرد کی دل آزاری مذہبی بنیادوں پر کرے بلکہ اگر تمام مذاہب کے افراد صرف اپنی مذہبی اخلاقیات کے مطابق ہی زندگی گزاریں تو یہ دنیا امن کا گہوارہ بن سکتی ہے۔

ہر دور میں مذاہب، اخلاق کو بہتر بنانے اور سنوارنے کے لیے کوشاں رہے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری یہ بھی ہے کہ اس مذہب کے پیروکاران تعلیمات پر غور کر کے انہیں اپنائیں تا کہ معاشرے کو بہتر بنایا جا سکے کیونکہ مذہب کے علاوہ دوسرے عناصر بھی اخلاقیات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس صورت میں مذہب اخلاق کو سنوارنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بیگم اختر امام لکھتی ہیں کہ:

''اکثر حالات میں مذہب اپنے ماننے والوں کے اخلاق اور اخلاقی اعمال کو متاثر کرنے میں ناکام دیتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب سماجی کنٹرول کے دوسرے وسائل جتنا موثر نہیں ہے۔'' (۷۳)

وراثت، ماحول، تعلیم اگرچہ انسان کی شخصیت کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ لیکن مذہب کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مذہب ہی وہ پیٹرن ہے جس پر چل کر انسان خیر او شر کی حقیقت کو سمجھتا اور اس کے اسباب اور نتائج پر غور و فکر کر کے ''اخلاق'' کی وسعت میں اضافہ کرتا ہے تا کہ چاہے کوئی اپنے مذہبی احکامات کو مانے یا نہ مانے لیکن معاشرے کے مقرر کردہ اخلاقی پہلوؤں سے انحراف نہ کر سکے۔ کیونکہ مذہب کا مقصد ہی انسان کے اخلاق کو بہتر بنانا ہے اس سلسلے میں علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں کہ:

''اور انسان نے محسوس کیا کہ مذہب کا مقصد اولین دیومالا کے اساطیر وقصص کے چکر میں پڑنا یا قربانی کی پیچیدہ رسوم کی ادائیگی سے فوق الفطرت ہستیوں کی استرضا نہیں ہے بلکہ تزکیہ وتصفیہ قلب ہے۔'' (۷۴)

انسان کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے نئے نئے طریقے دریافت کرتا رہتا ہے اور جب کوئی ایک کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو دوسری کی جانب سفر شروع کر دیتا ہے۔ لیکن بہر حال وہ بہتر ماحول کا آرزو مند رہتا ہے۔ اسی بارے میں ڈاکٹر سی۔ اے قادر لکھتے ہیں۔

''یہ سچ ہے کہ انسان بسا اوقات ست جگ کو یاد کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دنیا کو ایسے بدلنا چاہتا ہے کہ وہ اس کی خواہشات کے قریب تر ہو۔'' (۷۵)

اخلاقیات ایک ایسا علم ہے جو انسانی زندگی کے افعال اور اعمال سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف انسان کی

داخلی اور باطنی الجھنوں کو دور کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ عملی زندگی کے لیے راہنما اصول بھی فراہم کرتا ہے۔لیکن اس کا کام ان اصولوں کا اطلاق کروانا نہیں ہے یا پند و نصائح کرنا نہیں، نہ ہی وعظ و تلقین کرنا ہے بلکہ یہ انسان کو خیر اور شر،صواب اور غیر صواب، نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی میں امتیاز کرنا سکھاتا ہے اور اس پہچان کی بدولت انسان کائنات کو دیکھنے اور اس سے برتاؤ کرنے کا طریقہ تبدیل ہو جاتا ہے اور زندگی کے نشیب و رموز سے گہرے طور پر واقفیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور فرد کا خود اپنی ذات سے انفرادی طور پر اور معاشرے کے ساتھ اجتماعی طور پر رویہ مثبت اور معیاری ہو جاتا ہے۔

ج۔ادب اور اخلاقیات

اخلاقیات فلسفے کی ایک ذیلی شاخ کا نام ہے اور اس کی حیثیت نظریاتی یا معروضی نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق عملی زندگی پر ہوتا ہے۔علم الاخلاق یا اخلاقیات کا موضوع انسان کی زندگی میں خیر اور شر کے تصور سے وابستہ ہے۔

> ''سقراط کے نزدیک نیک بننے کے لیے خیر کا تصور اور علم ہی کافی ہے۔اس کے خیال میں شر اور فساد لاعلمی یا جہالت کی بنا پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔'' (۷۶)

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو جانور سے انسان بنانے اور معاشرے کی تہذیب کرنے کے لیے اخلاقیات نے ہی ضابطے مقرر کیے ہیں۔ یہ وہ مقرر کردہ ضابطے ہیں جو خیر یا شر اور اچھے اور برے ہونے کا امتیاز کرتے ہیں۔اس بارے میں ''اخلاق اور فلسفہ اخلاق'' محمد حفیظ سیوہاری لکھتے ہیں کہ:

> ''علم الاخلاق کا بھی یہی حال ہے اس کی طاقت سے یہ تو باہر ہے کہ وہ ہر انسان کو صالح بنا دے لیکن انسان کو اچھے اور برے میں امتیاز کراتا، اور اس کی چشم عبرت کو وا کرتا ہے تاکہ وہ خیر و شر اور اس کے آثار و لوازم کو دیکھے اور پہچانے۔'' (۷۷)

مہذب اور متمدن معاشرے میں فرد کو اس کے مقرر کردہ معیار کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ مذہبی احکام سے لے کر معاشرتی اصول وضوابط تک تمام احکامات اخلاقیات کے زمرے میں آتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر ابصار احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''تاریخ فلسفہ میں لفظ ''ایتھکس'' یعنی فلسفہ اخلاق سے بالعموم تین قسم کے مفہوم مراد لیے گئے ہیں جو

باہم ایک دوسرے سے مربوط ہونے کے باوجود اپنی علیحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ وہ تین مفہوم یہ ہیں:

۱۔ زندگی ایک عمومی ضابطہ حیات۔

۲۔ کردار وافعال کے احکام یا ''ضابطہ اخلاق''

۳۔ طرز حیات یا ضابطہ کے بارے میں علمی تحقیق وجستجو (۷۸)

ان تین مفاہیم میں اخلاقیات کے تین مختلف زاویے مقرر کیے گئے ہیں پہلے مفہوم میں اخلاقیات سے مراد مذہبی اخلاقیات، دوسرے مفہوم کے مطابق شعبہ جاتی اخلاقیات مثلاً شعبہ تعلیم و تدریس اور شعبہ طب وغیرہ میں اخلاقیات اور تیسرے مفہوم سے مراد اخلاقیات کے مختلف نظریات پر بحث وتمحیص مراد ہے اور ان سب کا اطلاق انسان پر ہوتا ہے اور اس کا وجود، اجتماعی زندگی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اس بارے میں لکھتے ہیں:

''اخلاقیات کا سارا نظام رشتوں اور رابطوں سے مشروط ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص کسی ایسے لق و دق صحرا میں ہے جہاں کوئی ذی روح تک موجود نہیں تو ایسی صورت میں اس پر کسی بھی نظام اخلاق کا اطلاق کیسے ہوسکتا ہے؟ مگر اسی لق و دق صحرا میں اگر کوئی دوسرا شخص نمودار ہو جائے تو رابطہ کی ایک صورت فی الفور پیدا ہو جائے جو کسی نہ کسی نظام اخلاق کی تابع ضرور ہوگی۔'' (۷۹)

گویا تنہا، معاشرے سے کٹ کر نہ تو کوئی انسان زندگی گزار سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نظام اخلاق ارتقاء پذیر ہوسکتا ہے۔ اس لیے ''بدھ مت'' میں ''بدھ'' اگرچہ تنہائی پسند تھا لیکن اس نے فرد اور معاشرے میں بہتری کے لیے تعلیم ضرور دی ہے، مثلاً اس سلسلے میں امولیہ رنجن مہا تیر بیان کرتے ہیں کہ:

''بدھ کے پانچ فرمان (پنچ پشل)

۱۔ کسی زندہ شے کو مت مارو۔

۲۔ جو تمہیں نہیں دیا گیا اسے مت لو۔

۳۔ جھوٹ مت بولو۔

۴۔ نشہ آور مشروبات مت پیو۔

۵۔ بدکاری نہ کرو۔'' (۸۰)

بدھ اوراس کے پیروکاروں کے نزدیک انسان کی زندگی چراغ کی لو کے مترادف ہے جس کی لو جھلملاتی رہتی ہے اور ہر لمحہ تبدیل ہوتی رہتی ہے اور انسان کی روح ایک جسم سے نکل کر دوسرے میں داخل ہو کر دوبارہ جنم لیتی ہے۔اسی لیے انسان کے دکھ کی وجہ سے روح سے غیر ضروری لگاؤ ہے۔تاہم بدھ کی تعلیمات اور فلسفہ اخلاق کا مجموعہ ''تری پٹک'' کہلاتا ہے۔

''مسیحی اخلاقیات'' میں بھی فرد اور معاشرے کے درمیان واضح طور پر ربط پیدا کرنے کے لیے احکامات مقرر کیے گئے ہیں تاکہ تمام دنیا امن وسلامتی کا گہوارہ بن سکے۔

انجیل مقدس میں مرقوم ہے کہ:

''تم زمین کے نمک ہو لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا؟ پھر وہ کسی کام کا نہیں سوا، اس کے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے پاؤں کے نیچے روندا جائے۔تم دنیا کے نور ہو۔ جو شہر پہاڑ پر بسا ہے۔ وہ چھپ نہیں سکتا اور چراغ جلا کر پیمانہ کے نیچے نہیں بلکہ چراغ دان پر رکھتے ہیں تو اس سے گھر کے سب لوگوں کو روشنی پہنچتی ہے۔اسی طرح تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے تاکہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے تمجید کریں۔''(۸۱)

دنیا میں روشنی پھیلانے اور تاریکی کو دور کرنے کے لیے نیک اعمال کرنے کے احکامات جاری کیے گئے ہیں اور اس کے ساتھ سزا اور جزا کے تصورات بھی ساتھ جوڑ دیئے گئے۔

اسلام میں اخلاقیات کا منبع قرآن حکیم کو ہی تسلیم کیا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر مظفر حسن ملک لکھتے ہیں کہ:

''ہر اخلاقی قدر کا مقصد صرف فرد کی ذاتی خواہشات کی تسکین نہیں بلکہ اس کا اجتماعی اور معاشرتی پہلو بھی موجود ہوتا ہے۔''(۸۲)

اسلام نے انسان کی عملی اور تہذیبی زندگی کی نشوونما کے لیے اصول وقوانین وضع کیے اور سزا اور جزا کا تصور اس میں بھی موجود ہے۔مثلاً

''جنت ان کے لیے ہے جو اچھے اخلاق سے برائی کو دفع کرتے ہیں۔''(۸۳)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آپؐ نے فرمایا کامل الایمان وہ شخص ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔''(۸۴)

اسلام نے فطری قویٰ اور طبعی حالتوں کی تربیت کے لیے اصول وضع کر دیئے ہیں تاکہ ان کی تربیت کے بعد ایک

بہتر انسان کا وجود اور مثبت معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکیں۔ مثلاً

''اسلام بتایا ہے کہ انسان کی طبعی حالتیں جن کا سرچشمہ نفس امارہ ہے انسان کی اخلاقی حالتوں سے کچھ الگ چیز نہیں بلکہ وہی حالات ہیں جو تربیت سے اخلاقی حالت کا رنگ پکڑ لیتے ہیں۔'' (۸۵)

اسلامی اخلاقیات کا نظام فرد کی اخلاقی تربیت کرتا ہے، گویا فرد اور معاشرے کا تعلق بھی مثبت پیمانے پر استوار کرتا ہے اور نیکی اور خیر کو پھیلانے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اخلاقیات کو مذہب کے دائرے میں مقید کر کے نہیں رکھ سکتے، کیونکہ ہر شخص مذہب کے اصولوں پر کاربند نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے والا بچہ ضروری نہیں کہ اسلامی تعلیمات کا پیروکار بھی نہیں۔ اس لیے بعض علمائے اخلاقیات نے اخلاقیات انسان کی فطرت میں موجود ہوتی ہے خواہ وہ کسی بھی مذہب یا معاشرے سے تعلق رکھتا ہو، اس لیے ''اخلاقیات'' کائنات میں اندر روز اول سے موجود ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

''ایک ہی نوع کی اشیاء میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے جو اس نوع کا وصف خاص ہے۔ مثلاً تمام کرسیوں میں کرسی پن اور تمام بلیوں میں بلی پن اپنی نوع کا ایک مشترک وصف ہے۔ افلاطون نے اس وصف ہی کو اہمیت دی ہے۔ کائنات بھی ایک نوع ہے اور اس کا وصف خیر ہے جو کائنات کی Appearance کے عقب میں ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ افلاطون نے اچھائی یا خیر کو تمام نیک اعمال کی منزل تو قرار دیا ہے مگر اچھائی یا خیر کو نشان زدہ کرنے کی کوشش نہ کی۔

یہ کام ارسطو نے کیا جب اس نے ''مسرت'' کو سب سے بڑی اچھائی یا خیر قرار دیا۔ مراد یہ کہ ہر وہ عمل جس سے مسرت کی تحصیل ہو، اچھا ہے۔ گویا ارسطو نے نیکی کو مقصود بالذات قرار نہیں دیا بلکہ اسے حصول مسرت کا ایک ذریعہ متصور کیا۔'' (۸۶)

اخلاقیات کا وصف انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ علم اخلاق کا مقصد اس کی تربیت ہے تاکہ دنیا میں امن و امان کو برقرار رکھا جا سکتا اور وحشی قبائل اور غیر متمدن معاشروں کو ایسی تہذیب کے دائرے میں لایا جا سکے جو انسان کی خوشی کا باعث بن سکے۔ چنانچہ ''نشاط فلسفہ'' میں درج ہے کہ:

''اگر ایسا اخلاق مرتب کیا جائے جو مذہبی عقائد سے مستثنیٰ ہو تو یہ مذہبی عقائد آتے جاتے رہیں۔ لیکن وہ اخلاقی رشتے نہ ٹوٹنے پائیں جو مختلف افراد کو ایک پرامن دنیا کے شہری بناتے ہیں۔ مثلاً اگر نیکی کا

مطلب ذہانت اور دانش ہو اور اگر انسانوں کو ان کے صحیح مفاد سے آگاہ کیا جائے اور انہیں اپنے اعمال کے دور رس نتائج کو دیکھنے اور اپنی منتشر آرزوؤں کو ایک مربوط نظام میں ڈھالنے کی تعلیم دی جائے تو شاید اس طرح ایک مہذب انسان کو وہ اخلاق میسر آ جائے جو کہ جہلا کے لیے محض الہاتی پابندیاں اور حکومت کے احکام ہیں۔'' (۸۷)

ادب اور اخلاقیات کا ربط انسان اور معاشرے سے ایسا ہی ہے جیسے روح کا رشتہ جسم سے، اشفاق احمد ادب کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

''لیکن ادب اس سچائی کی تلاش کا نام ہے جو ظاہر سے پرے باطن کی کھوج بھی ہے یا موجود سے الگ ناموجود کی جستجو بھی ہے۔ ادب نہ تو خالی اطلاع اور نہ ہی محض وجدان، نہ صرف انفارمیشن اور نہ تمام انسپریشن۔ یہ احساسات اور فہم کے ایک ساتھ یا قدم بہ قدم چلنے کا نام ہے، جس طرح فرمایا گیا ہے کہ ملا دیئے گئے ہیں جو دو سمندر جو باہم ملتے ہیں اور ان دونوں میں پردہ ہے کہ وہ حد سے تجاوز نہیں کر سکتے! گویا جہاں حد سے کسی قسم کا بھی تجاوز ہوتا ہے وہاں ''خیر'' ختم ہو جاتا ہے اور ''غیر'' اس کی جگہ لے لیتا ہے یعنی جب ادب غیر کے قبضے میں چلا جاتا ہے تو صرف اطلاع فراہم کرنے لگتا ہے اور اپنے عہد کو اپنے معاشرے کو (Information Oriented Society) بنا دیتا ہے۔'' (۸۸)

اخلاقیات کا کام انسان کے لیے بہتر معاشرے کا تصور وضع کرتا ہے اور انسان کی شخصیت کی تعمیر صحیح سمت میں کرنے کے لیے بنیادیں فراہم کرنا ہے اور اسی طرح ادب بھی انسان کے باطنی احساسات اور جذبات کی تہذیب کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

''ادب بنیادی طور پر ایک اخلاقی فعل ہے اور ادیب اخلاقیات کا ایک بہت بڑا نمائندہ وہ یوں کہ جب ادیب تخلیق کاری میں مبتلا ہوتا ہے تو جذبے کو مشتعل کرنے کے بجائے اس کی تہذیب کر دیتا ہے۔'' (۸۹)

ادب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کے اندرونی احساس اور جذبے کو اسلوب کے سپرد کرتا ہے۔ ادب کائنات کو اور اس میں بکھرے تلخ و شیریں ذائقوں کو حسن بخشتا ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں کہ:

''روح خلاقی (Creative Spirit) اسے احسن الخالقین اپنے بندوں میں سے ان میں القا کرتا ہے

جنہیں وہ خالق وحسن کار بنانا چاہتا ہے، جیسے فنکار، اہل قلم، ادیب، مصنف اور فنان وغیرہ متعدد ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ روح خلاقی سے تخلیقی جذبہ و داعیہ اور فنی قابلیت و استعداد پیدا ہوتی ہے اور یہ تخلیقی فضیلت کے عوامل اور محرکات میں سے ہے۔''(۹۰)

ادب کی تعریف آزاد کوثری کے مطابق:

''ادب کے لیے انگریزی کا لفظ لٹریچر ہے اور یہ لفظ لاطینی لفظ (Littera) سے آیا ہے جس کے معنی ہیں حروف تہجی کا ایک حرف اور اس لحاظ سے لٹریچر سے ایک معنی یہ بھی لیے گئے ہیں کہ انسانیت کے پاس جو کچھ بھی لکھا ہوا موجود ہے وہ سب کچھ لٹریچر میں شامل ہے۔ ادب کی حدود متعین کرتے ہوئے اسے تخلیقی ادب تک محدود کر دینا بہتر ہوگا۔ یہ بحث محض اس لیے کی گئی ہے کہ لفظ لٹریچر کے اصل معانی شائع شدہ الفاظ تک پھیلے ہوئے ہیں۔''(۹۱)

ادب زندگی کا عکاس ہے اور اس کے ہر انگ کو سلیقے سے پیش کرنے کا ادب نام ہے مثلاً حفیظ الرحمٰن اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ:

''اس لحاظ سے ادب فن کی شاخ وہ ہے، جس میں خیالات تحریری صورت میں حسن ادا کے ساتھ بیان کئے گئے ہوں۔ گویا ادب دو چیزوں سے وجود میں آتا ہے۔ ایک مواد یعنی موضوع۔ دوسرے ہیت یعنی بیان کی ظاہری صورت۔ اس طرح مواد اور ہیئت کے خوبصورت ملاپ کا نام ادب ہے۔(۹۲)

ادب کا مقصد آدمی کو انسان بنانا اور انسان کی اپنی کیمسٹری اس کو روشناس کروانا ہے۔ تلقین یا نصیحت کرنا ہرگز نہیں ہے۔ بقول آزاد کوثری:

''ادب کی یہ تعریف کہ وہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عکاس ہے جس میں جذبات کی اپیل ایک لازم جزو ہے خود اپنے لیے وظیفے اور فریضے متعین کر لیتی ہے اور ہر عظیم ادیب اور فنکار یہ سب کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ادب کے تقاضوں کو سمجھتا ہے۔''(۹۳)

ادب کسی ایک رویے، قوم، سرحد یا زمانے تک محدود نہیں ہوتا بلکہ ادب ہر زمانے میں ہر قوم کے رویے کا عکاس ہوتا ہے ''بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس'' میں درج ہے کہ:

''ادب کی تخلیق ایک جاری وساری عمل ہے جو تاریخ کے ہر دور میں اپنے ماحول اور اس سے وابستہ سماجی

اقدار سے خام مواد حاصل کرتا ہے۔ ماحول کی تبدیلی اور اس کے نتیجے میں سماجی اقدار کی تغیر پذیری اور ادب کے نئے زاویوں اور تخلیق کے نئے سانچوں کا تعین کرتی ہے اور یوں ایک نیا طرز احساس جنم لیتا ہے۔'' (۹۴)

ادب کسی ایک زمانے تک محدود نہیں رہتا نہ ہی وقت کی قید میں رہتا ہے بلکہ زمانوں کے اثرات لیے یہ زمانوں تک اثر انداز ہوتا رہتا ہے، ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:

''ادب کوئی جامد چیز نہیں بلکہ اس پر بھی ثبات ایک تغیر کو ہے والی بات صادق آتی ہے۔'' (۹۵)

ادب کائنات میں زندگی کا مظہر ہے اور معاشرے میں روشنی پھیلانے کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ جس طرح اخلاقیات کا کام ''اچھے'' اور ''برے''، ''خیر'' اور ''شر'' کے اوصاف کو سامنے لانا اور ان میں تمیز پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے اسی طرح ادب معاشرے میں ہونے والی تمام تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ یکسانی رویوں کی تصویریں بھی کھینچتا ہے۔ اس میں تاریخ کے اثرات بھی بیان کرتا ہے اور موجودہ صورتحال کا بیان بھی ہے اور آنے والے کل کا پتہ بھی دیتا ہے اور اسی سے سچا ادب وجود میں آتا ہے۔ بقول سارتر:

''یہ ہے سچا اور خالص ادب، داخلیت جو ایک طرح کی خارجیت کے جلو میں آئے، تقریر ایک ایسے عجیب انداز سے مرتب کہ اس پر خاموشی کا شبہ ہو۔ خیال جو اپنے آپ پر حیران ہو، عقل جو جنون کا لبادہ ہو، ابد جو یوں معلوم ہو کہ تاریخ کا ایک لمحہ ہے۔ تاریخ کا لمحہ جو اپنی راہوں سے انسان کو ابد کی طرف موڑ دے۔'' (۹۶)

ادب سے ہرگز مراد یہ نہیں ہے کہ یہ پند و نصائح کے مغلوبے کا نام ہے، اس میں تلقین و ہدایت سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ کہنا ادب کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ ادب کا کام صرف زندگی کے حقائق کو سامنے لا کر فیصلہ قارئین پر چھوڑ دینا ہے۔ سلیم احمد ''ادب اور اخلاقیات'' پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''ادب کا کام یہ نہیں ہے کہ بیان کرتا پھرے کہ جی ہاں سچ بولنا بڑی اچھی چیز ہے، بلکہ یہ اصول زندگی میں کس طرح بروئے کار آیا ہے۔ کن چیزوں سے ٹکرا کر بروئے کار آ رہا ہے، ان کو بیان کرنا ادب کا کام ہے۔'' (۹۷)

ادب بقائے کے لیے انسانی معاشرے کی ترقی کا خواہاں ہوتا ہے اور انسان کے وجود کو مقصدیت کی طرف لے کر جاتا ہے،

چنانچہ ادب کے بغیر انسان کی بقا اور نشو ونما کا تصور ناممکن نظر آتا ہے۔ بقول رام لعل:

''ایک جدید ادب کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی صحیح عکاسی کرے۔ اس کے اردگرد جو انتشار ہے، سامنے جو اندھیرا ہے اس کے اسباب اور کرداروں پر پڑنے والے نفسیاتی عمل کی نشاندہی کرے۔ اس کا معاشرہ اگر بے حسی اور لاتعلقی میں مبتلا ہے اور اسے بے حسی اور لاتعلقی (Detatchment) کو وہ ایک فکری اور فنی شاہکار بنا کر پیش بھی کرے۔'' (۹۸)

ادب کا کام انسان کو اس کے اجتماعی مسائل سے نجات دلا کر اسے اشرف المخلوقات کے اعلیٰ منصب پر فائز کروانا ہے تا کہ انسان اپنی قدر و قیمت سے آگاہ ہو کر کائنات کو تسخیر کر سکے، بقول سجاد حارث:

''بہر کیف تخلیقی فن خواہ کسی نوعیت یا جہت کا ہو، فکر وشعور کی سطح ضرور رکھتا ہے اور اس مخصوص فکر وشعور کے اظہار سے اس فن کی مقصدیت کا با آسانی تعین کیا جا سکتا ہے......اور انسانی معاشرے اور معاشرتی اقدار کی ترقی کا خواہاں ہوتا ہے۔ یہ بنی نوع انسان کے لیے اپنی کمٹ منٹ کا برملا اظہار کرتا ہے۔'' (۹۹)

ادب اور ادیب یہی چاہتے ہیں کہ وہ انسانی فلاح کے لیے اس کمٹ منٹ کو خوش اسلوبی اور سنجیدگی سے پورا کریں یعنی ادیب کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اپنے اردگرد کے ماحول کے بارے میں تاریخ کے پس منظر اور مستقبل کے آئینہ میں دیکھتے ہوئے ایسی تخلیق کو سامنے لے کر آئے کہ معاشرے میں سماجی اور اخلاقی شعور پیدا ہو سکے، ''ادیب کی ذمہ داری'' میں سارتر کہتے ہیں کہ:

''خیر ادیب، ''چاہے یا نہ چاہے'' وہ بہرصورت ایسا شخص ہوتا ہے جو نوع انسانی کے مگھم رشتوں کو محبت اور نفرت کے نام بخشتا ہے جو سماجی تعلقات کو ظلم اور رفاقت کے نام عطا کرتا ہے۔'' (۱۰۰)

ادب کی خاموشی بھی بامعنی ہوتی ہے، اس میں بھی کئی معانی نہاں ہوتے ہیں وہ فرد کی آزادی سے ہمکلام ہوتا ہے، وہ جب بات کرتا ہے تو اس کا مقصد بھی تبدیلی پیدا کرنا ہوتا ہے اور جب خاموش ہوتا ہے تو اس کا مقصد بھی تبدیلی ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر تخلیق کے اندر اس سے معنی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ مشتاق فخر لکھتے ہیں کہ:

''ہر بامعنی تخلیق (یعنی با مقصد ادب پارہ) کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا تعلق زمان و مکان کے کن دوائر سے ہے۔ لیکن اخلاقیات کے نقطہ نگاہ سے ایک بامعنی اور بامقصد تخلیق کے

لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے سماجی آدمی یا اس کے حوالے سے کائنات کی سچائیوں کے بارے میں اظہار خیال کرے پھر اخلاقی نقطہ نگاہ سے بامقصد مثبت نتائج برآمد کرنے کے لیے مثبت رویہ اختیار کرتا ہے۔''(۱۰۱)

تخلیق کار زندگی کے ہر نازک جذبے اور مشکل احساس کو تہذیب کرتا ہے۔عمدہ الفاظ کا چناؤ کر کے بیان کرتا ہے۔ ہر وہ چھپا ہوا احساس اور پیچیدہ خیال جس کو بیان کرنا اور سمجھانا عام آدمی کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ایک ادیب اس قدر نفاست سے بیان کرتا ہے کہ منفی باتوں کا بیان مثبت انداز میں اثر کرنے لگتا ہے۔ڈاکٹر احسن فاروقی کہتے ہیں کہ:

''عریاں نگاری اخلاقی نقطہ نظر سے بھی ضروری ہو جاتی ہے اول تو نفسیات کے ماہروں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بداخلاقی بلکہ مجرمانہ ذہنیت کی خاص وجہ جبلتوں کو دبانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ اسے آزادی سے ادا کر دیا جائے ادب اس سلسلے میں بڑا کام کرتا ہے۔''(۱۰۲)

موجودہ دور میں معاشرتی تبدیلیوں نے انسان کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے وہ صحیح اور غلط کی پہچان کھوتا جا رہا ہے، مذہب اس کے لیے پند و نصائح کے کٹھن راستے کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتا ہے اور وہ اس سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔حقوق و فرائض کی باتیں اسے بوجھ محسوس ہوتی ہیں۔ غیر اقوام کی ترقی یافتہ تہذیب کی چکاچوند اس کی نظروں کو خیرہ کئے ہوئے ہیں۔ ایسے میں ''ادب'' ہی یہ بوجھ اٹھا سکتا ہے کہ مایوس،شکستہ حال انسان کو خوشحالی اور خوش آئند مستقبل کی نوید دے سکے۔ جان ڈیوی کے مطابق:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دنوں معاشرتی حالات اس قدر الجھے ہوئے ہیں اور اس قدر جلدی جلدی بدل رہے ہیں کہ ان کا اثر انسان کی توجہ کو صواب اور فرض سے ہٹا دیتا ہے۔آج کل ایسا قطب نما دریافت کرنا بہت مشکل ہے، جو روش کے لیے راہ نمائی مہیا کرے۔اس لیے آج کل سچے فکر پر مبنی اور فکر انگیز خیالات کی ضرورت پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ ورنہ یا تو ہم لوگ اخلاقی لحاظ سے شتر بے مہار ہو جائیں گے اور یا ہم پر ایسے رسمی ضابطے ٹھونس دیئے جائیں گے جو محض رواج اور روایات کے باعث ہم پر پورا قابو پا چکے ہیں۔''(۱۰۳)

ادب ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے انسان اور کائنات کے اصل کو جانچا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ باطن کی حقیقتوں کو ظاہر کا روپ دیا جا سکتا ہے، اور دل کی گہرائیوں میں دبے احساسات کی ترجمانی کی جا سکتی ہے۔ادب سے ہی انسان کی

حیوانیت کو انسانیت میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تخلیقیت ہی اخلاقیات کو انسان میں ضم کر کے فرد اور معاشرے کا رشتہ استوار کر سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ''تخلیقی فکر'' میں ارنسٹ ڈمنٹ لکھتے ہیں کہ:

''تخلیق کی جڑیں خواہ فکری، فنکارانہ عمل یا کسی اور قسم کی ہوں بے شک بنیادی طور پر ایک خیال (Idea) ہے اور پھر یہ خیال آہستہ آہستہ نمو پاتا ہے اور پھر بہالے جانے والا مقصد مل جاتا ہے پھر اس کے بعد کوئی مدافعت اس کے خلاف موثر نہیں رہتی۔'' (١٠٤)

'' ادب انسان کے جذبوں کی تہذیب کر کے صحت مند معاشرے کی تشکیل کرتا ہے اور ادیب جذبوں کو مہذب انداز میں بیان کرتا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

''ادب کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہر وہ ادب پارہ جو جذبات کو مشتعل کرے جمالیاتی تسکین کا موجب نہیں ہوتا، جمالیاتی تسکین تو جذبے کی تہذیب سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ فحاشی کی حامل تحریریں اسی لیے ادب کے دائرے سے خارج ہیں کہ وہ جمالیاتی تسکین کے بجائے جنسی تسکین مہیا کرتی ہیں۔ واضح رہے کہ میں نے جذبے کی تہذیب، کہا ہے جذبے کی نفی یا اخراج نہیں کہا کیونکہ ایسی صورت میں ادب تخلیق ہو ہی نہیں سکتا۔'' (١٠٥)

ہر لکھا ہوا لفظ ادب کے زمرے میں نہیں آتا اور ہر وہ شخص جو چند حروف صفحہ کی قرطاس پر بکھیر دے ادیب نہیں کہلاتا کیونکہ معاشرے کی سوچ میں تبدیلی لانا اور مثبت تبدیلی ہی ادیب کی ذمہ داری ہے اور اس سلسلے میں ارنسٹ ڈمنٹ بیان کرتے ہیں کہ اخلاق کا تصور جتنا واضح ہوگا اتنا ہی ادب پارہ اثر پذیر ہوگا۔ مثلاً:

''وہ لکھنے والے جن کا پس منظر کسی نہ کسی طرح زیادہ اخلاقی ہو ان کے ہاں خیالات کی روانی عام فنکاروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔'' (١٠٦)

ادیب انسان کو بنیادی اخلاقی اقدار سے آگاہ کرواتا ہے اور وہ طریقہ بتاتا ہے جس سے ان اقدار کو اپنایا جا سکتا ہے۔ یہ انسان کی جدوجہد پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اپنے نصب العین کا تعین کرے اور مقاصد کے حصول کے لیے غور وفکر کر کے اعلیٰ اقدار کو اپنائے کہ صرف ایک دن اخلاقی احکام کی پیروی سے مراد اخلاقیات ہرگز نہیں ہے۔ جاوید قاضی کے مطابق:

''جہاں تک اقدار کی ماہیت کا تعلق ہے، اخلاقی حکم صرف پسند یا ناپسند کا اظہار نہیں کرتا۔ جب ہم اخلاقی مسائل پر دلائل دیتے ہیں تو ہم دوسروں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس پسند ناپسند کا

جواز موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ ہم یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فعل کی کوئی داخلی صفت موجود ہے جسے پسند یا ناپسند کیا جا سکتا ہے یا پھر خیر یا شر قرار دیا جا سکتا ہے۔'' (۱۰۷)

گویا ادیب اخلاقی احکام کو صادر نہیں کرتا بلکہ اسباب اور وجوہات بیان کرتا ہے جن کی بناء پر ہم اچھے اور برے سے دوچار ہوتے ہیں اور پھر اخلاقی اور غیر اخلاقی اقدار کے اثرات بیان کرتا ہے تا کہ انسان کے اندر خیر اور شر کی پہچان پیدا ہو سکے اور ان کے اثرات اور نتائج سے بھی باخبر ہو سکے۔

ادیب کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کے بارے اپنے خیالات کا اظہار کرے، موجودات کی بات کرے، اپنے شعور اور سمجھ بوجھ کے مطابق معاشرتی اور سماجی صورت حال پر اظہار خیال کرے کیونکہ ادیب ہی وہ شخص ہے جو انسانوں کے بکھرے ہوئے ہجوم کو ایک اکائی میں باندھ سکتا ہے کیونکہ ادیب جب بولتا ہے تو تبدیلی ضرور رونما ہوتی ہے لیکن اخلاقیات کی طرح ادب کا کام بھی راہ دکھانا ہے۔ اس لیے ادیب کا کہہ دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ بقول سارتر:

''یہ قطعی ممکن ہے کہ کوئی اس کی بات پر کان نہ دھرے، ہمیں جس چیز سے بچنا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری ذمہ داری جرم کی شکل اختیار نہ کر لے تا کہ یہ نہ ہو کہ پچاس سال بعد ہمارے متعلق یہ کہا جائے کہ:

''انہوں نے دنیا کے سب سے بڑے سانحے کو ٹوٹتے دیکھا اور منہ میں گھگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔'' (۱۰۸)

ادب اخلاقیات کی نمائندگی کرتا ہے۔ انسان کے دبے اور چھپے ہوئے احساسات سے لے کر منہ زور اور بے قابو جذبات کی تہذیب کرتا ہے۔ تا کہ ایک صحت مند معاشرے کا قیام ممکن بنا سکے۔ اشفاق احمد کے نزدیک ادب ہی انسان کو انسان کے قریب لانے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''ادب انسانوں کے درمیان انسانوں کے متعلق انسانوں کی بات کرنے کا نام ہے۔'' (۱۰۹)

اشفاق احمد نے جس عہد میں آنکھ کھولی وہ ادبی تغیرات کا دور ہے، بہت سی نئے نظریات اور ان کے اثرات معاشرے میں پنپ رہے ہیں لیکن اشفاق احمد پر کسی مخصوص سوچ، نظریے یا تحریک کا اثر دکھائی نہیں دیتا بلکہ وہ ایک سچے ادیب کی طرح اپنے اردگرد کے ماحول کا مشاہدہ حقیقت کی آنکھ سے اپنے تجربے اور مشاہدے کے زور پر کرتے ہیں اور جو ان کی سمجھ میں آتا ہے وہ قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے قومی اور بین الاقوامی وسائل اور مسائل سے پورے طور سے آگاہ تھے اور قارئین کو بھی اس سے پوری ایمانداری سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق:

''ادب کی ذمہ داری ہے کہ وہ گائیڈنس اور راہنمائی مہیا کرے۔ استفادہ کرنا نہ کرنا قارئین پر منحصر

ہے۔'' (۱۱۰)

ادیب کی یہ ذمہ داری اسی وقت صحیح معنوں میں پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے جب وہ نہایت ایمانداری سے اپنے عہد کی معاشرت اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات اور اس کے نتائج کو نہایت سنجیدگی سے بیان کرے۔ اس سلسلے میں اشفاق احمد کا کہنا ہے کہ:

''میں آپ سے ایک بات کہوں کہ جو کردار آپ کے مشاہدے میں آتے ہیں انہیں من وعن پیش کریں تو وہ بہت بھونڈے اور بیچارے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کرداروں میں اس وقت زندگی پیدا ہوتی ہے جب ادیب انہیں اپنا فلسفہ دینا چاہتا ہے۔'' (۱۱۱)

یہی وجہ ہے کہ اشفاق احمد کی تخلیقات میں اپنے عہد کی زندگی کے سبھی دکھ اور سکھ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک سچے ادیب کی طرح معاشرتی برائیوں کو بے نقاب کرتے ہیں تاکہ عوام کے اندر خود سے شعور بیدار ہو سکے اور صحیح و غلط میں فیصلہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد کے باطن میں ایک تخلیقی کہانی کار موجود تھا...... (اشفاق احمد نے غیر نظریاتی افسانے لکھے)...... بلکہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے جس انسان کو اپنے افسانوں میں چلتے پھرتے، بولتے اور سماجی واقعات پر اپنا تاثر ظاہر کرنا دکھایا۔ وہ آج کا حقیقی انسان تھا۔'' (۱۱۲)

اشفاق احمد نے بطور ادیب تمام انسانیت کو امن اور محبت کا پیغام دیا ہے۔ انسان کی وحشت سے لے کر اشرف المخلوقات کے اصل مقام تک پہنچنے کے سبھی راستے اور مقامات پر بحث کی ہے۔ اپنے عہد کے ہر طبقے، عمر، مذہب، رنگ اور نسل کے انسان کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ اپنے عہد کی معاشرتی زندگی خواہ وہ دیہی زندگی تھی یا شہری، ملکی تھی یا غیر ملکی کے سبھی رنگوں کو ہر شیڈ میں دکھایا ہے اور ان کی یہ صفت ان کو اپنے ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں اخلاقیات کا عنصر ہر جگہ موجود ہے۔ ان کے تحریر کردہ ہر لفظ کے پیچھے ان کے مشاہدے اور تجربے کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ اشفاق نے خواہ افسانے یا ڈرامے لکھے، فلم یا فیچر لکھے، ادارت کی یا صدارت کی، تلقین شاہ بنے یا زاویہ کے صوفی...... ہر روپ کے اندر ان کے ہاں ایک ایسا ادیب دکھائی دیتا ہے جو بہر صورت اس صدی کے انسان کو اس کی اپنی ذات کی اصلیت اور دنیا میں آنے کے مقصد سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ ایک ایسا ادیب جو اچھائی کے ساتھ برائی بھی دکھاتا ہے۔ خیر کے ساتھ شر کے عناصر کا اثر بھی دکھاتا ہے اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہے۔

اشفاق احمد اپنے ادیب ہونے کے فرض سے بخوبی واقف ہیں کہ بحیثیت ادیب ان کی کیا ذمہ داری ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں ایک رائٹر ہوں، میرا رول معاشرے کی غلاظتوں کی نشاندہی کرنا اور معاشرے کی گندگیوں کا تجزیہ کرنا ہے۔'' (۱۱۳)

ادب، اخلاقیات کی طرح خیر اور شر کے تضادات، معاشرے کے سامنے لے کر آتا ہے۔ نیکی اور بھلائی کے اثرات بیان کرتا ہے تا کہ عام انسان بھی زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہ ہو کر جینا سیکھ سکے اور خدا کی نعمتوں کے بارے میں جان کر شکر گزار دل کا اہل ہو سکے۔ اشفاق احمد ادیب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''پیغمبر اور گڈریے نا ماننے والوں کی ساتھ رہنے کا فن جانتے ہیں۔ نہ ماننے والوں کو تکلیف نہیں پہنچاتے، ان کو چوٹ نہیں مارتے اور ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ ادیب بھی انہی کے قدموں کے نشانوں پر چلتے ہیں۔'' (۱۱۴)

اشفاق احمد کے مطابق ادیب بھی پیغمبروں یا اولیاء کرام کے نقش پا پر چل کر انسان کو اس کے اصل مقام سے نہ صرف آگاہ کرتا ہے بلکہ کائنات کے راز بھی سمجھاتا ہے اور اسے زندگی کا مقصد بھی عطا کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے اور انسانی زندگی کی بقا اور ارتقاء ہی ادب کا خاصہ ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

''اصل چیز انسانی زندگی ہے جس کے دو واضح رخ ہیں۔ ایک رخ مزاجاً اجتماعی ہے اور دوسرا مزاجاً انفرادی، جب اجتماعی رخ مسلط ہوتا ہے تو انفرادی رخ کے نقوش مدھم پڑ جاتے ہیں اور جب انفرادی رخ اپنی قوت کا اظہار کرتا ہے تو اجتماعی رخ میں دراڑیں آنے لگتی ہیں۔'' (۱۱۵)

فرد اور معاشرے کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے کسی بھی فرد کے کردار اور شخصیت کی تعمیر میں معاشرہ اہم کردار ادا کرتا ہے اسی طرح فرد بھی مختلف صورتوں میں معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

''ہر فرد کی ذات کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک وہ جو سوسائٹی کی اقدار سے ہم آہنگ رہتا اور فرد کو ایک مثالی نمونے کی صورت سوسائٹی سے وابستہ رکھتا ہے۔ دوسرا وہ جو سوسائٹی کی اقدار سے بغاوت کرتا ہے اور فرد کو ایک کردار کے روپ میں پیش کرتا ہے۔'' (۱۱۶)

فرد اور معاشرے کے تعلق کو مثبت بنیادوں پر مضبوط بنانے کے لیے ادب اور اخلاقیات بھرپور طریقے سے کارفرما

نظر آتے ہیں۔ ایک سچا ادیب فرد اور معاشرے میں ربط قائم کرنے کے لیے تخلیقی عمل سے گزرتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں کہ:

''ادب معاشرے کے خواب کی تعبیر ہوتا ہے، خواب کتنا ہی بھیانک کیوں نہ ہو، خواب دیکھنے والا اس کی تعبیر خوشگوار چاہتا ہے۔ اجتماعی فکر کے حامی اپنے ادب میں صرف خواب ہی دہراتے ہیں اس کی تعبیر بھی تلاشتے ہیں۔ بعض اوقات یہ صداقتیں اتنی تلخ ہوتی ہیں کہ لوگ خود ان کو دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے۔ تاہم اچھا ادیب سچ بتاتا ہے اسے صلے کی پروا کب ہوتی ہے۔'' (۱۱۷)

ادب ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے ہم زندگی کے پیچیدہ مسائل کا بیان کر کے ان کا حل پیش کر سکتے ہیں کیونکہ ادب ہی انسان کی تمام ضرورتوں، مسائل اور ان سے چھٹکارے کا باعث بن سکتا ہے۔ انسان کے ہر پیچیدہ جذبے اور گنجلک خیال کو ادب سہل انداز میں نفیس اور دلپذیر طریقے سے بیان کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جس سے انسان دوستی کی فضا قائم ہوتی ہے اور معاشرے میں محبت کی فضا پنپتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں کہ:

''ادب کا پیغام محبت ہے اور محبت ہی وہ جذبہ ہے جو انسانوں میں یگانگت پیدا کرتا ہے اور اسی سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے۔ ادب انسان میں بلند ہمتی اور بلند حوصلگی پیدا کرتا ہے۔'' (۱۱۸)

ادب معاشرتی یکجہتی کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ ادب انسان کی غلاظتوں، نفرتوں اور حقیر جذبوں کو ریشم اور کتان کے کشن میں بند کر کے قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے یوں کہ قارئین اس غلاظت کو ہاتھ میں تھام کر، اس سے نرمی برت کر، اس بات کا مشاہدہ کر سکیں کہ غلاظت، قابل نفرین اور حقیر شے کا کیسے نفاست اور سلیقے سے تزکیہ کیا جا سکتا ہے اور ایک سچا ادیب اس میں مستحکم کردار ادا کرتا ہے۔

حواشی

۱۔ امولیہ رنجن مہاپتر ''فلسفہ مذاہب'' مترجم: یاسر جواد، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸ء ص۱۳

۲۔ ابصار احمد ڈاکٹر، ''فلسفہ کیا ہے؟'' مشمولہ: فلسفہ جدید کے خدوخال، خواجہ غلام صادق، پروفیسر، لاہور، ایچ وائی پرنٹرز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۷

۳۔ سی۔اے۔ فادر، ڈاکٹر ''اخلاقیات'' لاہور مجلس ترقی ادب، طبع چہارم دسمبر ۱۹۸۰ء، ص ۱۰

۴۔ محمد حبیب الرحمٰن خان شیروانی، ''اسلامی اخلاق'' لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص۲۴

۵۔ ابصار احمد، ڈاکٹر، ''فلسفہ اخلاق'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص۲۱

۶۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد اول، لاہور، مکتبہ حسن، ۱۹۷۴ء، ص ۱۲۸۔۱۲۷

۷۔ امیر مینائی، لکھنوی، ''امیر اللغات'' لاہور، مقبول اکیڈمی، حصہ اول، ۱۹۸۸ء، ص ۹۸

۸۔ عبدالمجید، نظامی ''لغات نظامی اردو'' لاہور، نظامی پریس، طبع اول، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸

۹۔ ''نسیم اللغات'' (اردو) مرتبین: سید مرتضیٰ فاضل لکھنوی، سید قاسم نسیم امروہوی، آغا محمد باقر بنیرۂ آزاد، لاہور، غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۹ء، ص ۵۸

۱۰۔ نورالحسن نیر مولوی، ''نوراللغات'' جلد اول، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۶۷

۱۱۔ ''آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری'' مرتب و مترجم: شان الحق حقی، کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۵ء، ص ۵۳۳

۱۲۔ ''قومی انگریزی اردو لغت'' مرتبہ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع ششم، ۲۰۰۶ء، ص ۲۸۹

۱۳۔ The New International Webter's Comprehensive Dictionary of English Language, Encyclopedia Edition, Trident Press International, 2004- Pg 430

۱۴۔ سید قاسم محمود، اسلامی انسائیکلوپیڈیا'' لاہور، الفیصل ناشران، س ن، ص ۱۶۲

۱۵۔ امولیہ رنجن مہاپتر (فلسفہ مذاہب'' مترجم: یاسر جواد، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴

۱۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''مغرب میں نفسیاتی تنقید'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۳۴۔۱۳۳

۱۷۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا، مرتبہ: مولوی محبوب عالم، ترتیب و تدوین: سید عاصم محمود، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، س ن، ص۵۹

۱۸۔ Derek Gregory, Ron Johnston, "The Dictionary of Human Geography" UK, Ltd. Black well Publisher, 2000, Pg 211

۱۹۔ John Scotts Gordon Marshall, "Oxford Dictionary of Sociology" USA, Oxford Press, 3ed, 2005, Pg 197

۲۰۔ William Outhwaite, Tom Bottomore "The Black Well Dictionary of Twentieth Century Social Thoughts" UK Black Well Publishers, 1993, Pg 202

۲۱۔ طاہر القادری، ڈاکٹر، ''حسن اخلاق۔ سلوک تصوف کی تربیت کی عملی ہدایات''، لاہور، منہاج القرآن پبلی کیشنز، اکتوبر ۲۰۱۰، ص۱۳

۲۲۔ واصف علی واصف، ''وضاحت'' مشمولہ: ''حرف، حرف حقیقت''، لاہور، کاشف پبلی کیشنز، ۱۹۹۴، ص۵۰

۲۳۔ جاوید اقبال ندیم ''ابن مسکویہ کا فلسفہ اخلاق اور اس امام غزالی اور دوانی پر اثر'' لاہور، معراج پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۳، ص۵۰

۲۴۔ نور الحسن خان ''غزالی کا تصور اخلاق'' لاہور، المکتبہ علیہ، س ن، ص۱۸۴

۲۵۔ یوسف شیدائی، پروفیسر، ''مطالعہ اخلاقیات'' لاہور، عزیز پبلشرز، ۱۹۸۴، ص۲۸

۲۶۔ ولیم للّی، ''تعارف اخلاقیات'' مترجم: سید محمد احمد سعید، کراچی، فضل سنز، ۱۹۸۲، ص۷

۲۷۔ بشیر احمد ڈار، ''حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق'' لاہور، مکتبہ جدید پریس، ۱۹۹۵، ص۲۵۱

۲۸۔ محمد حفیظ الرحمٰن، سیوہاری مولانا، ''اخلاق اور فلسفہ اخلاق'' لاہور، مکتبہ رحمانیہ، مارچ ۱۹۷۶، ص۲

۲۹۔ ابصار احمد، ڈاکٹر، فلسفہ اخلاق...... چند مغربی مفکرین کے نظریات، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹، ص۶۷

۳۰۔ ول ڈیورنیٹ، ''نشاط فلسفہ'' مترجم: محمد اجمل، لاہور، مکتبہ خاور، جون ۱۹۶۶، ص۱۴۹

۳۱۔ ایڈورڈ پول لیکی ''تاریخ اخلاق یورپ'' مترجم: عبدالماجد دریا آبادی، کراچی، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۶، ص۹

۳۲۔ جان ہاسپرس، ''ابتدائی فلسفہ'' مترجم: سلطان علی شیدا، ڈاکٹر، لاہور، نگارشات میاں چیمبرز، ۱۹۹۸، ص۵۵۶

۳۳۔ یوسف شیدائی ''مطالعہ اخلاقیات'' لاہور، عزیز پبلشرز، ۱۹۸۴، ص ۵۶

۳۴۔ جاوید اقبال ندیم ''شذرات فلسفہ'' لاہور، معراج پریس، اردو بازار، ۱۹۹۳، ص ۳۷

۳۵۔ مور ایڈورڈ، جارج، اصول اخلاقیات'' مترجم: عبدالقیوم، پروفیسر، لاہور مجلس ترقی ادب، طباعت دوم، جنوری ۲۰۱۱، ص ۳۵

۳۶۔ مور ایڈورڈ، جارج، ''اصول اخلاقیات'' مترجم: عبدالقیوم، پروفیسر، لاہور، مجلس ترقی ادب، جنوری ۲۰۱۱، ص ۲۷

۳۷۔ ابصار احمد، ڈاکٹر ''فلسفہ اخلاق...... چند مغربی مفکرین کی نظر میں'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹، ص ۲۹

۳۸۔ ڈی۔ ڈی۔ رافیل، ''فلسفہ اخلاق، مترجم: راشد قین، اسلام آباد، قومی اکادمی برائے اعلیٰ تعلیم، س ن، ص ۹

۳۹۔ یوسف شیدائی، پروفیسر، ''مطالعہ اخلاقیات'' لاہور، عزیز پبلشرز، ۱۹۸۴، ص ۱۸

۴۰۔ جان ہاسپرس ''ابتدائی فلسفہ'' مترجم: سلطان علی شیدا، ڈاکٹر، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۸، ص ۵۵۷

۴۱۔ غلام صادق، پروفیسر ''اخلاقیات'' مشمولہ: ''فلسفہ جدید کے خدوخال''، لاہور، نگارشات، ۱۹۸۶، ص ۱۷۶

۴۲۔ ایڈورڈ مور جارج ''اصول اخلاقیات'' مترجم: عبدالقیوم، پروفیسر، لاہور، مجلس ترقی ادب، جنوری ۲۰۱۱، ص ۴۰

۴۳۔ غلام صادق، پروفیسر، ''فلسفہ جدید کے خدوخال'' لاہور، نگارشات، ۱۹۸۶، ص ۱۷۶

۴۴۔ ڈی۔ ڈی۔ رافیل ''فلسفہ اخلاق'' مترجم: راشد متین، اسلام آباد، قومی اکادمی برائے تعلیم، س ن، ص ۱۱

۴۵۔ ڈی۔ ڈی۔ رافیل ''فلسفہ اخلاق'' مترجم: راشد متین، اسلام آباد، قومی اکادمی برائے تعلیم، س ن، ص ۱۲۔۱۱

۴۶۔ مولانا حفظ الرحمٰن مولانا سیوہاری ''اخلاق اور فلسفہ اخلاق'' لاہور، خالد مقبول پبلشرز، ۱۹۷۶، ص ۱۶

۴۷۔ محمد ذکاء اللہ، شمس العلما مولانا، ''محاسن الاخلاق، مرتبہ: محمد رضا، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵، ص ۱۵۲

۴۸۔ سی۔اے قادر، ڈاکٹر، ''کارل مارکس اور اس کی تعلیمات''، تدوین: طارق عزیز، ڈاکٹر، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، اگست ۱۹۸۸، ص ۸۳

۴۹۔ جان ڈیوی ''اخلاقی ذات'' مشمولہ ''اخلاقی زندگی کا نظریہ'' مترجم: میاں عبدالرشید، ۱۹۶۴، ص ۳۳۶۔۳۳۵

۵۰۔ جاوید اقبال ندیم ''اہل مسکویہ کا فلسفہ اخلاق اور اس کا امام غزالی اور دوانی پر اثر'' لاہور، معراج پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۳، ص ۵۰

۵۱۔ امولیہ رنجن مہاپتر ''فلسفہ مذاہب'' مترجم: یاسر جواد، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸ء ص ۱۳۹

۵۲۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، ''تعلیمی عمرانیات''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۰، ص۳۳۵۔۳۳۴

۵۳۔ سورۃ النحل پارہ ۱۴، آیت نمبر ۹۰

۵۴۔ سورۃ القصص، پارہ ۲۰، آیت نمبر ۷۷

۵۵۔ سورۃ یونس، پارہ ۱۱، آیت ۶۲

۵۶۔ Armstrong, Karen, A History of God, Great Britain, 1993, Pg415

۵۷۔ مرقس کی انجیل، ب۱۲، آیت ۳۰۔۳۱

۵۸۔ متی کی انجیل،، ب۵، آیت ۴۴

۵۹۔ متی کی انجیل،، ب۱۹، آیت ۱۹۔۱۸

۶۰۔ ا۔ کرنتھیوں کا خط، ب۱۳، آیت ا

۶۱۔ ا۔ کرنتھیوں کا خط، ب۱۳، آیت ۱۳

۶۲۔ محمد جواد مشکور، ''خلاصہ ادیان'' علی عکاس جلال پوری ''روح عصر'' لاہور، ۱۹۴۹، ص۱۵۲

۶۳۔ امولیہ رنجن مہاپتر ''فلسفہ مذاہب'' مترجم: یاسر جواد، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸، ص۱۷۵

۶۴۔ خروج، ب۲۰، آیت ۷۔۵

۶۵۔ سورۃ ۶، آیات ۷۶۔۷۵

۶۶۔ امولیہ رنجن مہاپتر ''فلسفہ مذاہب'' مترجم: یاسر جواد، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸، ص۱۵۷

۶۷۔ ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر ''تصوف اور تصورات صوفیہ'' لاہور، سیٹھی بکس، ۲۰۰۸، ص۷۰

۶۸۔ امولیہ رنجن مہاپتر ''فلسفہ مذاہب'' مترجم: یاسر جواد، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸، ص۱۸۲

۶۹۔ ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر، ''تصوف اور تصورات صوفیہ'' لاہور، سیٹھی بکس، ۲۰۰۸، ص۷۱

۷۱۔ امولیہ رنجن مہاپتر ''فلسفہ مذاہب'' مترجم: یاسر جواد، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۸، ص۲۰۰

۷۲۔ رحمت اللہ سبحانی، لودیانوی، مولانا، ''مخزن اخلاق'' لاہور، مکتبہ ملیہ، ۱۹۶۶، ص۵۱۳

۷۳۔ جیمز اے میچز ''پاکستان'' مشمولہ محمد عثمان، پروفیسر ''اسلام پاکستان میں'' لاہور، ادارہ تحقیقات پاکستان، ۱۹۵۴، ص۲۸۴

۷۴۔ علی عباس جلالپوری، ''اصلاح مذاہب قدیم'' مشمولہ ''روح عصر'' لاہور، تخلیقات، ۱۹۹۹، ص۶۹

۷۵۔ سی۔اے قادر، ڈاکٹر، ''اخلاقیات''، تدوین: طارق عزیز، ڈاکٹر، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، اگست ۱۹۸۸، ص ۲۲۵

۷۶۔ خواجہ غلام صادق، پروفیسر ''اخلاقیات'' مشمولہ ''فلسفہ جدید کے خدوخال'' لاہور، نگارشات، ۱۹۸۶، ص ۱۶۱

۷۷۔ محمد حفیظ الرحمٰن سوہارویؒ، مولانا ''اخلاق اور فلسفہ اخلاق''، لاہور، خالد مقبول پبلشرز، مارچ ۱۹۷۶، ص ۷

۷۸۔ ابصار احمد، ڈاکٹر، فلسفہ اخلاق کیا ہے'' مشمولہ ''فلسفہ اخلاق چند مغربی مفکرین کے نظریات، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹، ص ۲۱

۷۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''ڈاکٹر وزیر اغا کے تنقیدی مضامین، مرتبہ: سید سجاد نقوی، لاہور مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۵، ص ۲۲۶

۸۰۔ امولیہ رنجن مہاپتر ''فلسفہ مذاہب'' مترجم: یاسر جواد، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۸، ص ۱۸۸

۸۱۔ متی کی انجیل، ب ۵، آیت ۱۶۔۱۳

۸۲۔ مظفر حسن ملک، ڈاکٹر ''تعلیمی عمرانیات'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۰، ص ۳۳۵۔۳۳۴

۸۳۔ پ۱۳، سورۃ رعد ۲۲

۸۴۔ بحوالہ عالم فقری، علامہ، ''اسلامی اخلاق'' لاہور، ادارہ پیغام القران، سن ندارد، ص ا

۸۵۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، دانش گاہ پنجاب، جلد دوم، ۱۹۶۲، ص ۱۸۸

۸۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''ڈاکٹر وزیر اغا کے تنقیدی مضامین، مرتبہ: سید سجاد نقوی، لاہور مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۵، ص ۲۲۱۔۲۲۲

۸۷۔ ول ٹیورنیٹ، ''نشاط فلسفہ'' مترجم: محمد اجمل، لاہور، مکتبہ خاور، چوک مینار، جون ۱۹۶۶، ص ۱۴۸

۸۸۔ اشفاق احمد ''ٹی وی ماہنامہ......جنوری ۸۵ء'' مشمولہ ''عرض مصنف، لاہور، سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۶، ص ۳۹۰

۸۹۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''ادب اور اخلاقیات'' مشمولہ ''ڈاکٹر وزیر کے تنقیدی مضامین'' مرتب: سجاد نقوی، سید، لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۹۵، ص ۲۳۱

۹۰۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر ''فلسفہ حسن'' لاہور، مجلس ترقی ادب، جنوری ۱۹۸۴، ص ۲۱

۹۱۔ آزاد کوثری، ''نئے افسانے کی سماجی بنیادیں'' لاہور، الخیر پرنٹرز، جون ۱۹۹۱، ص ۱۰

۹۲۔ افتخار شیخ ''آئینہ کیوں نہ دوں'' مشمولہ ''پاکستانی ادب کا منظر نامہ'' از حفیظ الرحمٰن خان، لاہور، حاجی پرنٹرز، ۲۰۰۶، ص ۱۶۳

۹۳۔ آزاد کوثری، ''نئے افسانے کی سماجی بنیادیں'' لاہور، الخیر پرنٹرز، جون ۱۹۹۱، ص ۲۲

۹۴۔ عارف ثاقب ''بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس'' لاہور، اظہار سنز پرنٹرز، ۱۹۹۹، ص ۶۲

۹۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر''افسانہ۔حقیقت سے علامت تک'' لاہور، اظہار سنز پرنٹرز، ۲۰۱۰،ص ۷۹

۹۶۔ ژاں پال سارتر، ''ادب کیا ہے'' مترجم: لئیق بابری مشمولہ ادب، فلسفہ اور وجودیت ژاں پال کی نظر میں، مرتبین شیما مجید، نعیم حسن، لاہور نگارشات، ۱۹۹۲،ص ۷۹

۹۷۔ بحوالہ ''ادبی مذاکرے'' مرتبہ شیما مجید، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۸۹،ص ۲۱۰

۹۸۔ رام لعل، ''اردو ہندی کہانی کے مشترکہ رجحانات اور مسائل'' مشمولہ: اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا'' نئی دہلی، نریندر ناتھ سوز، ۱۹۸۵،ص ۶۱۰

۹۹۔ سجاد حارث، ''جدیدیت: ریڈیکل جدیدیت'' مشمولہ: ادب اور حدیث، لاہور، شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۸،ص ۲۵

۱۰۰۔ ژاں پال سارتر، ''ادیب کی ذمہ داری'' مترجم: انتظار حسین، مشمولہ: ''ادب، فلسفہ اور وجودیت۔ ژاں، پال، سارتر کی نظر میں، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۲،ص ۹۱

۱۰۱۔ مشتاق قمر، ''اخلاقی نظریہ تنقید''، مشمولہ: سرسیدین: ''پاکستانی ادب'' راولپنڈی، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، ۱۹۸۲،ص ۱

۱۰۲۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر''ادب اور عریانی'' مطبوعہ ''طلوع افکار، کراچی، ادب و جنس نمبر، دسمبر ۱۹۷۵،ص ۲۷

۱۰۳۔ جان ڈیوی، ''صواب، فرض اور وفا شعاری'' مشمولہ: اخلاقی زندگی کا نظریہ'' ترجمہ: میاں عبدالرشید، ۱۹۶۴،ص ۱۸۲۔۱۸۳

۱۰۴۔ ارنسٹ ڈمنٹ Ernest Dimnet، ''تخلیقی فکر'' مشمولہ: ''تخلیقی رویے'' مترجم: شہزاد احمد، بار اول، مارچ ۱۹۸۶،ص ۱۸۹

۱۰۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''ادب اور اخلاقیات'' مشمولہ ''ڈاکٹر وزیر کے تنقیدی مضامین'' مرتب: سجاد نقوی، سید، لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۹۵،ص ۲۳۲

۱۰۶۔ ارنسٹ ڈمنٹ Ernest Dimnet، ''تخلیقی فکر'' مشمولہ: ''تخلیقی رویے'' مترجم: شہزاد احمد، مارچ ۱۹۸۶،ص ۱۸۹

۱۰۷۔ جاوید قاضی ''پاکستان میں فلسفیانہ رجحانات'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳،ص ۳۶

۱۰۸۔ ژاں پال سارتر، ''ادیب کی ذمہ داری'' مشمولہ: ''ادب، فلسفہ اور وجودیت'' مترجم انتظار حسین، مرتبین: شیما مجید، نعیم حسن، لاہور بک پرنٹرز، ۱۹۹۲،ص ۱۱۲

۱۰۹۔ اشفاق احمد ''عرض مصنف'' لاہور، سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۰،ص ۴۳۱

۱۱۰۔ مکالمہ سہیل وڑائچ ،مشمولہ: ''باتوں سے خوشبو آئے'' مرتبہ: محمد نواز کھرل، لاہور، زاویہ پبلشرز،۲۰۰۴،ص ۳۲

۱۱۱۔ بحوالہ طاہر مسعود: ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے''، کراچی، مکتبہ تخلیق ادب، ۱۹۸۵،ص ۲۰۸

۱۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر ''افسانہ نگار اشفاق احمد کے لیے تعزیت'' مشمولہ: ادب لطیف، لاہور،۲۰۰۴، جلد ۷، شمارہ ۱۵،ص ۲۹۴

۱۱۳۔ اشفاق احمد، ''بابا صاحبا'' لاہور، سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۸،ص ۳۷۶

۱۱۴۔ اشفاق احمد ''پاکستان اور پاکستانی ادب'' مشمولہ: عرض مصنف، لاہور، سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۶،ص ۷۸

۱۱۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''تخلیقی عمل'' سرگودھا، مکتبہ اردو زبان، اکتوبر ۱۹۷۰،ص ۲۴

۱۱۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر ''اردو شاعری کا مزاج'' لاہور، مکتبہ عالیہ، ایبک روڈ، ۱۹۷۸،ص ۳۲۔۳۱

۱۱۷۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر ''اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات'' اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۰،ص ۲۰۶

۱۱۸۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر ''اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات'' اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۰،ص ۲۳۔۲۲

باب سوم

اشفاق احمد کے عمومی اخلاقی تصورات

ا۔ اشفاق احمد کے اخلاقی تصورات

ب۔ مذہب

ج۔ تصوف

د۔ معاشرت

ہ۔ معیشت

و۔ انفرادی اخلاقیات

ا۔ اشفاق احمد کے اخلاقی تصورات

اشفاق احمد کے ہاں ادب اور اخلاقیات کا سنگم ان کی تحریر وتقریر کا خاص جوہر ہے۔ ان کا تخلیقی جوہر خواہ کسی بھی نوعیت کا ہو فکر وشعور کی ایک ایسی سمت ضرور رکھتا ہے جو بنی نوع انسان کو بقاء کی جانب رواں رکھتا ہے۔ اشفاق احمد فرد اور معاشرے کے تعلق کو استوار رکھنے کے لیے فرد کی انفرادی اور اجتماعی نشوونما کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ ان کے پیش نظر عظیم فلاحی مقصد ہے۔ وہ معاشرتی اقدار کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ اخلاقی اقدار کا فروغ ان کا بنیادی مقصد ہے وہ انسان کو مصائب وآلام سے نجات دلا کر تسخیر کائنات کی جانب گامزن کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد واعظ، تلقین یا نصائح نہیں بلکہ وہ انسانی زندگی سے دوستی کا تعلق قائم کر کے، اس کی خرابیوں اور نقائص کی نشاندہی کر کے، دوستانہ طریقے سے اس کے خاتمے کی تدابیر سبک انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری خود بخود برائی سے نفرت اور نیکی سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔

اشفاق احمد کے عمومی اخلاقی تصورات کا مقصد بھی انسانیت کی خدمت ہے۔ آسانیاں فراہم کرنے اور تقسیم کرنے کا درس ہے۔ وہ انسان کو تفہیم کائنات کا شعور دینے کے لیے بے تکان، بے شمار اور ان گنت اصلاحی لفظ، جملے اور باتیں کہتے اور لکھتے چلے جاتے ہیں۔ تا کہ ایسا معاشرہ وجود میں آسکے جہاں انسان اپنے اصل درجات سے واقف ہو سکیں اور ایسی فضا میں سانس لے سکے جہاں انسان اور خدا کے درمیان کوئی دیوار قائم نہ رہ سکے۔

اردو ادب میں فرد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بے شمار موضوعات دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ادیب ماضی کی یادوں کو ہمسفر بنا کر چلتے ہیں اور کچھ اچھے مستقبل کے خوابوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتے نظر آتے ہیں لیکن اشفاق احمد موجودہ حالات کو اپنی تحریروں میں پروتے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ادیب پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میرے خیال میں ادیب کا فرض ہے کہ وہ حقائق بیان کرے اور جو کیفیات اس پر گزریں خواہ ان کا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے وہ بیان کر دے۔ برے سے برے حالات میں بھی حقیقت کا دامن نہ چھوڑے۔''(۱)

اشفاق احمد اپنی تحریروں میں ادبی فرض کو نبھاتے ہوئے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ فلاح انسانیت ان کی تحریروں میں مقدم نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں عالم حسین ''اداس داستان سرائے'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اشفاق احمد عوامی مصلح کی حیثیت کے حامل تھے، ہر لمحہ لوگوں کو ترقی کی طرف گامزن رہنے کا سبق دینے

کی بجائے احساس انسانیت کا درس دیتے تھے۔'' (۲)

اشفاق احمد کو اپنی زمین اور لوگوں سے محبت ہے اور ان کی اصلاح اور بھلائی ان کا مقصد ہے۔ انہیں اپنی تہذیب، روایات اور کلچر سے محبت ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ لوگ بھی اپنے کلچر سے محبت کریں اور اس پر فخر بھی کریں۔ ترقی یافتہ اقوام کی مثالیں دے کر اپنے لوگوں کو اپنی تہذیب سے محبت کی جانب راغب کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

''وہ اپنی تہذیب اور کلچر کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ انہیں اپنے کلچر اور رہن سہن پر ذرا بھی شرمندگی نہیں ہے کیونکہ ان کا تو طرہ امتیاز ہی یہ ہے محض یہ نہیں کہ وہ ہوائی جہاز اور گاڑیاں وغیرہ بنا لیتے ہیں۔'' (۳)

اشفاق احمد محض شہری زندگی کے نشیب و فراز کو ہی بیان کرتے بلکہ دیہاتی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بھی دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کے دلوں پر گہرے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں اور ڈراموں میں بھی فرد اور معاشرے کے باہمی رابطے کی بات عمومی طور پر دکھائی دیتی ہے جسے وہ خصوصی آہنگ میں بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر آغا سہیل لکھتے ہیں کہ:

''انہیں کہانی کہنے اور سنانے کا ڈھنگ آتا ہے اور انسان کی اجتماعی سائیکی سے انہوں نے قریبی رابطہ قائم کر لیا تھا۔ نیز جدید نفسیات کے نظریات کے رموز و نکات پر ان کی نظر تھی۔ ان کے افسانوں اور ڈراموں کے کرداروں کا مطالعہ کیجیے تو افراد اور معاشرہ کے باہمی نظریاتی تصادم اور چپقلش سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بعض پیش یا افتادہ مسائل کی گتھیوں پر ان کی نظر ہے۔'' (۴)

اشفاق احمد نے نہ صرف افسانوں اور ڈراموں بلکہ اپنے ہر انداز میں انسانیت کی بھلائی کا رنگ نمایاں رکھا۔ ان کے پیش نظر عوام کو خیر و شر میں امتیاز کروا کر نیکی کی جانب راغب کرنا تھا۔ پھر چاہے وہ افسانہ، ڈرامہ، تلقین شاہ یا زاویہ میں تھا وہ ہر صورت معاشرتی اصلاح پر کمر بستہ ہے اور ان کا مقصد اصلاح احوال تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

''تلقین شاہ کا مطمع نظر معاشرے کی ناہمواریوں کو نشان زدہ کر کے اور پھر انہیں نشانہ تمسخر بنا کر اصلاح احوال کا اہتمام کرنا تھا لیکن باباجی کا مسلک تلقین شاہ سے مختلف بھی تھا اور برتر بھی۔ بے شک باباجی کے ہاں داستان گو کا مخصوص انداز اور اصلاح احوال کا جذبہ بدستور موجود رہا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں مظاہر کو بلندی پر سے دیکھنے کا وہ انداز بھی ابھرا جس نے صوفیانہ دانش کے فروغ کے لیے

راستے ہموار کر دیئے۔'' (۵)

اشفاق نے عوام تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ہر ذریعے کو استعمال کیا اور ان کے ابتدائی سفر سے لے کر علم و ادب کی چوٹیوں کو سر کرنے تک کے سفر میں کہیں بھی عام آدمی سے رشتہ نہیں ٹوٹتا دکھائی دیتا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر طاہر مسعود لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد کو قدرت نے قلم اور گویائی دونوں کا بے مثال ملکہ عطا کیا تھا اور اپنی ان دونوں صلاحیتوں کو انہوں نے مخلوق خدا کے دکھوں کی عکاسی اور ان کی رہنمائی میں کھپا دیا لکھ پڑھ کر اور ادیب و دانشور بن کر عام قاعدے کے مطابق ان کا رشتہ و رابطہ اپنے دیہاتی اور گنوار عوام سے منقطع نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس وہ ساری زندگی ان ہی کے احساسات و مشاہدات کی ترجمانی کرتے رہے بلکہ میں یہاں تک کہوں گا کہ وہ ناخواندہ، اجڈ، اور ناقابل التفات طبقے کو گلیمرائز کرتے رہے اور اپنے سننے والوں کو مجبور کرتے رہے کہ وہ اس طبقے کو تعظیم دیں۔ ایسی انوکھی بات کسی اور دانشور میں دیکھنے میں نہ آئی۔ اس لحاظ سے وہ بڑے متقی تھے۔'' (۶)

اشفاق احمد کو اپنے لوگوں سے محبت ہے، وہ اپنی روایات کو آنے والی نسلوں تک منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریر و تقریر میں ہمیشہ اپنی تہذیب اور کلچر کو فوقیت دی ہے۔ وہ معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کر کے ان کو جڑ سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں کہ:

''تاہم اشفاق احمد سماجی امتیازات، عدم مساوات، ناانصافی اور ریا کاری کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو اسی لیے کہ یہ کسی فرد کی روح کو مسخ کر دیتے ہیں۔'' (۷)

اشفاق احمد ایک سچے ادیب کے فرائض سے بخوبی واقف ہیں وہ انسانوں کی اخلاقی تربیت کو اپنا مقصد گردانتے ہیں۔ ایک سچے ادیب میں جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ اس پر پورا اترتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں وہ تمام تر عناصر موجود ہیں جو کسی بھی تخلیق کار کی پہچان ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا تخلیق کار اور قارئین کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ:

''تخلیق کار وہ شخص ہے جو اپنی ذات میں غوطہ لگا کر ایک نایاب جوہر خلق کرتا ہے اور پھر اسے اپنی تربیت کے مطابق بناتا اور سنوارتا ہے جب کہ باہر کا قاری وہ جوہری ہے جو اس کے اصلی یا نقلی ہونے کے

بارے میں فیصلہ دیتا ہے۔'' (۸)

اشفاق احمد فرد کا رشتہ نہ صرف معاشرے سے بلکہ اس اپنی ذات سے بھی جوڑتے دکھائی دیتے ہیں اور اپنی ذات کے اندر سے جو جوہر تلاش کرتے ہیں اس کا رشتہ بیک وقت ظاہر و باطن سے باطن سے باطن تک سفر پر محیط ہو جاتا ہے اس سلسلے میں سیدہ طیبہ رباب لکھتی ہیں کہ:

''اشفاق احمد نے اردو ادب کے دونوں معروف رویوں سے ہٹ کر اپنی طرز ایجاد کی ہے اور یہ طرز انسان کی وہ بنیادی ضرورت ہے جو روٹی، کپڑا، مکان، جذباتی مسائل اور معاشرتی مسائل سے اہم تر ہے اور وہ ہے انسان کی اپنی تلاش، اس کی اپنی نگہداشت۔ اس کے باطن کے حالات، باطن کے سفر میں اس کا روح سے رابطہ ہے اس سفر کی ابتدا ذات اور انتہا خدا ہے۔'' (۹)

اشفاق احمد کے ہاں انسان کی اپنی ذات سے پہچان کا سفر خدا تعالیٰ کی شناخت پر ختم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو انسان کی فلاح و بھلائی کے لیے خلق کیا ہے اور ایک ادیب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی معاشرت اور سماجی ذمہ داریوں سے مکمل آگاہی رکھتا ہو۔ اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ:

''ادیب کے باشعور ہونے کا مطلب ہے اپنی انسانی اور وطنی اور سماجی ذمہ داریوں سے آگاہ ہونا اور اپنی تخلیقات میں اس شعور کی وہ رو چلانا جو نعرے مارنے کی بجائے ذہن اور احساس میں سرگوشی سی کریں اور یہ سرگوشی موضوع و ہئیت کے معاملے میں اتنی دلآویز ہو کہ قاری یا سامع کا لاشعور بھی اسے کان دھر کر سنے اور متاثر ہو کر ادب و فن کرداریوں بدلتے ہیں اور ذہنیتیں یوں سنورتی ہیں:

؎ لمحہ بھر تو لبھا جاتے ہیں نعرے   لیکن ہم تو اے اہلِ وطن، دردِ وطن مانگتے ہیں (۱۰)

قارئین اور سامعین کے شعور اور لاشعور تک دسترس حاصل کرنے کے لیے ان سے دوستی کرنا ضروری ہے ان کے خوشی اور غم کا ادراک ہونا ضروری ہے بہ صورت دیگر ایسا ادب تخلیق نہیں ہو سکے گا جو انسان کا رشتہ خود اس کی اپنی ذات، معاشرے اور ادب کائنات کے ساتھ جوڑ سکے۔ ''اردو نثر کے میلانات'' میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے بیان کرتے ہیں کہ:

''سید صاحب کی رائے کے مطابق انسان دوستی کی اقدار ادب کے لیے ضروری ہیں۔ وہ ادب کی دونوں

سطحوں (روحانی اور ذہنی) کے قائل ہیں۔ اس لحاظ سے وہ جذبے کی سچائی اور انسان دوستی کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور روحانی کیفیت کے وجود کو بھی تسلیم کرتے۔ فرد کے ساتھ وہ ادب کے سماجی پہلوؤں کو بھی اہم گردانتے ہیں۔ چنانچہ انسانیاتی اور سماجی پہلو کا مطالعہ ان کے نزدیک ادب کا اہم فریضہ ہے۔''(۱۱)

اشفاق احمد کے ہاں ہمیں یہ سارے موضوعات نظر آتے ہیں، وہ انسان کے انفرادی نشو ونما زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کے فروغ کے لیے بھی کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد کے ہاں اجتماعی معاشرت کا گہرا مشاہدہ جلوہ گر ہے۔''(۱۲)

ادب کا رشتہ انسانی زندگی کے ساتھ جس قدر موثر ہوگا اسی قدر معاشرہ پر بہتر طریقے سے اثر انداز ہوگا کیونکہ یہ محض لفظوں کی صوتی یا صوری صورت کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی کا مظہر ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں کہ:

''عام طور پر صرف وصوت کے ذریعے زندگی کے مشاہدات و تجربات کے موثر وخوبصورت تخلیقی اظہار کو ادب کا نام دیا گیا ہے اور یہ جس قدر فرد کی ذات او داخلیت سے ہم رشتہ ہوگا اسی قدر دل آویز و کارگر ہو گا۔ ادب کا مظہر نثر بھی ہوسکتی ہے نظم بھی لیکن اس کا رشتہ زندگی کی تاویل وتعبیر اور ترجمانی وتفسیر کے ساتھ ساتھ انسان کے ارتعاش جذبات سے ہر حال میں جڑا رہنا چاہیے۔ فرد اور معاشرہ چونکہ دونوں زندگی کے مظہر ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں اس لیے مختصراً اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ لفظوں کے ذریعے زندگی کے تخلیقی روپ کا نام ادب ہے۔''(۱۳)

اشفاق احمد فرد اور معاشرے میں رابطہ پیدا کرنے میں ماہر نظر آتے ہیں۔ وہ معاشرت کے اصل تصور سے کما حقہ واقف ہیں اور انسانی نفسیات کا باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ لفظوں کا محض استعمال نہیں کرتے بلکہ ان کے اثرات پر ان کی نظر ہوتی ہے۔ یوں وہ ایک سچے ادیب ہیں۔ ممتاز مفتی ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد ایک پرفیکشنسٹ ہے، وہ جو کام بھی کرتا ہے اس کے اندر دھنس جاتا ہے۔ اس قدر دھنس جاتا ہے کہ لت پت ہوئے بغیر باہر نہیں نکلتا۔''(۱۴)

اشفاق احمد اپنی تحریر کے سحر سے نہ صرف پڑھنے والوں کو مسحور کرتے ہیں بلکہ اس کے دوررس اثرات بھی چھوڑتے ہیں۔ ان کی گفتگو اور کہانیاں لکھنے کا انداز، خواہ وہ کہانی ڈرامے، افسانے یا ناول یا سفر نامے کا حصہ ہو پڑھنے والے کو بہا لے

جاتی ہے میرزا ادیب ان کے افسانے کی تکنیک پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق واقعات کی ترتیب و تدوین پر بڑی چابکدستی سے کام لیتے ہیں، قاری کو اپنے ساتھ ساتھ افسانے کے انجام تک اسی طرح لے جاتے ہیں کہ وہ ایک لمحے کو بھی نہیں رکتا۔'' (۱۵)

اشفاق احمد ایسا ادب تخلیق کرتے ہیں جس کا مقصد خیر اور شر کے امتیاز کو نہ صرف واضح کرنا ہے بلکہ اخلاقی رویوں کو رواج دینا بھی ہے۔ ادب اور اخلاقیات کے اس پہلو کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں کہ:

''ادب اور اخلاقیات اور ادب میں اخلاقیات ایک نہیں دو الگ الگ موضوع ہیں۔ ادب اور اخلاقیات کے معنی یہ ہوں گے کہ کوئی ادب کسی معین نظام اخلاق کا مبلغ ہے لیکن ادب میں اخلاقیات کے معنی یہ ہوں گے کہ کسی ادب کا نصب العین یا اس کا مزاج کسی حد تک اخلاقی ہے۔ یہاں اخلاقی سے مراد یہ ہو گی کہ ادیب کے مدنظر نیکی یا خیر کو بالعموم ابھارنا یا اس کے مقابلے میں علی العموم شر کی خدمت اور حوصلہ شکنی ہے پہلی صورت خصوصی ہے اور دوسری صورت عمومی۔'' (۱۶)

اشفاق احمد اپنی ہر تحریر و تقریر کے ہر آہنگ میں شر کی مذمت اور خیر کی نشو و نما کے لیے مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔ اشفاق احمد انسانی زندگی سے گہرے طور پر منسلک نظر آتے ہیں۔ معاشرتی زندگی پر ان کی گہری نظر ہے اور انفرادی زندگی کو وہ نظر انداز کرنے پر تیار نہیں ہے۔ ان کا رشتہ عام آدمی سے لے کر حکمران تک سے استوار ہے، ان کے بارے میں ڈاکٹر شاہین مفتی لکھتے ہیں کہ:

''ایک ایسا صاحب حال تھا جس کی تعلیم میں ہر طرح کا کوڑا کرکٹ اور گدڑ پھوس بھرا ہوتا ہے۔ کثافت سے نظامت پیدا کرنے کا یہ تجربہ اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔'' (۱۷)

اشفاق احمد ایسی سچی اور کھری زندگی کی حقیقتیں بیان کرتے ہیں کہ اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بظاہر ان کی باتوں سے اختلاف کرنے والے لوگ بھی ان کی باتوں کی ہدایت سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جو کچھ بھی بیان کرتے ہیں وہ ہمیں اپنے اردگرد ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں کہ:

''ان کی باتوں سے جزوی اختلاف تو ممکن تھا مگر بنیادی اختلاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً اگر وہ کہتے تھے کہ پاکستان کو پڑھے لکھے لوگوں نے برباد کیا تو اس میں کون سی غلط بات تھی، اس کی معاشی پالیسیاں،

داخلہ پالیسیاں اور خارجہ پالیسیاں آکسفورڈ اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے ''ٹیکنو کریٹس'' ہی بناتے رہے کسی نتھو خیرے نے تو یہ پالیسیاں نہیں بنائیں یا اگر وہ کہتے تھے کہ کاشتکار، ترکھان اور لوہار، موچی کو ان پڑھ نہ کہو کیونکہ اپنے شعبے میں ان کا علم کسی پی ایچ ڈی سے کم نہیں ہے۔ تو اس میں اختلاف کی کہاں گنجائش تھی۔'' (۱۸)

اشفاق احمد عام آدمی کے پاس جاتے ہیں اس کے ساتھ رہتے ہیں، اس کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کو بیان بھی کر دیتے ہیں۔ انسانی زندگی کے مسائل کی نہ صرف نشاندہی کرتے ہیں بلکہ اس کا آخری حل بھی بیان کرتے ہیں۔ ''ملاقاتیں'' میں انتظار حسین لکھتے ہیں کہ:

''بات یہ ہے کہ اشفاق احمد تصوف کی بہت باتیں کرتے ہیں...... اے غافل انسان تو دانش سے پیوستہ رہ ورنہ ایسا گرے گا کہ پاش پاش ہو جائے گا...... بلی کا بچہ ماں کو پہچانتا نہیں اس سے بے تعلق ہو کر کوئی بھی چیز نظر آ جائے تو اس سے کھیلنے لگتا ہے مگر جب بھوک لگتی ہے یا کوئی افتاد پڑتی ہے تو میاؤں کرتا ہے۔ ماں فوراً اس کی پکار سنتی ہے اور دوڑی آتی ہے۔ غافل انسان بھی اسی طرح مصیبت پڑنے پر میاؤں کرتا ہے اور خدا کو یاد کرتا ہے۔'' (۱۹)

اشفاق احمد کے ہاں ہمیں انسانی زندگی کے عمومی و خصوصی، روحانی و زمینی بھی موضوعات نظر آتے ہیں۔ تصوف، مذہب، معاشرت، معیشت اور شعبہ ہائے زندگی کے مختلف اوقات میں انسانی زندگی سے جڑے خیر و شر کے سعی تصورات اور انسان کے ذہن و دل کو چھوتے احساسات تمام رنگ دکھائی دیں گے، اور اس کا مقصد انسانوں کے باہمی تعلقات کو بہتر بنانا ہے کیونکہ اس کے بغیر صحت مند معاشرہ کی تشکیل ممکن ہے۔ اس بارے میں پروفیسر حمید احمد خان لکھتے ہیں کہ:

''اگر آپ غور فرمائیں تو تسلیم کریں گے کہ ہر معاشرے کی بنیاد انسانوں کی باہمی خیر سگالی اور احترام کے جذبے پر رکھی جاتی ہے۔ حاکم و محکوم، پیر و مرید، استاد و شاگرد، گاہک اور دکاندار سعی کے تعلقات بجز دو طرفہ رواداری قائم نہیں رہ سکتے۔'' (۲۰)

اشفاق احمد معاشرتی بھلائی کے لیے ہی اخلاقیات اور ادب سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی تعلیم ان کے ادب پاروں میں چاندی کے اوراق میں لپٹی نظر آتی ہیں۔

ب۔ مذہب

اشفاق احمد کے ہاں مذہب کا تصور واضح طور پر موجود ہے۔ ان کے خیال میں مذہب کا مقصد ہی انسانوں کو حقیقت سے روشناس کروانا ہے۔ اشفاق احمد نہ صرف مذہب اسلام بلکہ تمام مذاہب کی عزت دل سے کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں:

''اشفاق احمد تمام مذاہب کا دل سے احترام کرتے تھے بہت سے مذاہب کے بانیوں کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ قرآن میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں سے چند ایک کا ذکر ہے چنانچہ ممکن ہے یہ ہستیاں بھی اللہ کی فرستادہ ہوں ان کے پیروکاروں نے ان کی تعلیمات کی شکل مسخ کر دی ہو۔'' (۲۱)

اشفاق احمد کے نزدیک مذاہب انسانوں کے لیے ہی دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ انسانوں میں اتفاق، محبت اور باہمی یگانگت کے لیے مذاہب اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اشفاق احمد 'بابا صاحبا' میں لکھتے ہیں کہ:

''مخلوق خدا سے دور رہنا رہبانیت ہے۔ مخلوق خدا کے اندر اللہ کے لیے رہنا یہ پاکی ہے اور دین ہے۔'' (۲۲)

اشفاق احمد کے نزدیک مذہب میں کوئی سوال، جواب یا تجسس نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان کی زندگی کو مبہوت دیکھتا رہتا ہے یعنی مذہب علم پر یقین نہیں رکھتا، نہ ہی مذہبی احکامات پر سوال کرنا چاہے۔ اشفاق احمد ''سائنس، مذہب اور کھوج، زاویہ۔۳'' میں لکھتے ہیں کہ:

''مذہب علم پر یقین نہیں رکھتا۔ تمام مذاہب معصومیت پر یقین رکھتے ہیں اور انسانوں کو معصومیت کی راہ سے پاکیزگی عطا کرتے ہیں۔ مذاہب کے رہنما اور پیغمبران ہمیشہ امی ہوتے ہیں اور معصوم ہوتے ہیں اور وہ معصومیت کے ذریعے پاکیزگی عطا کرتے ہیں۔'' (۲۳)

اشفاق احمد نے مذہب اور اسلام کے فرق کو واضح کیا ہے اور مذہب کے مقاصد کا تعین بھی کیا ہے۔ مذہب انسان دوستی کا درس دیتا ہے۔ انسانیت کی فلاح اس کا مقصد ہے نہ کہ مذہب کے نام پر قتل و غارت کی جائے۔ اشفاق احمد ''رائٹ ہاؤس۔ زاویہ۔۳'' میں لکھتے ہیں کہ:

''چونکہ میری زیادہ Study مذہب پر ہوتی ہے...... جب بندے ہی مار دیتے تو پھر کیسا مذہب سیکھنا اور کن کو مذہب سکھانا۔'' (۲۴)

مذہب کا مقصد انسانی بقا ہے فنا نہیں۔ اسی طرح اسلام بھی انسانوں سے محبت کا درس دیتا ہے۔ اہل کتاب کا دل سے احترام کرتا ہے۔ اشفاق احمد کے ڈرامے ''سردی اور سارو'' میں جب مسلمان باس اپنی کرسچین اسسٹنٹ مس نینا کے ساتھ خلوص سے پیش آتا ہے اور وہ اس سے اس مہربانی کی وجہ پوچھتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ:

''تم ایسے فرقے سے تعلق رکھتی ہو مس نینا جس کے مجھ پر اور میری ساری قوم پر بڑے احسان ہیں اور ہم لوگ احسان فاموش نہیں ہیں بی بی...... آج سے کئی سو سال پہلے نینا...... تیرہ چودہ سو سال پہلے۔ تمہارے ایک مذہب، ایک ہم مسلک، ایک برادران سینتھ نے ہمارے بڑوں کی مدد کی تھی......'' (۲۵)

اسلام ایسا مذہب ہے جو اپنے باپ دادا پر کیے گئے احسانات کا قرض بھی چکانا جانتا ہے اور اس سلسلے میں کسی بھی معاشرتی دباؤ کا شکار نہیں ہوتے۔ اشفاق احمد کے نزدیک بعض لوگ مذہب کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ان کے ڈرامے ''ناتے دار'' کا مجاہد نبیلہ جیسی صاف گو اور ایمان دار لڑکی سے شادی کرنے کا سوچ کر گھبرا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تمہاری جیسی صاف گو، صاف ستھرے خیالات کی مالک، صاف ستھری لڑکی کے لیے ایک معمولی بینکر کا ساتھ کیسا رہے گا! میرے گھر والے بڑے ریاکار، جھوٹے، چھوٹی چھوٹی بات کا بتنگڑ بنانے والے، قرآن اور حدیث کو اپنے فائدے کے لیے "Quote" کرنے والے مطلبی سے لوگ ہیں۔'' (۲۶)

اشفاق احمد کے نزدیک مذہب سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بلا چون و چرا تعمیل کرنا ہے جو شخص اپنی ''میں'' میں پھنس جاتا ہے وہ انا کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ اشفاق احمد ''مایا اور مون سون'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جو شخص بار بار یہ کہتا ہے کہ میری نماز درست نہیں، میں وسوسوں میں الجھا رہتا ہوں، میرا رخ ٹھیک نہیں ہے، میری عبادت میں نقص ہے تو وہ بندگی سے نکل کر اپنی ''میں'' کے اندر اپنی انا کے تکبر میں پھنسا ہوا ہے بندگی کی شان تو یہی ہے کہ بندہ حکم کے اندر لگا رہے۔ اس میں بندے کے لیے رحمت اور حکمت ہے۔'' (۲۷)

اشفاق احمد کے نزدیک انسانی زندگی اور کائنات سے وابستہ ہر شے کو معانی عطا کرتا ہے وہ ''بابا صاحبا'' میں کہتے

ہیں کہ:

''مذہب ایک ایسی چیز کا جلوہ (Vision) ہے جو دور (Beyond) اور پیچھے اور حاضر اشیاء کے درمیان موجود ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی پکی اور سچی حقیقت ہوتا ہے جو اپنا آپ منوانے کے لیے قطار میں منتظر کھڑا ہوتا ہے۔ مذہب ایک Remote Possibility ہے۔لیکن اس کے باوصف سامنے کی حقیقتوں میں سے ایک بھرپور حقیقت ہے۔ مذہب ہرگزرنے والی شے کو معنی عطا کرتا ہے اور ساتھ ہی apprehansive سے آنکھ بچا جاتا ہے۔ ایک ایسی شے جس کا حصول آخری کمال ہے لیکن کسی طرح سے ہاتھ نہیں آتا۔ جو آخری آدرش ہے لیکن جس کی quest ناامیدی ہے۔'' (۲۸)

اشفاق احمد کے نزدیک مذہب کے بغیر انسانی معاشرے اور زندگی دونوں کا تصور ناممکن ہے اور ان دونوں کو اخلاقیات کے بغیر سنبھالا نہیں دیا جا سکتا ہے وہ ''Evil مذہب'' میں لکھتے ہیں کہ:

''شاید اس کے قریب ترین اگر کوئی شے آسکتی ہے تو وہ اخلاقیات ہی ہے کیونکہ اس کے بغیر مذہب کا تصور ذرا مشکل سی بات ہے۔'' (۲۹)

مذہب کا مقصد کمزور، رد کیے ہوئے پستہ حال لوگوں کی فلاح اور اصلاح کے لیے صحیح راستوں کا تعین ہے۔ مثلاً:

''ہمیں جس علم کے حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، سکندر اس ڈیفی نیشن یہ ہے کہ ''بہتر جاننے والا کمتر جاننے والے کا ہاتھ پکڑ کر اسے مقصود تک پہنچا دے اور اس کو آسانیوں سے ہمکنار کر دے۔'' (۳۰)

انسانی زندگی کی ابتدا سے لے کر ارتقاء تک ہر شے مذہب کے تابع ہے۔ تفہیم کائنات سے عرفان کائنات تک کا ہر ذریعہ اظہار مذہب کا ہی مرہون منت ہے، اشفاق احمد ''آخری بات'' مشمولہ ''اور ڈرامے'' میں لکھتے ہیں:

''ہماری اس بھری پری دنیا میں سارے آرٹ کی اور کمال فن کی تمام تر بنیاد مذہب پر قائم ہے۔ اس وقت آرٹ کے جتنے بھی مظاہر ہیں وہ سارے کے سارے مذہب کے ارمغان ہیں۔'' (۳۱)

اشفاق احمد کے نزدیک انسانی زندگی میں مذہب کی حیثیت اسی طرح ہے جس طرح سانس زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ وہ ''من چلے کا سودا میں'' لکھتے ہیں کہ:

''لیکن مذہب تو لائف کا Essence ہے......زندگی کا نچوڑ ہے۔ وہ سوچ کے خلاف نہیں ہوسکتا۔'' (۳۲)

اشفاق احمد کے لیے مذہب دنیا اور آخرت میں ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے جو نہ صرف دین بلکہ دنیا میں
بھی تناسب قائم رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''مذہب ایک ایسا پل ہے جو دنیاوی بندھنوں سے بچا کر
مطلوبہ عافیت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس پل کا ایک سرا دنیا کے اندر قائم ہوتا ہے اور دوسرا ملکی کے
اندر۔'' (۳۳)

مذہب دنیا سے کٹ کر زندگی گزارنے کا نام نہیں ہے بلکہ دنیا میں رہ کر دنیا کے ساتھ رہنے کا نام مذہب ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک مذہبی شخص وہ ہوتا ہے جو دنیا سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرتا ہے جو سراسر غلط ہے۔ خاص طور پر مذہب اسلام میں رہبانیت کی گنجائش بالکل نہیں اس سلسلے میں اشفاق احمد ''توتا کہانی'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اسلام زندگی سے بھرپور دین ہے، سائیں صاحب اس میں دنیا چھوڑنے کا حکم نہیں دنیا کمانے کا حکم ہے۔ دنیا کمانے کا...... دنیا کے اندر رہ کر خدا کو یاد کرنے کا حکم ہے۔ راہب بن کر۔ گوشہ نشین بن کر یا چار دیواری کے اندر چھپ کر ایسے ڈیروں میں ہوحق کر کے اسلام حاصل نہیں ہوتا۔'' (۳۴)

مذہب اسلام کو اپنائے بغیر انسان فلاح کے راستے پر گامزن نہیں رہ سکتا ہے اور ہمارے ہاں بھی زیادہ مسائل کی وجہ اسلام سے دوری ہی ہے۔ آج ہمارا ملک اخلاقی اور معاشرتی بدحالی کا شکار محض اس لیے ہے کیونکہ مذہب سے دوری ہے۔ اشفاق احمد ''شوراشوری۔تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ایدھے لئی زہرہ بی بی نظام ماں تبدیلی کی ضرورت ہے جدتک صحیح اسلامی نظام نئیں آئے گا، اوس وقت تک ایسے ضرورت منداں اور حاجت منداں نوں تکلیف ای رہے گی۔'' (۳۵)

مذہب پر عمل پیرا ہونے والے شخص سے کسی کو نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ ایسا شخص اللہ سے جڑا رہتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''پکا مسلمان وہ ہے آپا جی جس کے ہاتھ سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا اور زبان سے کسی کی برائی نہیں ہوتی۔'' (۳۶)

اشفاق احمد کے نزدیک مذہب سے دوری انسان کی ابتری ہے اور مذہبی بنیادوں پر ہی قائم معاشرے میں انسان بہتر طریقے سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ مذاہب اللہ کی طرف انسان کی فلاح کے لیے بھیجے گئے اس لیے کوئی بھی مذہب ہو انسان کو بہتر زندگی گزارنے میں مدد دیتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کو بیان کرتے ہوئے اشفاق احمد ''ڈھنڈورا۔تلقین شاہ'' میں

لکھتے ہیں کہ:

''حضورؐ سرور کائنات نے فرمایا ہے جی کہ جس شخص نے دنیا کی تکلیفوں میں سے کسی شخص کی ایک تکلیف بھی دور کر دی خدا تعالیٰ اس کی تکلیفوں کو دور کر دے گا اور جس نے کسی تنگ حال کے لیے آسانی پیدا کی اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کے لیے آسانی پیدا کرے گا اور جس نے پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ آقا نامدارؐ نے فرمایا جی کہ اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے...... یعنی اللہ کی خوشنودی اور مدد حاصل کرن لئی بندے دی مدد کری جائے، بندے نوں خوش کریا جائے۔'' (۳۷)

اشفاق احمد مختلف دلائل اور مباحث سے یہ بات واضح انداز کرتے ہیں کہ مذہب اسلام اور اس سے پہلے بھی جو مذاہب آئے ان کا اولین مقصد انسانی فلاح اور بہتری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا واحد ذریعہ بھی یہی ہے۔ مذاہب انسان کے لیے اتارے گئے تھے، اس لیے انسان کی حیثیت مقدم ہے۔ مذاہب کا کام انسان کی راہنمائی کرنا ہے اور انسان کا کام ان پر عمل پیرا ہونا ہے۔

ج۔ تصوف

اردو نثر کا تصوف سے تعلق بہت پرانا ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش کے بارے میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''جہاں تک موجودہ تحقیق سے دریافت ہوا ہے کہ اردو نثر کا قدیم تین نمونہ تصوف کا ایک رسالہ ہے جس کے مصنف اشرف جہانگیر سمنانی ہیں۔ اس رسالے کا سنہ تصنیف ۷۰۸ ہجری م ۱۳۰۸ء ہے۔ لیکن دراصل اردو نثر کا پہلا دور باقاعدہ دور دکن کا ہے جہاں صوفیائے کرام نے مختلف مذہبی اور صوفیانہ مباحث اور مسائل پر رسالے لکھے اس دور کا مشہور رسالہ سید محمد بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف ہے جس کا نام معراج العاشقین ہے۔ اسی دور میں عبداللہ نے احکام الصلوٰۃ کے نام سے ایک اور رسالہ لکھا جس میں نماز کے مسائل بیان کیے گئے اس دور کے رسالے مختصر ہیں اور ان کا مقصد تعلیم و تربیت ہے۔'' (۳۸)

اردو نثر سے تصوف کی وابستگی کا مقصد بھی معاشرتی اصلاح اور اخلاقی اقدار کی ترویج ہے تاکہ فرد اور معاشرے کے

تعلقات عمدہ بنیادوں پر پنپ سکیں۔اشفاق احمد کے ہاں ہمیں ابتدا سے ہی تصوف کے اثرات ملتے ہیں۔

اشفاق احمد کے متصوفانہ رویے کے بارے میں ممتاز مفتی لکھتے ہیں کہ:

''نور بابا صوفی منش درویش تھا۔اس کا ڈیرا لاہور چھاؤنی کی ایک سڑک پر واقعہ تھا۔نور بابا کا مسلک لوگوں کو کھانا کھلانا تھا۔ پتہ نہیں اشفاق ڈیرے پر کیسے پہنچا۔ بابا کو اشفاق کی باتیں پسند آئیں، بابا اشفاق سے محبت کرنے لگا۔لہٰذا اشفاق کا ڈیرے پر جانا لازم ہو گیا۔نور بابا کہتا تھا، پتر لوگوں کو کھانا کھلاؤ جو کچھ تم خود کھاتے ہو پہلے اسے حلال کرلو خود کھانے سے پہلے دوسروں کو کھلاؤ......اشفاق کو بات دل کو لگی۔اس نے بانو کو بتائی۔دونوں نے فیصلہ کر لیا کہ کھلاؤ......کھلاؤ......کھلاؤ۔یوں ان کا باورچی خانہ چلنے لگا یوں چلنے لگا جیسے رہٹ چلتا ہے۔''(۳۹)

اشفاق احمد کے متصوفانہ رویے پر کچھ معترین اعتراض بھی کرتے ہیں کہ ان کا رویہ محض شہرت اور ناموری کے لیے ہے لیکن ان کے افسانوں اور ڈراموں کے کردار اس بات کا ثبوت ہیں کہ ''تصوف'' ان کی گھٹی میں ابتدا سے ہی موجود رہا ہے اور اس کا پیغام صرف اللہ اور بندے کے مابین تعلق کو بحال رکھنا ہے۔ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں کہ:

''موجودہ دور میں اشفاق کا نام ''متصوفانہ'' رویے کی وجہ سے متنازعہ فی بن گیا ہے کیونکہ ان کے بیشتر نکتہ چین یہ گمان کرتے ہیں کہ انہوں نے متصوفانہ رویہ بعض عملی مقاصد کے حصول اور سیاسی مقاصد کی تکمیل کی خاطر اپنایا ہے وہ اپنے تازہ ترین افسانوی میڈم ''ٹی۔وی ڈرامے'' کے ذریعے قاتلوں کو معافی دینے کی اپیل کرتے ہیں۔''ملا کو ہیرو بناتے ہیں۔آئن سٹائن کو صوفی ثابت کرتے ہیں۔مغربی علوم وفنون کی نارسائی کا شدومد سے کرتے ہیں۔وغیرہ۔ماجرا یہ ہے کہ اشفاق احمد کے ہاں تصوف سے رغبت گزشتہ پانچ چھ سالوں میں بڑھی ہے مگر پیدا انہی برسوں میں نہیں ہوئی۔داؤ جی بھی ایک صوفی کردار ہے ''فہیم'' کے نانا جی بھی درویش کی خدمت گزاری کے لیے نوکری چھوڑ دیتے ہیں ''ایل ویرا'' میں بھی صوفی کے دل اور یوگی کی آنکھ کا ذکر ملتا ہے۔اسی طرح محبت اور انسانیت سے ان کا والہانہ لگاؤ بھی انہیں صوفیوں سے محبت کا اہل بناتا ہے۔''(۴۰)

اشفاق احمد تصوف کی جانب اپنے رجحان کے بارے میں خود کہتے ہیں کہ:

''شاید کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں صوفی ازم کی طرف اب مائل ہوا ہوں لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔'' (۴۱)

اشفاق احمد نہ صرف انسان کو دنیا اور آخرت کے تعلق کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں بلکہ انسان کی اپنی ذات کے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے نجات دلاتے ہیں۔ وہ ''من چلے کا سودا'' میں کہتے ہیں کہ:

''صوفی ازم اختیار کرنے سے آپ کے اندر دوئی نہیں رہتی۔ آپ ٹکڑوں میں اور ٹوٹوں میں تقسیم ہونے سے بچ جاتے ہیں اور Dichotomy سے نکل جاتے ہیں۔'' (۴۲)

تصوف میں انسان ٹکڑوں میں بٹنے سے بچ جاتا ہے اور اسے اپنی ذات کی شناخت ہو جاتی ہے اور وہ انسانوں کی بھلائی کے لیے خود کو وقف کر دیتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''اپنے اخلاق کو سنوارنے اور بہتر انسان بننے کا نام تصوف ہے۔'' (۴۳)

تصوف نہ صرف خود کو سنوارنے کا نام ہے بلکہ دوسروں کے ساتھ بہتر رویے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشفاق احمد فرد اور معاشرے کے تعلق کو بہتر بنانے کے لیے، اخلاقی اقدار کو اپنانے کی بات کرتے ہیں اور انہی روایات سے رشتہ مضبوط رکھنے پر زور دیتے ہیں اور اسی پر ان کے تصوف کی بنیاد ہے۔ اس سلسلے میں طارق اسماعیل ساگر لکھتے ہیں کہ:

''فرنگی دانش کے تہذیب یافتہ، جدیدیت کو اوڑھنا بچھونا بنانے والوں کو اس نے اسلاف کی روایات سے محبت کا درس دیا ہے۔ اس نے بتایا کہ کوئی درخت اپنی جڑوں سے کٹ کر جی نہیں سکتا۔ دنیا کا سب سے قیمتی ''منی پلانٹ'' بھی برگد جیسی چھایا نہیں دے سکتا۔ یہی فلسفہ صوفی اشفاق احمد کی تعلیمات کی بنیاد تھا اور ایسی مضبوط بنیادوں پر استوار عمارتیں صدیوں اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں۔'' (۴۴)

جو قومیں اپنے اسلاف کی روایات سے رشتہ توڑ دیتی ہیں اپنی جڑوں سے کٹ جاتی ہے اور پھر جلد ہی اپنا وجود کھو دیتی ہیں۔ ایسی قوموں کا وجود ہمیشہ کے لیے زمین سے مٹ جاتا ہے اور آہستہ آہستہ ان کی یادوں کے نقوش بھی دھندلا جاتے ہیں۔ زندہ قومیں ہمیشہ اپنی روایات اور اقدار سے رشتہ استوار رکھتی ہیں۔ اپنی پہچان کو نہیں کھوتی۔ فقیری کا راستہ صاف اور سیدھا ہے ادھر یا اُدھر یا تو نفس، تکبر اور جھوٹ کو اپنانا ہے یا پھر بغیر سوال کیے اس ہستی کے احکامات کی پیروی کرتی ہے۔ کوئی سوال کوئی جواب کیے بغیر اور یقیناً یہ ایک مشکل کام ہے۔ اشفاق احمد ''کھٹیا وٹیا'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اوکھا گھاٹ فقیری دا، بھئی! اوکھا گھاٹ فقیری دا

مِسلاں دے وچ ویلا کڈھنا، میٹنگ دے وچ بینا

اوکھیاں دے نال متھالا کے، یس سر! یس سر! کہنا

ہسدے ہسدے رہنا

اپنی سیٹ تے عاجز بن کے اگے ہو کے بہنا

مرشد موہرے گل نہ کرنی، جو آکھے سو سہنا

دنیا داری کم نئیں، ایہہ کم ہے پتا چیری دا

اوکھا گھاٹ فقیری دا'' (۴۵)

فقیری کا راستہ آسان نہیں ہوتا۔ اس میں کئی آزمائشیں اور کٹھن گھڑیاں آتی ہیں اور سب سے زیادہ خطرہ انسان کو اپنی ذات سے ہوتا ہے کیونکہ اسے اپنے اوپر قابو نہیں ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر انسان کی سرشت میں گناہ شامل ہے۔ اشفاق احمد ''شاہلا کوٹ۔تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''بڑی سے بڑی ہستی کو اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔خطرہ آخری دم تک موجود رہتا ہے۔'' (۴۶)

فقیری کے راستے پر قدم رکھتے ہی انسان پر آزمائشیں آنے لگ جاتی ہیں جیسے کہ من چلے کا سودا میں ارشاد محمد حسین ڈاکیے سے کہتا ہے کہ:

''ارشاد: حضور میں چلنا چاہتا ہوں اس راستے پر......لیکن مجھ سے فیصلہ نہیں ہو پاتا۔

محمد حسین: لیکن یہ فیصلہ تو تم ہی کو کرنا ہوگا ارشاد......!

ارشاد: جس قدر میرا جھکاؤ ہو رہا ہے حضرت، اتنی ہی چمگادڑیں مجھ پر گر رہی ہیں۔

محمد حسین: گریں گی......گریں...... یہ تو معمولی ہے بھائی! اس راستے پر میں چمگادڑیں تو اڑ اڑ کر چمٹیں گی۔

ارشاد: فیکٹریاں، زمینیں، دولت، عورتیں......سب میری طرف بھاگ رہی ہیں آقا......'' (۴۷)

تصوف کی راہ میں زر، زمین، زن کی آزمائشیں راستے میں حائل ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ کوئی بھی خوبی انسان کے لیے آزمائش بن جاتی ہے۔ مثلاً

''انسان میں کوئی بھی خوبی موجود ہو۔ تکبر کا باعث بن جاتی ہے...... دولت، حسن، ایمان، دانش سب

اوصاف ایسے ہیں جن میں ایک وصف مشترک ہے وہ صاحب خوبی میں خود بینی، خودنمائی، اور خود رائی پیدا کر دیتے ہیں۔'' (۴۸)

تصوف کے راستے میں حائل یہ دیواریں انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتے ہیں اور نہ صرف خود سے بلکہ خدا سے بھی دور ہو جاتا ہے اور دوسرے انسانوں سے بھی اس کے رویے میں تبدیلی آ جاتی ہے جبکہ تصوف کا مقصد یہ نہیں ہے۔ اشفاق احمد ''سفر در سفر'' میں لکھتے ہیں کہ:

''تصوف کا مقصد خدمت خلق اور مخلوق خدا کی بہتری میں لگے رہنا ہے۔'' (۴۹)

تصوف کا مطلب کشف و کرامات یا راہبانیت نہیں ہے نہ ہی اس کا تعلق روحانی طاقت کا حاصل کرنا ہے بلکہ اشفاق احمد کے نزدیک تصوف خدمت خلق اور انسانی بھلائی کا نام ہے۔ اور جوں جوں انسانی فلاح کے لیے انسان کے قدم اٹھیں گے اس کے راستے خود بخود ہموار ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ ''حیرت کدہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جس قدر انسان دنیاوی خواہشات کا پابند ہوگا اور رضائے الٰہی کا کم متلاشی ہوگا۔ وہ چھوٹی چھوٹی آزمائشوں سے دوچار ہوگا۔ جوں جوں اعلیٰ درجوں میں نفس کی تنظیم کرتا پہنچے گا، اس کے امتحان، اس کی آزمائشیں، اس کی منزل مشکل ہوتی جائے گی۔ دنیا تو اللہ کی محبت کی آزمائش گاہ ہے...... کوئی نہ کوئی آشفتہ سر نار دنیا سے گزر کر کندن ہوتا ہے۔'' (۵۰)

انسان کے مٹی سے کندن ہو جانے کے مراحل بیان کرتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں تصوف کی راہ پر چلنا آسان نہیں ہے۔ اس میں مسلسل صبر اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سب سے بڑی آزمائش یا رکاوٹ انسان کا اپنا نفس اور وجود ہوتا ہے جس قدر وہ نفس پر قابو پائے گا اسی قدر منزل اس کے قریب آتی جائے گی۔ اشفاق احمد ''بابا صاحبا'' میں لکھتے ہیں کہ:

''تصوف یا صوفی ازم اور دوسرے علموں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ علم تو پہلے حاصل کیے جاتے ہیں اور پھر ان پر عمل کیا جاتا ہے لیکن تصوف اس کی الٹ ہے۔ اس میں پہلے عمل کیا جاتا ہے اور علم حاصل ہونے لگتا ہے۔'' (۵۱)

اشفاق احمد کے نزدیک تصوف ہی زندگی ہے۔ اس میں نفس مطمئن رہتا ہے اور اس کا مقصد انسان کی خدمت

ہے۔ دوسروں کے لیے بھلائی اور اپنے لیے صبر ہے اور دوسروں کو آسانیاں فراہم کرنا ہے۔

د۔ معاشرت

انسانوں کے مل جل رہنے کا نام معاشرہ ہے اور اشفاق احمد نے ہمیشہ تعمیر معاشرت پر زور دیا ہے۔ بانو قدسیہ اشفاق احمد کے معاشرتی تصور کے بارے میں کہتی ہیں کہ:

''اشفاق احمد کے نزدیک معاشرہ کا مطلب افراد کا مل جل کر زندگی بسر کرنا ہے۔''(۵۲)

اسی طرح سوشل سائنس انسائیکلو پیڈیا میں Noel Timms معاشرہ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ:

"In very broad terms society is concieved of as the frame work or totality in which human beings engage in social relations."(۶۱)

اشفاق احمد نے علمی وادبی ہر سطح پر معاشرتی بھلائی کو اپنے پیش نظر رکھا اور اجتماعی خوشحالی کی بات کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''ریڈیو پاکستان لاہور سے تلقین شاہ ۳۹ برس تک مسلسل نشر ہوتا رہا۔ اس کے رائٹر یا اداکار، ہدایتکار اور پروڈیوسر سب کچھ اشفاق احمد ہی ہوتے تھے۔ ہر ہفتہ نیا کھیل لکھنا اور پروڈیوس کرنا آسان نہیں۔ اس کھیل کا خطاب دراصل پاکستانی عوام سے تھا اور دلچسپ مکالموں کے ذریعہ عوام میں سیاسی، سماجی اور اخلاقی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ منچلے کا سودا میں یہ پیغام روحانیت کے حوالے سے دیا گیا تھا۔ ان کا ٹی وی پروگرام زاویہ تو تھا ہی لوک دانش کے ابلاغ کے لیے۔''(۵۳)

اشفاق نے معاشرتی بھلائی اور ترقی کے لیے غیر اقوام سے اقدار کو مستعار نہیں لیا۔ بلکہ اپنی روایات سے ہی نوجوان نسل کو وہ مثالیں دیں جو موجودہ دور میں ان کی زندگی میں توازن قائم کر سکیں۔ انہوں نے اپنی روایات کو عوام سے اس طرح سے متعارف کروایا کہ نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی سطح پر بھی ان کے معاشرت کے تصور کو پذیرائی ملی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عطاء الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

''میرے نزدیک ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ مسلم تہذیب کی اعلیٰ قدروں اور ہمارے

سماج کی بعض روایتی خوبیوں پر ان کا ایقان اتنا گہرا تھا کہ بڑے بڑے مغرب زدہ دانشوران کے بیان
کے آگے سر جھکاتے تو آئے تھے...... ہماری کئی ایک سماجی قدروں میں سے جنہیں ہم نے فرسودہ سمجھ کر
رکھا ہے حکمت و دانائی کے ایسے نکات لا نکالتے تھے کہ سننے والا عش عش بھی کر اٹھتا اور اشفاق احمد کی نظر
کی گہرائی کا بھی قائل ہو جاتا۔''(۵۴)

اشفاق احمد نے بلاشبہ زیادہ تر کام معاشرتی اصلاح کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''انہوں نے معاشرے کے اخلاقی انحطاط کی اصلاح کے لیے ریڈیو پروگرام ''تلقین شاہ'' شروع کیا تو
یہ برسوں ریڈیو پاکستان کا مقبول ترین پروگرام ثابت ہوا۔''(۵۵)

معاشرتی استحکام کے لیے اشفاق احمد نہ صرف مسلم تہذیب، اخلاقی اقدار اور اسلاف کی روایات کو پیش کرتے ہیں بلکہ مغربی تہذیب کے بھی وہ اصول جو معاشرتی بھلائی کے لیے کام آ سکتے ہیں ان کو بھی جہاں عام کرتے نظر آتے ہیں وہاں کمزوریوں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں۔''اردو کے آخری داستان گو'' میں ڈاکٹر عطاء الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد اہل مغرب کی معاشرتی اقدار پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ان کے بعض کمزور پہلوؤں کو
بڑے خوبصورت اور حکیمانہ انداز میں طشت از بام کرتے تھے۔''(۵٦)

معاشرتی انتظام کے لیے سب کو مل جل کر کوشش کرنی چاہیے کیونکہ یہ فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہے۔معاشرتی ترقی کے لیے اجتماعی ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''معاشرتی ترقی کے لیے سب سے بڑی اور بنیادی ضرورت معاشرہ میں ہم آہنگی کا ہونا ہے،کسی معاشرے
کی ترقی سے مراد صرف مادی مسائل کا وافر مقدار میں ہونا نہیں بلکہ اصل معاشرتی ترقی مادی ضرورتوں کے
پورا ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف گروہوں میں ہم آہنگی کا ہونا بھی ہے۔''(۵۷)

اشفاق احمد کے نزدیک انسان تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا ہے اس کی سرشت میں شامل ہے کہ وہ مل جل کر رہنا چاہتا ہے اور اکیلا کام نہیں کر سکتا وہ ''زاویہ۔۲'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اکیلا انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا چاہے وہ کتنا ہی زور کیوں نہ لگائے اس لیے اللہ ہمیشہ انسان کو جماعت
کے رخ سے پکارتا ہے اور جماعت کے رخ سے ہی حوالہ دیتا ہے۔''(۵۸)

معاشرتی بحالی کے لیے ضروری ہے کہ تمام افراد اجتماعی خوشحالی کے لیے کوشاں رہیں کیونکہ فرد اور معاشرہ لازم و ملزوم ہیں اور اگر فرد کا وجود نہ ہو تو معاشرے کا تصور ناممکن ہے پروفسر سید شمیم حسین قادری لکھتے ہیں کہ:

''فرد اور معاشرہ باہم لازم و ملزوم ہیں۔ معاشرہ افراد کے بغیر تشکیل نہیں پا سکتا اور فرد معاشرے سے کٹ کر ایک بے حقیقت اکائی رہ جاتا ہے۔''(۵۹)

معاشرہ انسانوں کے ایسے گروہ کا نام ہے جس کی مخصوص اخلاقی اقدار ہوتی ہیں۔ پروفیسر خوشحال خٹک کے نزدیک:

''معاشرہ انسان کے مہذب اجتماع کا دوسرا نام ہے جس کی بنیادیں مخصوص اجتماعی اقدار پر استوار ہوتی ہیں اور پوری معاشرتی عمارت میں تاریخی پس منظر، معاشی افتاد سماجی بندھن وغیرہ اینٹ گارے کا کام دیتے ہیں۔''(۶۰)

معاشرتی ترقی و استحکام افراد کی اجتماعی کاوشوں کے بغیر ناممکن ہے اس لیے سب کو مل جل کر ہی اس کے لیے عملی اقدامات کرنا ہوں گے اور معاشرتی خوشحالی سے وابستہ چیزوں کو عام کرنا ہوگا۔ اشفاق احمد کے نزدیک معاشرتی ترقی کے لیے معاشرے میں محبت کو عام کرنا لازمی ہے۔ وہ ''ترقی۔ بابا صاحبا'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جب معاشرے میں محبت باہم ہوگی تو معاشرہ ترقی کی طرف گامزن ہوگا۔''(۶۲)

معاشرتی ترقی کے لیے جن لوازمات کا ہونا ضروری ہے۔ اشفاق احمد ان کا بیان کرتے ہوئے ''قوم۔معاشرہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جس قوم کا شعار سادگی نہ رہے شجاعت اس سے دور بھاگتی ہے۔

جس معاشرے میں وعدے کو پورا نہ کیا جاتا ہو وہ معاشرہ بے جان ہوتا ہے۔

جماعت عملاً ایک دوسرے کے کام آنے سے بنتی ہے ورنہ مخفی قول کے ایک ہونے سے حق ادا نہیں ہوتا۔

اپنی ذات کے لیے صبر اور مخلوق خدا کے لیے بھلائی ہے۔''(۶۳)

معاشرے میں زندگی گزارنے کے لیے مل جل کر اچھے تعلقات قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے اور انسان اپنے بہت سے کاموں کے لیے ایک دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔ اشفاق احمد کے نزدیک تو انسان کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کے کام

آنا ہونا چاہیے ورنہ اس کی زندگی بے وقعت ہو جاتی ہے۔ وہ ''گلدان۔تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''تھوڑی سی تو زندگی ہے۔ جی آدمی آدمی کے کام نہ آیا تو پھر کس کام کا۔'' (۶۴)

فرد واحد کا وجود تنہا کچھ بھی نہیں، اس کی ذات کی پہچان معاشرے سے بنتی ہے اگر فرد کا رشتہ جماعت سے ٹوٹ جائے تو اس کا وجود بکھر کر رہ جاتا ہے اور وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد ''ڈھنڈورا۔تلقین شاہ'' میں رقمطراز ہیں کہ:

تسبیح کے دانے نہیں ہوتے جی الگ الگ، وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں ایک ہی دھاگے میں پروئے ہوتے ہیں...... اور ایک اکیلے دانے سے تسبیح نہیں بنتی جی...... یہی حال معاشرے اور قوم کا اور ملت کا ہے جی جب تک ہر فرد دوسرے فرد کو تسلیم نہیں کرے گا اکیلا رہ جائے گا اور اکیلا پن خود غرضی اور نفسانفسی کی علامت ہے جی اس سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔'' (۶۵)

معاشرے کا تصور قائم ہی جماعت کے ساتھ ہے اگر افراد میں باہمی یگانگت نہ ہو تو جماعت منتشر ہو جاتی ہے اور اس کو اکٹھا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اور انسانی معاشرتی زندگی کا تصور ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اشفاق احمد ''زنجیر تعلق۔تلقین شاہ'' میں بیان کرتے ہیں کہ:

''مطلب یہ جی کہ اگر ایک معاشرہ صرف زبانی حد تک ایک اصول کو مانتا ہو۔ زبانی حد تک ایک فلسفے پر یا ایک نظریے پر قائم ہو اور ایک دوسرے کے عملاً کام نہ آتا ہو تو وہ معاشرہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ جماعت ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے ساتھ اس کا فلسفہ بھی مر جاتا ہے۔'' (۶۶)

معاشرتی انحطاط کی بڑی وجہ تو اپنی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار سے دوری ہے، ہر فرد خوف کا شکار ہے اور اپنے ڈر کو ختم کرنے کے لیے ہر وہ حربہ اختیار کرتا ہے جو اسے بہتر نظر آتا ہے۔ خود شناسی کی بجائے دوسروں پر تنقید کا چلن عام ہے۔ جس کا مقصد خود کو محفوظ رکھنا اوار دوسروں کو ہراساں رکھنا بھی ہے۔ اشفاق احمد ''دھینگا مشتی۔تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اصل ماں لوکاں پا وقت نئیں ریا۔ جیدھے پا تھوڑا بہت وقت ہندا اے اوہ دوجے نوں نصیحت کرن پر لگا رندا اے اپنے پا کم کرن نوں کوئی ٹیم ای نہیں رہ جاندا۔'' (۶۷)

اشفاق احمد کے مطابق اگر انسان دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کی بجائے خود کو درست کر لے تو آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور پھر انسان آسانیاں ہی بانٹتا رہتا ہے اور اس کے اندر کی اچھائی اسے بھٹکنے نہیں دے گی۔ ہماری زیادہ بولنے کی اور کم

سننے کی عادت نے ہمیں مختلف مسائل سے دوچار کر رکھا ہے۔ وہ ''کھیل تماشا'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اگر انسان کہن کے بھید اور اپنے ادھکاوے واقف ہووے اور پچھ پات کو چھوڑ دیوے تو ایک سند یہہ بھی پاس نہ پھٹکے اور سب اچھے دیکھیں۔'' (۶۸)

ہمارے ہاں اصل میں عزت کے معیار تبدیل ہو گئے ہیں، ظاہر باطن پر فوقیت لے گیا ہے اور شان و شوکت کے پیمانے تبدیل ہو چکے ہیں، اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''اختراع کرن والے یا ایجاد کرن والے کی عزت نہیں ہندی، لڑواں مرواں والے کی زیادہ عزت ہندی اے، مورت بی اوہدی چھپ دی اے۔ جلوس بی اوہدے نکالے جاندے این، نظماں بی اوہدی شاناں لخیاں جاندیاں این۔'' (۶۹)

معاشرے میں عزت کے معیارات کی تبدیلی کے ساتھ ہی بے ایمانی، دھوکہ اور فریب کے عناصر بڑھتے جا رہے ہیں کیونکہ اسی کو عزت ملتی ہے جس کے پاس دھن دولت اور چاندی سونے کے سکے ہیں۔ اس لیے ہر آدمی اسی دولت کو پانا چاہتا ہے جو اس کو معاشرے میں عزت دلا سکے کیونکہ امیر شخص، کیسے امیر ہوا اب یہ مسئلہ نہیں ہے، امیر کا امیر ہونا کافی ہے۔ اشفاق احمد ''ڈمی سٹی'' میں بیان کرتے ہیں کہ:

''جب تک ہم کو معاشرے میں وہ عزت نہیں ملے گی جس کے ہم جائز حقدار ہیں اور وہ احترام نہیں دیا جائے گا جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے اس وقت ہم لوٹ کھسوٹ کرتے رہیں گے۔ چالاکی، عیاری اور بے ایمانی سے روپیہ بناتے رہیں گے کیونکہ ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ یہ معاشرہ صرف اس کو معزز سمجھتا ہے جس کے پاس دولت ہے صرف اس کو محترم جانتا ہے جو دولت مند ہے۔'' (۷۰)

ہم لوگوں نے اپنی عزت بڑھانے اور دوسروں کی عزت کم کرنے کے مختلف حربے تلاش کر رکھے ہیں اور اپنے ترازو میں کوئی نہ کوئی بٹہ ڈال کر اپنا وزن بڑھانے میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ اور اس سارے Process میں ہمیں نہ تو اپنی قوتیں صرف ہونے کی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی وقت کے ضیاع کا خیال رہتا ہے۔ اشفاق احمد ''بندۂ زمانہ۔ تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جس ملک کا نظام ہدایت بے اعتباری اور بے اعتمادی پر قائم ہووے Distrust پر، وہاں تمام افرادی

قوت، سارا وقت اور بیشتر سرمایہ اپنے آپ نوں قابل اعتماد اور قابل اعتبار اور Trust Worthy ثابت کرن پر صرف ہو جانداا اے۔''(۷۱)

اشفاق احمد کے نزدیک انسان فرشتے کی صورت معصوم اس دنیا میں جنم لیتا ہے اردگرد کا ماحول اور عناصر اس کی شخصیت کو تبدیل کرتے ہیں۔ وہ ''جنگ بجنگ۔تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''پہلے سب اچھے بھلے ہوتے ہیں ہدایت اللہ۔ پھر جب وہ ادھر ادھر کی چکا چوند دیکھتے ہیں تو ان کے اختیار میں نہیں رہتا اور وہ بے ایمانی کی ریلے میں بہنے لگتے ہیں۔''(۷۲)

اشفاق احمد معاشرتی زوال کا نقشہ کھینچ کر الفاظ میں بیان کرتے ہیں بلکہ وہ معاشرتی انحطاط کی وجوہات بیان کرتے ہوئے ''تسلیم و رضا کے بندے'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ہم نے اور آپ نے کبھی شیئر کرنے والا کام نہیں کیا ہے ہم نے کبھی خوشیوں کو شیئر نہیں کیا۔''(۷۳)

ہم سب اپنی اپنی ذات میں مقید ہیں اور دوسروں کے لیے آسانیاں فراہم کرنا تو دور کی بات ہے ان کی مشکلات کو سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ آپس کے تعلقات خواب ہو کر رہ گئے ہیں۔ جوں جوں عمر کے ایام بڑھتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچتے ہیں، ایماندار سے ایماندار شخص بھی لالچ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''جد آدمی ریٹائرڈ ہون کے قریب آنداا اے اونیں تمام زندگی نہایت پارسائی، خلوص نیتی نے نوکری کری ہندی اے۔ تب ریٹائرڈ ہون تے سال دو سال ارے اوہدے ول ماں زمین لین کا اور مربعے پوان کا لاٹو بلداا اے۔''(۷۴)

اشفاق احمد معاشرے میں بہتری لانے کی تجاویز بھی خود ہی پیش کرتے ہیں۔ صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لیے افراد کا مل جل کر رہنا اور محبت کے ساتھ خدمت کرنے کا ہونا ضروری ہے۔ اشفاق احمد کے مطابق بہتر معاشرے کے قیام کے لیے ایک دوسرے کے کام آنا لازمی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اک دوجے دی خدمت کرنی چاہی دی اے۔''(۷۵)

دین اور دنیا میں سرخرو ہونے کے لیے ماں باپ کی خدمت کو لازمی قرار دیتے ہیں کہ یہ واحد ذریعہ ہے جس کے ذریعے آپ سرفرازی حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ ''اُچے برج لاہور دے'' میں لکھتے ہیں کہ:

تو بات ایہہ اے بیٹا جی ہئ اپنے والدین دی جتھے تیکر ہو سکے خدمت کرنا چاہی دی اے۔ ادب کرنا چاہی دا اے۔ اطاعت کرنی چاہی دی اے۔ ایناں چیزاں دی بدولت ای انسان ترقی کردا اے اور ایناں زیناں دی معرفت ای انسان اوج ثریا تے مقیم ہندا اے۔''(۷۶)

انسان کی فلاح کے لیے محبت کا پیغام عام کرتے ہوئے اشفاق احمد محبت کے چلن کو عام کرنے کی بات کرتے ہیں اور انسان کی ساری ریاضت کا نچوڑ یہ ہی بتاتے ہیں کہ وہ دوسرے انسان کے لیے تکلیف کا باعث نہ بنے۔ وہ ''آسودگی۔ تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں:

''......کسی کا دل نہ دکھائے انسان اس سے بڑی عبادت اور کوئی نہیں...... ویسے ہو کیسے نئیں سکدا۔ انسان احتیاط برتے اور اپنی زبان پر قابو رکھے تاں کسے کا بھی دل نئیں دکھ سکدا ایس معاشرے ماں۔''(۷۷)

معاشرے میں بہتر ماحول کے لیے اپنے اخلاق کو بہتر بنانا چاہیے۔ ایک دوسرے سے خلوص اور یگانگت کے جذبات لیے ہوئے پیش آنا چاہیے۔ دوسروں کی غلطیوں کو نظرانداز کر دینا چاہیے۔ خوش اخلاقی کو عادت بنانا چاہیے تا کہ یہ مثبت شعاعیں آپ میں سے نکل کر ارد گرد کے ماحول کو بھی بہتر بنا سکیں۔ ''محاسن اخلاق'' میں اس بارے میں ہے کہ:

''خوش اخلاقی کو خوشبو سے تشبیہہ دیتے ہیں یعنی جیسے کہ راحت روح کو خوشبو پہنچاتی ہے ایسے ہی خوش خلقی سے آدمی کو راحت پہنچتی ہے۔''(۷۸)

ایک سچے مسلمان کے اوصاف میں شامل ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے محفوظ رہتے ہیں۔ اشفاق احمد بھی خود ستائشی کے بجائے خود شناسی کی جانب زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ معاشرتی بھلائی کے لیے بار بار اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ اپنے لیے صبر اور دوسروں کے لیے بھلائی چاہو، دوسروں کی تعریف اور خود پر تنقید کرو کیونکہ اسی میں اس کی فلاح ہے۔ وہ ''حسرتِ تعمیر۔ تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اوروں کی گنتی کرنے اور دوسروں کے بارے میں سوچنے کے بجائے اگر انسان خود اپنے آپ کو اس کا پابند بنا لے تو زیادہ بہتر ہوگا۔''(۷۹)

معاشرے میں خرابی کی بڑی وجہ امیر اور غریب کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ ہے۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری نے

معاشرے میں دریوزہ گری کی تعداد کو بڑھا دیا ہے۔ لوگ اب اس پر شرم محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اشفاق احمد اس کی شدید مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''میں تہاڈی طرح گداگری اور دریوزہ گری نوں مردتوانا لئی فصل ناقص خیال کرداایں۔''(۸۰)

گداگری اور دریوزہ گری جیسے عناصر کا سدباب کرنے کے لیے معاشرے میں عملی اقدامات اٹھانے کی جانب بھی وہ سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں کیونکہ معاشرتی مسائل کا حل تب ہی نکل سکتا ہے جب ہم مل جل کر اس کے لیے کوشش کریں بہ دیگر صورت معاشرے میں بے برکتی بڑھ جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مخلوق خدا کا حصہ اسے نہ دیا جائے تو معاشرے سے برکت اٹھ جاتی ہے میرے آقا۔''(۸۱)

معاشرتی زندگی میں خوشحالی لانے کے لیے ہمیں زبانی جمع خرچ کی بجائے عملی اقدامات اٹھانے ہوں گے ورنہ معاشرے کو لوٹ کھسوٹ، بدامنی، دھوکا دہی، ریاکاری، چوری، بددیانتی، گداگری، دریوزہ گری اور مہنگائی جیسے عفریت سے آزاد کروانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''ہمیں جز رسی اور کفایت سے کام لینا ہوگا۔ فضول چیزوں پر روپیہ خرچ کرنے کے بجائے اس رقم کو کارخانوں اور فیکٹریوں کی تعمیر پر لگانا ہوگا تاکہ ان سے اشیائے صرف زیادہ مقدار میں حاصل ہوں اور ملک سے مہنگائی دور ہو۔''(۸۲)

اشفاق احمد معاشرتی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہوئے ساتھ ساتھ ان کے بیان کے حل بھی پیش کرتے جاتے ہیں۔ وہ ''بانسری'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اگر میرے بچے اپنے خیالات کو مثبت انداز میں ڈھالیں اور خودکشی اور قتل کرنے والی رائفل کو بانسری میں تبدیل کر دیں تو وہ بہت سی مشکلات کا حل نکال سکتے ہیں۔ ان کی یہ گھبراہٹ انفارمیشن ملنے کی وجہ سے ہے۔ میرے بچے روانڈا کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں اور اپنے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ اپنی ذات کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے جس طرح سے کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے اللہ کو پہچان لیا اس لیے خود کی پہچان کرنا بہت ضروری ہے۔''(۸۳)

خودشناسی ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے انسان اپنے ہم نفسوں کی نفسیات جزئیات کے ساتھ جاننے کے قابل ہو

سکتا ہے اور اسی صورت میں وہ خدا کی پہچان تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اللہ کی نظر میں وہ ہی پسندیدہ ہے جو اس کی تعمیل دل سے بجا لاتا ہے اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اس کی مخلوق سے محبت رکھتا ہے اور اس سے بھلائی کے کام خود بخود سرزد ہونے لگتے ہیں اور یہی ایک مسلمان کی پہچان ہے۔ اس سلسلے میں اشفاق احمد ''بڑا اوَ۔ تلقین شاہ'' میں بیان کرتے ہیں کہ:

''مومن کا اور مسلمان کا مقصد ترقی کرنا نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنا اور اپنے نصب العین پر نظر رکھنا ہے۔ جی یہی تو وہ چیز ہے جو اسے ساری قوموں سے الگ کرتی ہے۔''(۸۴)

اشفاق احمد کے ہاں معاشرت کا تصور بہت وسیع ہے وہ نہ صرف ایک خطہ زمین کے لوگوں کے رہن سہن کی بات کرتے ہیں بلکہ وہ بین الاقوامی سطح پر بلا تخصیص مذہب وملت انسانیت کی بھلائی کے لیے پیغام دیتے ہیں۔ انسان سے محبت کا جذبہ کائنات میں بلا امتیاز رنگ، نسل، نوع، مذہب، جنس کے دکھائی دیتا ہے۔ وہ انسانوں کے ساتھ ساتھ پھولوں، کلیوں، درختوں، گھاس پھوس، پرندوں اور جانوروں سے بھی محبت کرتے نظر آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ کی بنائی اس دنیا میں سب انسان مل جل کر ایک دوسرے کی بھلائی اور خدمت پر مامور رہیں۔ وہ ''دھرتی کے رشتے میں'' لکھتے ہیں کہ:

''امیر اور کئی عزیز اور میرے بہت ہی قریبی عزیز ہیں، میرے صرف مسلمان، پارسی، شیعہ، سنی، بابری، عیسائی، میگوار، گیری ہی عزیز و اقارب ہیں بلکہ وہ جانور بھی میرے عزیز رشتہ میں یہ یہ مینا، اونٹ، فاختائیں، درخت، کیکر، شہتوت، طوطے بھی رشتہ دار ہیں۔''(۸۵)

اشفاق احمد اسی وسیع معاشرے میں امن و امان اور محبت کی ایسی شمع منور کرنا چاہتے ہیں جس کی روشنی نہ صرف موجودہ نسل کے اذہان و ارواح اور ابدان کو روشن کرے بلکہ آنے والی نسلوں پر بھی اپنے اجالے کی کرنیں منتقل کرے تا کہ ہم پھر سے ایک ایسی زندہ اور روشن قوم بن سکیں جو ہمارا خاصہ اور پہچان ہے۔

ہ۔ معیشت

اشفاق احمد کے مطابق موجودہ دور میں معیشت انسان پر حاوی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بچنے کے لیے تدابیر بھی بتاتے ہیں۔ اشفاق احمد ایک حقیقت پسند ادیب کی حیثیت سے قارئین کو اصل صورت حال سے واقف کروانا خوب جانتے ہیں وہ ''بڑا اوَ۔ تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ایہہ اکنامکس کا دور اے بیٹا۔ ہر ایک شے معاشیات کے ترازو ماں تولی جاندی اے اور اکنامکس کے

پیمانے ناں پاٹی جاندی اے۔ جونسا مسئلہ اکنامکس کی کسوٹی پر پورا نہ اترے یا اکنامکس کی پتھری پر لگا کر ویکھیا نہ جاوے او جھوٹا اور بے کارا ے۔'' (۸۶)

موجودہ معاشرے میں معیشت کس حد تک اثر انداز ہے اور اس کا لوگوں کی زندگی پر کس قدر اثر ہوتا ہے اس کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''اور کیا چاہی دا اے کڑ یئے ایس زمانے ماں جنہوں اکنامکس کے ساتھ اسٹیٹس آندا ہووے او تاں گویا سونے کا مالک اے چوہنڈی بھر سہاگے کے ساتھ۔ جد چاہیا چمکا کے دیکھ لیا، بوتھا۔'' (۸۷)

انسان جب اسٹیٹس کے چکر میں پڑ جاتا ہے تو پھر دنیا کو دیکھنے کا انداز اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں تبدیلی آ جاتی ہے لیکن دولت کے ساتھ سب سے پہلا بدلاؤ خود آپ کی ذات میں آتا ہے اور شخصیت پر اثر پڑتا ہے اور جب شخصیت پر اثر پڑتا ہے تو رویے میں بھی فرق ظاہر ہونے لگتا ہے اور اردگرد کا ماحول متاثر ہوتا ہے۔ ان کیفیات کو ترتیب سے بتاتے ہوئے اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''طاقت اور دولت کا ہمیشہ چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ جب دولت کی فراوانی ہو جاتی ہے ناں مس صاحب تو پھر لوگوں میں آسائش اور غفلت اور تن آسانی پیدا ہونے لگتی ہے اور جب لوگ عیش پرست اور تن آسان ہو جاتے ہیں تو ان کی اخلاقی قدریں کمزور ہونے لگتی ہیں اور جب اخلاقی قدریں کمزور ہو جاتی ہیں تو پھر وہ اصولوں پر سمجھوتے کرنے لگتے ہیں اور جس نظریے کو انہوں نے سختی کے ساتھ اپنایا ہوتا ہے اس پر ان کی گرفت ڈھیلی ہونے لگتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وقار کم ہونے لگتا ہے اور خدا کا قانون اور تاریخ کا عمل انہیں دھیرے دھیرے پننا شروع کر دیتا ہے اور وہ دشمن جو صدیوں سے ایسی قوم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے دور بیٹھ کر انتظار کرنا شروع کر دیتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے میرے آقا......آخر میں صرف تاریخ کی کتابوں میں اس کا ذکر رہ جاتا ہے۔'' (۸۸)

دولت کا خمار انسان کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ فکر و تدبر کے راستے اس پر بند ہو جاتے ہیں۔ جذبات و احساسات بے معنی ہو جاتے ہیں جبکہ اصل میں دولت اور شان و شوکت تو گھاس کے پھول کی مانند ہے۔ جو پل میں سوکھ کر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ اشفاق احمد ''بابا صاحبا'' میں لکھتے ہیں کہ:

''دولت کوئی چیز نہیں ہے، کوئی شے نہیں ہے۔ یہ ایک عمل ہے۔ یوں سمجھو یہ زندگی کی عبارت میں ایک تحریک کے طور پر کام کرتی ہے دولت ایک رسم نہیں ہے، یہ فعل ہے۔''(۸۹)

دولت صرف اپنی ضروریات زندگی کو بہتر طور پر گزارنے کے لیے استعمال میں نہیں لائی جاتی یا اس کی طلب اپنا آرام و آسائش نہیں بلکہ دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کے لیے اور اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے اس کے حصول کی خواہش کی جاتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

''اگر انسان ڈوڑھ کروڑ روپیہ لے کے ہمالیہ کی چوٹی پر جا بیٹھے اور ویکھن سنن والا کوئی نہ ہووے اور تقابل نہ ہوئے کسے کے ساتھ تاں بھاہے دینا ایں او روپیہ...... او دولت کس کم کی ریگستاں ما کلی ڈال کے بیٹھا ہووے اور باراں باراں کوہ پر بندا ہوئے نہ بندے کی ذات تاں اوس امیری نوں پھونکنا اے۔ دولت مندی تاں لوکاں ناسیں دھواں دین خاطر ہندی اے۔ کلیجہ لوسن کی خاطر اردگرد کے لوکاں کا۔''(۹۰)

دولت کا حصول محض دکھاوا ہی نہیں بلکہ دوسروں کو جلانا بھی اس کا مقصود ہے۔ روپیہ پیسے کے آتے ہی انسان کے مسائل بھی بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ''شوراشوری'' میں ملاحظہ فرمائیے۔

''جوں جوں آدمی کے پاس دولت بڑھ دی اے...... اور جوں جوں انسان کا علم بڑھ دا اے زہرہ...... میری بہن اوہنوں سکیورٹی کی فکر کھان لگ پڑ دی اے۔''(۹۱)

غریب آدمی کے پاس ہوتا ہی کچھ نہیں سوائے اپنی ذات کے، جس حفاظت وہ اللہ کے آسرے پر کرتا ہے، جبکہ امیر، اپنے مستقبل سے خوفزدہ زندگی گزارتا ہے۔ کئی مسائل اور پریشانیاں صرف چھن جانے کے خوف سے جڑی ہوتی ہے۔ جبکہ غریب خوش و خرم آرام و سکون سے، سکیورٹی کی فکر کے بغیر زندگی کے ایام بسر کر رہا ہوتا ہے اور کوئی ڈر، خوف، اندیشہ ہراساں نہیں کرتا جبکہ امیر آدمی کا دل جتنی بھی دولت حاصل کر لے ''بس'' نہیں کہتا۔ اس کی طمع و ہوس میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اشفاق احمد ''شہر آرزو'' میں اس حالت کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جس کے بھی سامنے سکیورٹی کی بتی جلتی بجھتی رہتی ہے وہ اسی طرح بھاگتا رہتا ہے، لپکتا رہتا ہے۔ امیر علی۔ ایسے آدمی کی کوئی منزل نہیں ہوتی...... وہ یہ نہیں کہتا کہ اب دس ہزار بینک میں جمع کرنے کے بعد

میرا مستقبل محفوظ ہو گیا، اب ایک لاکھ پا لینے کے بعد مجھے کسی چیز کا خوف نہیں بلکہ جوں جوں دولت بڑھتی ہے۔ مستقبل کا خوف اور بھی ہراساں کرتا اور بھی پریشان کرتا ہے۔" (۹۲)

دولت کا بے جا حصول نہ صرف دنیاوی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ دین سے بھی دور کر دیتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے میں اعتدال کا حکم دیا ہے دولت اسی قدر ہونی چاہیے کہ ضروریات زندگی پوری کر سکے اس لیے اس کو زیادہ بڑھانے کی خواہش سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"......مال و دولت اور جاہ اور برتری سے محبت کی وجہ سے بعض اوقات دین میں بھی رخنہ پڑ جاتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے مال کو فائدے کی خاطر بنایا ہے اس لیے مناسب حد تک اس کے حصول کی کوشش جائز ہے لیکن جب ضرورت کے مطابق حاصل ہو جائے تو پھر زیادہ کوشش کرنا چھوڑ دے۔" (۹۳)

موجودہ دور میں ایسے کی بات یہ ہے کہ ہم آنے والی نسلوں کو یہ تعلیم دینے کی بجائے ہوس اور طمع کا ورثہ منتقل کر رہے ہیں۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

"ان بڑوں نے یہی ورثہ اپنے بچوں میں منتقل کیا۔ ہمارے طالب علموں کو بھی یہی بتایا گیا کہ بہت سارے پیسے اور اقتصادی طور پر مضبوط مستقبل ہی خوشی ہے۔ ان مادی خوشیوں کو سمیٹتے سمیٹتے اب حالت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ صورتحال نہایت تکلیف دہ ہو گئی ہے۔" (۹۴)

امیر آدمی تکلیف اور اذیت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے، دولت کی ہوس وبال جان بن جاتی ہے جبکہ غریب آدمی کی زندگی سادگی سے بسر ہوتی ہے۔ وہ صبر و شکر کر کے اللہ سے امید میں رہتا ہے۔ جبکہ امیر کے اندیشے ہی اس سے راتوں کی نیند چھین لینے کے لیے کافی ہوتے ہیں اور غریب آدمی بے فکری کی نیند سوتا ہے۔ اشفاق احمد اس کی وجہ "قدس سرہٗ" میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"غریب آدمی ہر وقت پر امید ہوتا ہے، امیر آدمی امید سے بہت دور ہوتا ہے......سخت ناامید اگر کوئی امیر آدمی ناامیدی کا شکار نہیں ہے تو سمجھ لو وہ ابھی ٹھیک سے امیر نہیں ہوا کیونکہ ناامیدی امارت کی نشانی ہے......اصل امارت ناامیدی کے سہل سے وابستہ ہے جو معاشرہ امیر ہو جاتا ہے وہ ناامیدی کے سمندر میں غرق ہونے لگتا ہے۔ ناامیدی......خوف......اندیشے......نہ ہو سکنے کا ملال۔" (۹۵)

دولت نہ صرف فرد کی ذات سے ملاقات کا سلسلہ توڑ کر رکھ دیتی ہے بلکہ انسان کی عزت کو بھی کم تر کر دیتی ہے۔ دولت کو سنبھالنا اور اس کا استعمال کرنا بھی ہنر کی بات ہے جبکہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا ہے۔ اس کی غیر مساوی تقسیم سے معاشرہ مختلف طبقات میں بٹ جاتا ہے۔ مثلاً ''بندہ زمانہ'' میں مرقوم ہے کہ:

''جد آپ جیسے لوک بے پروا Indifferent ہو جاندے اور مخلوق خدا تے...... بندے نوں بندا نہیں سمجدے اوہنوں وسعت مال کے پیانے تے ناپ دے اور تب جماعت کی شیرازہ بندی کھلن لگ پڑدی اے...... پھیتی پھیتی...... ٹوٹے ٹوٹے ہو جاندا اے سارا معاشرہ۔ جماعت کا رخ نہیں رہندا۔''(۹۶)

جماعت سے الگ ہو کر فرد کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ وہ اپنی پہچان کھو دیتا ہے۔ اور معاشرے کے سفر کی سمت ایک سی نہیں رہتی۔ اس لیے موجودہ دور میں روپے پیسے نے جہاں انسان کی قدر و قیمت کے معیار بدل دیئے ہیں وہاں ایمانداری، خودداری اور شرافت غریب آدمی کے لیے مشکل پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں جیسا کہ اشفاق احمد کے ٹی وی سیریل ''مہمانسرائے'' میں جب ایک بیرا ہاوزی، ولسن جیسے امیر شخص سے ٹپ لینے سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے فن کی عزت چاہتا تو ولسن ناراض ہو جاتا ہے اور دوسرا بیرا یاسین ولسن سے آ کر کہتا ہے کہ:

''میں تو آپ کی دل سے عزت کرتا ہوں لیکن یہ ہاوزی کم بخت ان پڑھ ہے۔ یہ آدمی کو اس کی اصل ویلیو پر لیتا ہے فیس ویلیو پر نہیں...... اسے معلوم نہیں کہ آدمی کی عزت اس کے پیسے اور اس کی حیثیت کی وجہ سے ہونی چاہیے نہ کہ اس کی اصل شرافت کی وجہ سے...... یہ بے وقوف ہے۔''(۹۷)

بیرے ہاوزی کو بے وقوف اس لیے ٹھہرایا جاتا ہے کیونکہ وہ روپیہ پیسہ نہیں بلکہ داد چاہتا ہے۔ عزت چاہتا ہے۔ یہی صورت حال ہمیں اس وقت نظر آتی ہے جب کسی امیر آدمی کے دل میں غریب کی عزت کے جذبات پیدا ہو جائیں اور وہ اپنی رنگ و بو کی محفلوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے رنگوں کی تکریم کرنا شروع کر دے تو لوگ اس کو بھی دیوانہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسی صورتحال ہمیں اشفاق احمد کے ڈرامے ''ایک اور دستک'' میں نظر آتی ہے۔ جب عذرا کو مینٹل ہسپتال میں بھیج دیا جاتا جاتا ہے اور ڈاکٹر اس کے بارے میں کہتا ہے کہ:

''جو شخص اتنے بڑے گھرانے کا فرد ہو کر کلب میں نہ جائے، معزز دوستوں میں نہ گھومے، گندی اور غلیظ

بستیوں میں مارا مارا پھرے۔ وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے...... آپ انہیں بہت جلد مینٹل ہسپتال بھجوا دیجیے۔''(۹۸)

اور عذرا کا شوہر اور گھر والے اسے نہایت ہی دکھی انداز میں اسے مینٹل ہسپتال بھیج دیتے ہیں تا کہ وہ دوبارہ سے سوسائٹی میں Move کرنے کے قابل ہو جاتے اور عذرا کی آواز کو کوئی نہیں سنتا۔ وہ کہتی ہے کہ:

''آپ مجھے اس لیے پاگل سمجھتے ہیں کہ میں نے پارٹیوں میں جانا چھوڑ دیا ہے، کلب جانا ترک کر دیا ہے۔ میں غریبوں سے ملنے لگی ہوں، محتاجوں کی مدد کرنے لگی ہوں، مفلسوں کو اپنانے لگی ہوں۔''(۹۹)

دولت کی فراوانی سے معاشرے میں اندھا دھند روپیہ کمانے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے، جو غریب کی عزت کرتا ہے۔ یا جو غریب عزت نفس کا خیال رکھتا ہے اسے بے وقوف اور دیوانہ سمجھا جاتا ہے۔ دولت کے آنے سے انسان کی سوچ میں تبدیلی بالکل نیچرل ہے۔ اشفاق احمد کے مطابق کیونکہ دولت ایک رسم نہیں بلکہ ایک عمل کا نام ہے۔ وہ ''پڑاؤ۔ تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''اب دیکھئے تین سال بعد یہاں کی معیشت میں بڑا فرق ہو جائے گا۔ دولت ہو جائے گی، گاڑیاں موٹریں بڑھ جائیں گی...... فاصلے سمٹ جائیں گے۔ لوگوں کی طبیعتیں اور مزاج بدل جائیں گے۔ دقیانوسی پن دور ہو جائے گا۔ ماڈرن سوچ آ جائے گی۔ لباس میں بھی تبدیلی ہو گی اب جو سمجھدار بزنس مین ہے۔ وہ سوچ رہا ہے مجھے اس وقت کس طرح سے Hit کرنا ہے اور کہاں ہٹ کرنا ہے۔ جو اچھی طرح سے ہٹ کر جائے گا وہی کامیاب ہو گا۔''(۱۰۰)

کاروبار میں ترقی کے لیے روایات اور معاشرتی اقدار کو ہٹ کرنا ایک بزنس مین کے لیے معمولی بات ہو گی لیکن المیے کی بات تو یہ ہے کہ ملک کی باگ دوڑ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے جو دولت مند ہے اور روپیہ اکٹھے کرنے کے حربوں سے واقف ہے۔ اور اسی بات سے اشفاق احمد کو اختلاف ہے۔ ملک کی معاشی پالیسیاں ایک عام آدمی نہیں بناتا بلکہ آکسفورڈ سے پڑھا ہوا ''ٹائی کون'' ہی بناتا ہے اور جب یہ پالیسی عوام پر آزمائی جاتی ہے تو وہ بلبلا اٹھتا ہے۔ وہ ''پنجاب کا دوپٹہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''مایوسی کی بڑی گھٹائیں، بڑی بے چینیاں ہیں، بڑی پریشانیاں ہیں۔ اکنامکس کا آپ کے یوٹیلٹی بلز کا

ہی اتنا مسئلہ ہو گیا ہے کہ انسان اسی سے ہی باہر نہیں نکلتا۔ آدمی روتا رہتا ہے۔'' (۱۰۱)

اسی معاشی پالیسی جس میں غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ عام آدمی، بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہو کر رہ گیا ہے۔ بجلی، پانی، گیس کے نرخ بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں، روزگار کے مواقع بہت کم ہیں اور مہینے بھر کی محنت کی کمائی آپ کے ہاتھوں میں بعد میں پہنچتی ہے پہلے بل پہنچتے ہیں۔ اشفاق احمد ''زندگی سے پیار کی اجازت درکار ہے'' میں بیان کرتے ہیں کہ:

''یوٹیلٹی بلز جن کے بارے میں روتے پھرتے ہیں یہ آپ تک ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر پہنچ جاتے ہیں لیکن وہ چیک جو آپ کی تنخواہ یا محنت کا پیسہ ہوتا ہے وہ ایک ماہ سے پہلے آپ تک نہیں پہنچتا بعض اوقات تو ایک مہینے سے بھی زیادہ عرصہ لگ جاتا ہے، گینز بک والوں کا کہنا ہے کہ تین بڑے جھوٹوں میں سے ایک جھوٹ یہ بھی ہے کہ ''جی ہم نے آپ کا چیک روانہ کر دیا ہے وہ بس آپ تک پہنچنے ہی والا ہو گا''۔ حالانکہ چیک نہیں پہنچتا۔'' (۱۰۲)

اشفاق احمد کے نزدیک اسلامی معاشرے میں امارت، معاشی ترقی اور عزت کا تصور مختلف ہے۔ ہماری روایات میں انسان کی برتری اس کے اعمال سے منسلک ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے بڑے اس کو ترقی کہتے ہیں جی۔ انسان اندر سے مضبوط ہو، یقین کے ساتھ وابستہ ہو اور احکام کا پابند ہو، وہی ترقی یافتہ ہوتا ہے۔ فرد بھی اور قوم بھی۔'' (۱۰۳)

تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کے ہاں انسان کی اہمیت اس کے مال و دولت سے نہیں بلکہ کردار و اوصاف کی بنا پر ہے۔ ہمارے ہاں مالدار ہونے کا تصور مختلف ہے۔ مالدار وہی ہے جو اللہ کے احکامات کی پیروی کرے۔ اور انسانیت کی خدمت میں جُتا رہے۔ اشفاق احمد اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''دیکھئے ہمارے بڑوں کا تعارف جب بھی کرایا جاتا ہے اور جب بھی ان کی برتری کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ نہیں کہا جاتا کہ حضرت عمرؓ اتنی ملوں کے مالک تھے یا حضرت ابوذر غفاریؓ اتنے ہزار مربعوں کے مالک تھے یا حضرت سلمان فارسیؓ کے اتنے پسٹل کے کارخانے تھے بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے احکام بجا لانے میں یہ قربانی دی۔ انہوں نے محبوب کے اشارے پر سب کچھ قربان کر دیا۔ انہوں نے اپنے

مسلمان بھائی کے لیے جان قربان کر دی۔'' (۱۰۴)

کامیاب انسان وہی ہے جو اللہ کی رضا کو پالے اور اس کے احکامات کی پیروی دل سے کرے، یہی ہماری روایت ہے۔ ہماری زندگی موجودہ دور میں بہت سے مسائل کا شکار ہے اور اس کی وجہ ہم خود ہیں۔ اشفاق احمد ان مسائل سے نکلنے کا راستہ بناتے ہوئے ''توتا کہانی۔ بارھویں کہانی'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جھوٹے Status اور جھوٹے مقام...... یہ جھوٹے حصار ٹوٹ جاتے ہیں...... اپنی کمزوریوں کو سمجھ کر پھر اپنی خواہشات کو چھانٹ کر اور...... اپنے Status کو پہچان کر چلیں تو زندگی اتنی مشکل نہیں ہو گی...... جتنی آپ نے بنا رکھی ہے۔'' (۱۰۵)

انسان کو زندگی میں مصائب کا سامنا اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی اخلاقی اقدار سے رشتہ توڑ کر دور ہو جاتا ہے اور صبر و استقامت کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ یہ رویہ ہمارے اردگرد ہر وقت، ہر جا دیکھنے میں آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم مصائب سے گھبرا کر بجائے صبر کرنے کہ چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں اور انہیں بڑھا چڑھا کر دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر رخ کو منفی انداز میں دیکھتے ہیں اور وہی نفی پلٹ کر ہم تک آتی ہے۔ اشفاق احمد اس رویے کو "Snap shoot" میں اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ:

''بڑا انسان بننے کے لیے انسان کو وہ مثبت پہلو پیش کرنا چاہیے جو اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ ہم میں تھوڑی تھوڑی سی عادت پیدا ہو چکی ہے اب ہمارے ملک کے لوگوں کی، کہ دکھ، تکلیف ناآسودگی کا اظہار بہت زیادہ Exaggeration کے انداز میں بہت مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتے رہتے ہیں۔'' (۱۰۶)

زندہ قومیں شکوہ شکایت، آہ و فریاد، مایوسی، حسرت اور ناامیدی سے مبرا ہوتی ہیں۔ مال و دولت، حکومت و سلطنت ان کے نزدیک بے مایہ چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ کوشش اور محنت سے اپنے مسائل کو حل کرتی ہیں۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''زندہ قومیں اپنے مسائل خود حل کیا کرتی ہیں اپنے دعوے خود پورے کرتی یں۔ اپنی جنت خود بناتی ہیں۔'' (۱۰۷)

موجودہ دور میں کامیابی، قسمت اور خوشی کو دولت سے تعبیر کیا جاتا ہے حالانکہ ہماری روایات اس سے برعکس

ہیں۔اب اپنے قریبی رشتہ داروں سے تعلقات کی بنیاد ہی دولت ہے۔ بصورت دیگر تعلقات کا اختتام ہے۔ جس رشتے سے مالی فائدہ پہنچتا ہو وہ چاہے دور پرے کا ہو عزیز ہو جاتا ہے اور اپنے قریبی رشتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بزرگوں کی عزت اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک ان سے مالی مفاد یا جائیداد کے کاغذات کا تعلق رہتا ہے بزرگوں کا احترام ان کے وجود کی برکت کا تصور تو خود ہو کر رہ گیا ہے اشفاق احمد اسی تصور کو ایک بار پھر ذہنوں میں ابھارنے کے لیے ''آشیانے۔تلقین شاہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ہدایت: بزرگوں کی بڑی برکت ہوتی ہے جی۔

شاہ: پرانے زمانے کیا باتاں نہ کریا کر ہدایت نویں زمانے کی سوچ رکھیا کر......

ہدایت: اس میں نئے اور پرانے کی کیا بات ہے میرے آقا، بزرگ تو بزرگ ہی ہوتے ہیں۔

شاہ: اور او ہناں کا کوئی خاص مادی مادی نئیں ہوندا۔'' (۱۰۸)

بزرگوں کی عزت واحترام کا تصور معاشرے میں ناپید ہوتا جا رہا ہے۔صرف دولت اہم ہے۔اس کا حصول اہم ہے باقی تمام رشتے ناطے، تعلیم، ہنر، احساسات و جذبات ثانوی درجہ اختیار کر گئے ہیں۔اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''اس وقت دنیا نوں امیر ہون کا ہلکا چڑھا دیا اے۔'' (۱۰۹)

امیر شخص کے ہر فعل کو رشک سے دیکھا جاتا ہے۔ بدفعلی، بدزبانی، بدلحاظ ہونے کو اس کی شان اور ناز و انداز سمجھ کر نہ صرف ہنسی خوشی قبول کر لیا جاتا ہے بلکہ سراہا بھی جاتا ہے۔اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''بڑے آدمی کی بے حیائی، بے حیائی نہیں ہوئیا کردی جرأت کہہ لاندی اے۔'' (۱۱۰)

اشفاق احمد معاشرے کی مثبت پیمانے پر تعمیر کے عمل میں مصروف نظر آتے ہیں، وہ ہر ذریعہ سے عوام کو اس بات سے باخبر کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں اور پاکستان کے حصول کا مقصد، باعزت طریقے سے زندگی گزارنا ہے اور اس کی بنیاد دولت پر نہیں ہے بلکہ مساوات اور رواداری کے اصولوں پر ہونی چاہیے۔ قیام پاکستان کے وقت آزادی کے تصور کے ساتھ عزت نفس کی پاسداری بھی وابستہ تھی۔اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''سنو سنو! پاکستان میں آپ کو دودھ کی نہریں نہیں ملیں گی۔ ریشمی لباس نہیں ملیں گے......مگر ایک چیز ضرور ملے گی اور ہر حال میں ملے گی اور بے فکر ہو کر ملے گی اور وہ ہو گی عزت......عزت نفس مان اور

انسان ہونے کے رشتے سے احترام! سنوسنو! پاکستان میں کوئی امیر ہوگا نہ غریب لیکن گھبرانا نہ کوئی گھر والا ہوگا کوئی بے گھر، پریشان نہ ہونا، کوئی عالم فاضل کوئی چٹا ان پڑھ، کوئی گورا کوئی کالا، کوئی مٹیالا پر عزت سب کی برابر ہوگی۔'' (۱۱۱)

ایک ایسا ملک جہاں سب برابر ہیں اور سب کو برابر کے حقوق ملتے ہیں۔ رنگ، نسل، مذہب کی بناء پر تعصب نہ ہو۔ عزت نفس کو سکوں میں نہ تولا جائے۔ امیر اور غریب کا تصور جہاں یکسر مختلف ہو، امیری اور غریبی کے اسی مختلف تصور کی وضاحت اشفاق احمد کے پنجابی ڈرامے ''ٹاہلی تھلے'' میں اس طرح سے ہوتی ہے جب رضیہ نور و کسان یہ پوچھتی ہے کہ آپ اتنی گندم اور فصلیں اگاتے ہیں پھر بھی اس قدر خستہ حال اور غریب کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ تو وہ کچھ اس طرح سے جواب دیتا ہے کہ:

''ویکھیں ناں، جیہدے کول گنتی وچ نانواں تھوڑا ہووے پتر اوہ گریب نئیں ہوندا۔ ساڈے بھانے سے گریب او ہوندا اے جہندے تے ہاسے گنتی وی ہوون تے نانویں دے ہوکے بے انت ہوون۔'' (۱۱۲)

آدمیت کا احترام، انسانیت کی قدریں جیسے اصول وضوابط ہی ہماری روایات کا حصہ ہیں۔ ہمیں اپنے آباء سے یہی تعلیم ملی ہے کہ انسان اہم ہے۔ اللہ کے احکام مقدم ہیں باقی ہر شے ثانوی ہے۔ اشفاق احمد یہی احساس نئی نسل میں بھی منتقل کرنا چاہتے ہیں وہ پہلے وقتوں میں دولت کے استعمال کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یعقوب ہمارے زمانے میں یا تو دولت کاروبار میں لگائی جاتی تھی یا پھر اسے گاگروں میں بند کر کے زمین میں دبا دیتے تھے۔ میری دادی نے میرے سامنے تین گاگریں چاندی اور ایک گاگر سونے کی دبائی تھی۔ دولت یا تو کاروبار میں لگائی جاتی تھی یا چھپا دی جاتی تھی۔ اس طرح دندناتی نہیں پھرتی تھی سڑکوں پر، گھروں میں، بازاروں میں، تکبر کے کام نہیں آتی تھی۔ دوسروں کو ڈرانے اور ان کی عزت نفس ختم کرنے کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی۔'' (۱۱۳)

اشفاق احمد ملک کی معیشت کو مضبوط بنیادوں پر قائم دیکھنا چاہتے ہیں نہ کہ Status Symbol کے طور پر، قوم کو تباہ کرنے کی طرف کی لے جائے۔ ایک مسلم قوم کو اس کی اصل پہچان سے متعارف کرواتے ہوئے ''برگ آرزو'' میں

بیان کرتے ہیں کہ:

''خدا کا شکر کرو کہ تم ایک لالچی قوم نہیں۔ دولت سے محبت کرنے والی، زر کی پجاری نہیں ہو۔'' (۱۱۴)

اشفاق احمد پاکستان کی سالمیت اور بین الاقوامی امن و امان اور انسانیت کی بقا اور فلاح کے لیے وہ تمام اصول جو امت مسلمہ کی پہچان ہوا کرتے تھے۔ ان کو یاد دلاتے ہیں اور موجودہ دور میں ان کے صحیح استعمال کے طریقے بتاتے ہیں کہ ملکی استحکام کے لیے فرد کی استقامت اور نظریات کا واضح ہونا بڑا ضروری ہے۔ دوسری صورت میں اگر یوں ان دیکھی دوڑ میں یونہی شامل ہوتے رہے تو ملک کی سالمیت کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے اپنے آپ کو بحیثیت قوم محفوظ رکھنے کے لیے ہمیں اپنی روایات سے رشتہ جوڑ کر انہی اقدار کو اپنانا ہوگا جو ہمارے مذہب، روایات اور اخلاقیات میں موجود ہیں۔

و۔ انفرادی اخلاقیات

اشفاق احمد انسان کو نہ صرف اجتماعی صورت میں خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ وہ اس کی فطرت ذات اور شخصیت میں بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور فرد کو اس کی انفرادی حیثیت میں بھی ہر آزمائش سے گزار کر بہتر نتیجے سے فیض یاب ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انسانی فطرت کے سبھی حقائق قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہیں کہ انسان جس مٹی سے گوندھا گیا ہے اس کے کیا اجزا ہیں۔ اشفاق احمد ''حیرت کدہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ازل سے انسان کی فطرت کچھ اس طرح کی ہے راشدہ کہ وہ برائی کے متعلق ہمیشہ متجسس رہتا ہے۔ کبھی اسے اختیار کرنے کے لیے بے چین کبھی اسے دور کرنے کے لیے بیقرار، آدمی کیسا بھی نیک کیوں نہ ہو اس کی توجہ برائی پر مرکوز رہتی ہے۔ کبھی مثبت کبھی منفی۔'' (۱۱۵)

اشفاق احمد کے مطابق انسان کا بدی کی طرف مائل ہونا فطری بات ہے، گناہ کی کشش اسے اپنی طرف کھینچے ہی جاتی ہے۔ گناہ کی لذت سے نظر پھیرنا یا اپنے آپ کو دور رکھنا انسان کے لیے ناممکن ہے۔ وہ اس بارے میں ''روح کی سرگوشی'' میں لکھتے ہیں کہ:

''شیطان کا ایک باقاعدہ ضابطہ اخلاق ہے اور ایک پورا فلسفہ ہے جس کو وہ ہر اس شخص پر بڑی وضاحت اور صداقت کے ساتھ کھولتا ہے جو اس کے قریب آتا ہے۔ ابلیس ''فرماتا'' ہے کہ یہ ساری تخلیق بدی ہے۔

انسان برائی اور بدی کا پابند ہے اور برائی بھی خدا ہی کی پیدا کردہ ہے اور اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) یہ چاہتا ہے کہ انسان بدی میں مبتلا ہو۔ ذلیل وخوار ہو۔ پگ پگ کی ٹھوکریں کھائے......شیطان کا فلسفہ ہے کہ گناہ کو چھوڑنا ناممکن ہے اس لیے لذت کو چھوڑنا ناممکن ہے۔ لذت فطرت ثانیہ ہے۔ حصول لذت فطرت انسانی ہے۔'' (۱۱۶)

انسان جب لذت میں گم ہو جاتا ہے تو تباہی اس کا مقدر بن جاتی ہے کیونکہ لذت اور خوشی میں فرق ہے اور انسان کی کیمسٹری میں ''لذت'' سے وابستگی عارضی ہو سکتی ہے زیادہ دیر تک وہ لذت کی برداشت نہیں کر سکتا۔ اشفاق احمد لذت اور خوشی کا فرق کا بیان کرتے ہوئے ''صاحب الصیف Warrior'' میں لکھتے ہیں کہ:

''لذتیں وقتی اور ہنگامی ہوتی ہیں لیکن مسرتیں، شادمانیاں مستقل ہوتی ہیں۔ لذتوں کا جسم سے تعلق ہوتا اور خوشیوں کا روح سے شادمانی نفس اور وجود سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ یہ نفس سے جنگ کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ نفس سے جنگ روح کو خوشی عطا کرتی ہے جبکہ خواہشات کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے جسمانی لذتیں میسر آتی ہیں، روح کو بالیدگی نہیں ملتی۔'' (۱۱۷)

جسم اور روح کا رشتہ، سانس اور زندگی کی طرح ہی ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہ رہے یا مضطرب ہو تو انسانی زندگی کا نظام خراب ہو جاتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور وہ اس کی زندگی اور اس کے راستوں کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ اشفاق احمد ''سگنل اور سنگل بیڈ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جس وقت خدا نے مرد کا گیلا پتلا بنا کر اس میں اپنی روح پھونکی...... اور اس کا نام آدم رکھا تو اسے فرشتوں سے سجدہ کروایا...... خدا کو اپنی تخلیق سے ویسا ہی پیار ہے جیسے مصور کو اپنی تصویر سے ہوتا ہے...... شاعر کو اپنی نظم سے...... گلوکار کو اپنے سر سے۔'' (۱۱۸)

انسان کی سرشت میں گناہ شامل ہے اور وہ اس کی طرف مائل بھی رہتا ہے لیکن حضرت انسان جسے فرشتوں سے سجدہ کروایا گیا اور اشرف المخلوقات ہونے کا شرف بھی بخشا وہ برائیوں سے دھنسا نہیں رہتا بلکہ ان کا مقابلہ کر کے اوپر ابھرتا ہے۔ پھر اس کے لیے دنیا اور آخرت میں کسی مشکل کا سامنا نہیں ہوتا اور وہ ہر مشکل وقت سے آسانی سے گزر جاتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''جس کا نفس مطمئن ہے اس کے لیے راستے کھلے ہی کھلے ہیں۔'' (۱۱۹)

کامیاب زندگی کے لیے نفس کا پر باش ہونا ضروری ہے جو صرف روح کی بالیدگی سے ہی ممکن ہوسکتا ہے کیونکہ جسمانی آرام و آسائش روح کے اضطراب کے سامنے بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انسان کی زندگی پھولوں کا بستر نہیں ہے لیکن پر خار راہوں کو گلزار کرنے کا ہنر قدرت نے حضرت انسان کو بخشا ہے۔ اور نیکی اور بدی، خیر اور شر میں امتیاز کرنا ہی اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے۔ اشفاق احمد کامیاب ہونے کے اصل معنی سے آگاہ کرنے کے لیے لکھتے ہیں کہ:

''جن لوگوں نے بہت سے پیسے اکٹھے کر کے اپنی زندگیاں بنائیں پھر ان پر بدعنوانی کے مقدمات چلے اور پھر ان کی گردنیں ناپی گئیں۔ کامیاب ہونا اور چیز ہے اور زندگی سے وابستہ رہنا الگ چیز ہے۔ بے شک بچوں کو ہم استاد یہی کہتے ہیں کہ عذاب میں مبتلا ہوئے بغیر کامیابی ممکن نہیں لیکن آج میں آپ لوگوں کے سامنے اپنا دل کھول کے لایا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کامیاب بھی ہوں اور میری زندگی خوشگوار اور ضمیر مطمئن ہو۔ صرف کامیابی ہی کامیابی نہ ہو۔ ترقی اور فلاح میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔ ترقی فلاح نہیں ہے۔ فلاح کے اندر ترقی موجود ہے خالی ترقی آپ کا ساتھ نہیں دے گی۔'' (۱۲۰)

اشفاق احمد انسان کی بقا کے لیے اس کی تربیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کے ہاں تعلیم و تربیت کے وہ معیار نہیں ہیں جو عام نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں شازیہ صدف لکھتی ہیں کہ:

''وہ محض ڈگریوں کے حصول کو علم نہیں گردانتے بلکہ ایسی تعلیم کے خواہاں ہیں جس میں تربیت کو جزو لازم سمجھتے ہوئے اس پر خصوصی توجہ دی جائے تا کہ وہ انسان کے باطن کو سنوار دے وگرنہ محض ڈگریوں کا ڈھول پیٹنے والے ملک وقوم کے لیے مفید اور موثر نہیں ہو سکتے...... اگر علم ضبط وتوازن سے محروم ہے تو مادی زندگی میں کامیابی کی ضمانت ہوسکتا ہے لیکن حقیقی راحت اور ذہنی و قلبی سکون کا ضامن ہرگز نہیں ہوسکتا۔'' (۱۲۱)

اشفاق احمد حقیقی کامیابی اور ذہنی و روحانی راحت وسکون کے لیے ایک ترکیب بتاتے ہیں جسے استعمال کر کے ہم دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ اشفاق احمد ''ڈیپریشن کا نشہ'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''ہمیں روحانیت کی رسی تھام کر مادیت کی زمین کے اوپر چلنے کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن رسی وہی تھامنی پڑے گی۔ اسی میں نجات ہے۔'' (۱۲۲)

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ صحیح راستے پر چلتے ہی سب اچھا ہو جاتا ہے بلکہ اچھا بنانا پڑتا ہے۔ دنیا سے قطع تعلق ہو کر، حالات سے نظر پھیر کر نہیں بلکہ دنیا میں رہ کر، دنیا جیسے ہو کر ہی ہم اللہ کی رضا کو پا سکتے ہیں۔ اشفاق احمد مومن کی پہچان بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مومن وہ نہیں ہوتا کہ ٹھوکر ہی نہ کھائے۔ مومن وہ ہوتا ہے کہ ٹھوکر کھائے تو ترنت اپنی جگہ پر قائم ہو جائے۔'' (۱۲۳)

اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے انسان غلطیاں بھی کرتا ہے۔ ناکام بھی ہوتا ہے۔ گرتا بھی ہے، ٹھوکر بھی کھاتا ہے لیکن مومن کی شان یہی ہے کہ وہ گر کر سنبھل جائے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھے کیونکہ اسی میں اس کی نجات بھی مضمر ہے اور اسی سے زندگی میں بہار آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''جب توجہ غیر اللہ سے ہٹ کر اللہ پر مرکوز ہو جاتی ہے تو پھر بہاریں آ جاتی ہیں۔'' (۱۲۴)

کیونکہ جہاں انسان اپنے منصب سے ہٹتا ہے وہیں ٹھوکر کھا کر گرتا ہے اگر توبہ کرتا ہے تو واپس اسی شان سے اپنے منصب کو پہنچ جاتا ہے۔ ورنہ زندگی دوزخ کی طرف سفر شروع کر دیتی ہے۔ اللہ کو راضی کرنے سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ زندگی کی ہر مسرت سے کنارہ کش ہو جاؤ اور ان دیکھے سفر کی طرف چلنا شروع کر دو جس کی منزل کا کچھ پتہ نہیں ہے بلکہ اگر صاف نیتی سے سیدھے راستے کو اختیار کیا جائے تو منزل جلد مل جاتی ہے۔ ہر مراد بر آتی ہے۔ لیکن شرط دل کا صاف ہونا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اگر دل میں چور نہ ہو آدمی جلدی منزل طے کر لیتا ہے۔'' (۱۲۵)

اشفاق احمد کے نزدیک انفرادی طور پر انسان کو خوشی اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے صرف اللہ کی ذات کو سامنے رکھنا چاہیے اور اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی بہ نسبت زیادہ اہمیت دینا شروع کر دیتے ہیں اور ان کے سامنے اپنی وضاحتیں پیش کرتے ہیں تو ناکام ہو جاتے ہیں۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''دیکھو بھئی آپ لوگوں کو کامیابی کا کوئی خاص فارمولا تو نہیں دے سکتا البتہ ناکامی کا ایک طریقہ ضرور بتا سکتا ہوں۔ آپ زندگی میں ہر شخص کو خوش کرنا شروع کر دیں۔'' (۱۲۶)

ہم نے دنیاوی کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایسی عادت کو اپنا رکھا ہے جو شرعاً، مذہباً اور اخلاقاً درست نہیں ہے،

ہم اللہ کو خوش کرنے کی بجائے غیراللہ کی طرف توجہ رکھتے ہیں۔ اشفاق احمد اپنے ٹی وی سیریل مہمان سرائے میں ایک کامیاب شخص کے مکالمات لکھتے ہیں کہ:

''یہ میرا اصول ہے کرنل صاحب، ذاتی اصول......اگر آدمی بے وقوف ہوتو اس کی خوشامد کرو......اور اگر شیخی خورہ ہے تو پھر اس کی خوشامد کرو......دنیا کی تاریخ میں خوشامد کا وار کبھی خالی نہیں گیا۔''(۱۲۷)

اکثر اوقات ہم دوسروں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ ان کی خوشامد کرتے ہیں ان سے کوئی نہ کوئی فائدہ وابستہ کر لیتے ہیں۔ جو اخلاقی تقاضوں کے منافی ہے۔ اشفاق احمد کے نزدیک اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ اچھی بات یا نیکی نتیجہ بھی اچھا ہونا چاہیے۔ اسی صورت میں انفرادی اور معاشرتی تعلق میں ہم آہنگی ہو سکے گی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک آدمی اچھی بات کرے یا کام کرے لیکن اس کا نتیجہ برا ہو۔'' (۱۲۸)

نیکی، خیر اور اچھائی بھی اس صورت میں سرزد ہوتی ہے جب باطن میں اس کو ادا کرنے کی چاہ موجود ہو، ورنہ ایک اچھا فعل جو بدنیتی سے یا خودنمائی یا دوسروں کو ذلیل ورسوا کرنے کے لیے کیا جائے۔ اپنا صلہ کھو دیتا ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے افراد اس مرض میں مبتلا ہیں جو نیکیاں محض دکھاوے کے لیے کرتے ہیں۔ اشفاق احمد انسان کی فطرت میں شامل سبھی خوبیوں اور خرابیوں سے واقف نظر آتے ہیں، اس بارے میں شازیہ صدف لکھتی ہیں کہ:

''وہ انسانی نفسیات کا گہرا شعور رکھتے تھے اور انسان کے خوشی وغم، محبت ونفرت، فتح وشکست، غصہ وحسد، دوستی ودشمنی کے مواقع پر عمل اور ردعمل کی کیفیات سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔''(۱۲۹)

اشفاق احمد انسان کی نفسیات پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ انسان کی شخصیت بنانے میں وراثت اور ماحول اثر انداز ہوتے ہیں، لیکن سب سے زیادہ انسان پر اثر انداز محبتیں ہوتی ہیں وہ ''معدن محبت'' میں لکھتے ہیں کہ:

''انسان کی پرسنلٹی پر سب سے زیادہ محبتیں اثر انداز ہوتی ہیں جو وہ خود کرتا ہے...... جب کوئی اپاہج اپنے زور پر چلنے لگتا ہے تو غور سے سٹڈی کریں اس شخص کی تبدیلی کی ذمہ داری......نہیں، ماحول نہیں اس کی وہ محبت ہے جو اس کے دل سے پھوٹتی ہے اور اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔''(۱۳۰)

محبت کا جذبہ وہ طاقت رکھتا ہے جو انسان کی ذات کو اندر اور باہر سے تبدیل کر دیتا ہے۔ محبت کرنے اور دینے سے نہ صرف رروحانی اور باطنی طور پر سکون اور سرشاری ہوتی ہے بلکہ ظاہری طور پر بول چال اور رویوں میں بھی مٹھاس اور شیرینی

بھر جاتی ہے اور اردگرد کے ماحول سے کثافت دور ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس کہ آج انسان کا بیشتر وقت دوسروں سے کیڑے نکالنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ خود احتسابی اور خوشناسی کی بجائے خودفریبی اور خودستائشی میں مبتلا دکھائی دیتا ہے جس سے اس کے بدن اور روح آزار میں رہتے ہیں۔ یہ سیدھی راہ پر چلنے والوں کا وطیرہ نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

''دوسروں کو ٹھیک کرتے رہنا، ان میں کیڑے نکالنا یا لوگوں کو سیدھی راہ دکھانے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان اپنی سمت درست کر لے۔ اپنے ارادے کا صحیح استعمال جان لے...... اپنی Will کو ایک چوکھٹ پر جھکانا سیکھ لے...... دوسروں کی ایگو سے ایگو ٹھہرانا بند کر دے۔'' (۱۳۱)

انسان اپنی سمت درست کر کے، اپنے نفس پر قابو پا کر، اپنے ارادے کو جان، اپنی صلاحیتوں کا تعین کر کے ہی بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہوسکتا ہے۔ خود اپنے بجائے دوسروں کو جانتے رہنے کی جستجو نے انسان کو عجیب گھن چکر میں ڈال رکھا ہے، دوسروں کی فکر میں اپنے آپ گھلانے کی بجائے اپنی فکر اور اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیے۔ دوسروں سے فائدہ لینے کے لیے ان کو خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی ہم اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ خود کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ ''زاویہ۔۳'' میں اشفاق احمد ایک صوفی منش انسان کے بارے بتاتے ہیں جو ایک تھانیدار تھا۔ اشفاق احمد ان کے گھر میں جا کر یوں محسوس کرتے ہیں گویا جنت میں آ گئے ہوں اس قدر پرسکون روحانی فضا، گھر کے تمام افراد آپس میں پیار، محبت اور خلوص کے رشتے میں بندھے ہوئے، کوئی فرسٹریشن، لڑائی جھگڑا، بے چینی اور اضطراب نہ پا کر اشفاق احمد نے اسی تھانیدار سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ:

''ایک سٹیج پر میں نے محسوس کیا کہ میری نیکی، میری خوبی، میرا تقویٰ یہ سارے کا سارا لوگوں کو خوش کرنے کے لیے وقف تھا کہ لوگ کہیں یہ کیسا کمال کا تھانیدار ہے۔ میں ایک خوفزدہ شخص تھا جو لوگوں کے ڈر سے نیک بنا ہوا تھا (یہ ذرا سی باریک بات میں بھی دیر سے سمجھا تھا) میں نے پھر یہ کوشش کی ''میں بندوں کا ڈر دل سے نکال دوں اور میں اپنے آپ اللہ کو خوش کرنے کے لیے کچھ کروں۔'' (۱۳۲)

انسان جب باطن کی جانب سفر کرتا ہے تو اپنی ذات سے آشنا ہونے لگتا ہے اور جب خود کو سمجھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس رب سے بھی آشنائی کی منزلیں طے ہونے لگتی ہیں کیونکہ پل بھر یہ واردات نہیں ہوتی آزمائشوں کے کئی کٹھن مراحل آتے ہیں لیکن جو آخر تک وفادار رہتا ہے وہی سرخرو ہوتا ہے۔ پس کیسے بھی حالات ہوں انسان کو اللہ کی جانب دھیان

رکھنا چاہیے اس میں اس کی انفرادی افزائش کے ذرائع ملیں گے۔اس سلسلے میں اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''ڈھونڈنے والے کو یہی لازم ہے کہ گھر کیسی بھی سختی ہو، کیسی بھی ذلت وخواری پیش آئے لیکن ہر حال میں خدا کی طرف رجوع کرے اور اسی کے فضل کو پکارتا رہے۔'' (۱۳۳)

اور یہی انسان کی انفرادی فلاح اور اجتماعی ترقی کا گر بھی ہے کہ وہ اپنے خالق سے اپنا رشتہ استوار رکھے اور خود کو اس کی رضا کے تابع کر دے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں گے تو تب ہی ہم آزمائشوں کے بڑے دریا پار کر سکیں گے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم مثبت باتوں کو اپنائیں، خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی مثبت انداز میں سوچیں تاکہ مثبت سوچ کے خوش رنگ بکھیر سکیں اور یہی اشفاق احمد کی ساری تعلیم و تربیت اور فلسفے کا نچوڑ ہے کہ اپنی توجہ اللہ کی طرف رکھیں اور آسانیاں تقسیم کرتے ہوئے انسانی فلاح کے لیے راستے ہموار کریں۔ اپنے اخلاق کو سنواریں اور اسے بہتر بنائیں کیونکہ جہاں اللہ تعالیٰ سے محبت کا تصور نہیں وہاں زندگی کا تصور نہیں ہے۔ اس لیے اپنے اندر عاجزی، بردباری، حلم، برداشت اور محبت کو جگہ دیں اور اپنی ایگو سے بھڑنا بند کر کے خدا کی طرف رجوع کرے اور اسی کی رحمتوں کے طلب گار ہوں۔ پھر ہر طرف بہاریں ہی بہاریں ہوں گی۔

حواشی

۱۔ فدا کا کردار ''ایک کردار ایک کہانی'' لاہور، برائٹ بکس، اردو بازار، ۲۰۰۵ء، ص ۴۳

۲۔ عالم حسین ''اداس داستان سرائے'' مشمولہ ''زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا'' مرتبہ، اعزاز احمد آزار، لاہور، خالد بک ڈپو، ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۴

۳۔ بحوالہ علی سفیان آفاقی ''ملاقات'' مشمولہ: باتوں سے خوشبو آئے، لاہور، زاویہ پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۳

۴۔ آغا سہیل، ڈاکٹر، اشفاق احمد ''بے مثال داستان گو'' مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف، اشفاق نمبر، جلد ۷۰، شمارہ نمبر ۵، لاہور، مکتبہ جدید پریس، ۲۰۰۵ء، ص ۱۸

۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''اشفاق احمد بے مثال داستان گو'' مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف، اشفاق نمبر، لاہور، مکتبہ جدید پریس، مئی ۲۰۰۵ء، ص ۲۱۶

۶۔ طاہر مسعود، ڈاکٹر، ''اشفاق احمد حیات سے موت تک'' مشمولہ ماہنامہ ادب لطیف، اشفاق نمبر، لاہور، مکتبہ جدید پریس، مئی ۲۰۰۵ء، ص ۳۷۱

۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''اشفاق احمد۔ فکر و فن'' مشمولہ: ''اردو افسانہ۔ تحقیق و تنقید'' ملتان، بیکن ہاؤس گل گشت، ۱۹۸۸ء، ص ۴۸۴

۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''تخلیقی عمل'' لاہور مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۳ء، ص ۲۰۶

۹۔ طیبہ رباب، سیدہ، ''مادیت، مذہب اور من چلے کا سودا'' مشمولہ ''فنون'' لاہور، مزنگ روڈ، ستمبر۔ دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۹

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، ''ادیب کے فرائض'' مشمولہ ''نقوش'' عصری ادب نمبر شمارہ ۱۱۹، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۲ء، ص ۲۵۸

۱۱۔ بحوالہ، وحید قریشی، ڈاکٹر، ''اردو نثر کے میلانات'' لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۶ء، ص ۲۳

۱۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''اشفاق احمد۔ فکر و فن'' مشمولہ ''اردو افسانہ۔ تحقیق و تنقید'' ملتان بیکن ہاؤس، ۱۹۸۸ء، ص ۴۷۹

۱۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ''ادب اور ادب کی افادیت'' کراچی، اختر کتاب گھر اردو بازار، جولائی ۱۹۹۶ء، ص ۱۰

۱۴۔ ممتاز مفتی، ''داستان گو'' مشمولہ ''اور اوکھے لوگ'' لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۴

۱۵۔ میرزا ادیب، ''۵۷ کی ادبی نگارشات کا جائزہ'' مشمولہ ادب لطیف، سالنامہ ۱۹۵۸ء، ص ۴۹

۱۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''ادب و فن'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، جون ۱۹۸۷ء، ص ۲۹۔۲۸

۱۷۔ شاہین مفتی، ڈاکٹر، مور بے مایہ'' مشمولہ ''فنون'' لاہور، مزنگ روڈ، ستمبر۔دسمبر۔۲۰۰۴ء، ص ۲۶

۱۸۔ عطاءالحق قاسمی، ''بلبل ہزار داستان'' مشمولہ اردو کا آخری داستان گو، لاہور، حیدر پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۰۱

۱۹۔ انتظار حسین، ''ملاقاتیں'' لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۸ء، ص ۵۱۔۵۰

۲۰۔ حمید احمد خان، پروفیسر، ''تعلیم وتہذیب۔مجموعہ خطبات ومقالات'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء، ص ۳۳۰

۲۱۔ عطاءالحق قاسمی ''بلبل ہزار داستان'' مشمولہ: اردو کا آخری داستان گو''، ص ۱۰۳

۲۲۔ اشفاق احمد، ''تصوف'' مشمولہ ''بابا صاحبا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۵۱۷

۲۳۔ اشفاق احمد، ''سائیں، مذہب اور کھوج'' مشمولہ ''زاویہ ۳''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۲۳۶

۲۴۔ اشفاق احمد، ''لائٹ ہاؤس'' مشمولہ ''زاویہ۔۳''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷

۲۵۔ اشفاق احمد، ''سردی اور سارؤ'' مشمولہ ''اور ڈرامے'' لاہور، سنگ میل، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۰

۲۶۔ اشفاق احمد، '''' ناتے دار'' مشمولہ ''بندگلی۔ڈرامے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۲۷

۲۷۔ اشفاق احمد، ''مایا اور مون سون'' مشمولہ: ''اور ڈرامے''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء، ص ۳۶۶

۲۸۔ اشفاق احمد، ''مذہب'' مشمولہ ''بابا صاحبا''، ص ۴۴۰

۲۹۔ اشفاق احمد، ''EVIL مذہب'' مشمولہ ''بابا صاحبا'' ص ۴۵۳

۳۰۔ اشفاق احمد، ''عارف اور سکندر'' مشمولہ ''اور ڈرامے''، ص ۴۲۳

۳۱۔ اشفاق احمد، ''آخری بات'' مشمولہ: ''اور ڈرامے''، ص ۱۱۵۱

۳۲۔ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۶

۳۳۔ اشفاق احمد، ''روح کی سرگوشی'' مشمولہ ''زاویہ۔۲''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۳۰۶

۳۴۔ اشفاق احمد، ''توتا کہانی۔گیارہویں کہانی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء، ص ۳۱۶

۳۵۔ اشفاق احمد، ''شورا شوری۔تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۹۶

۳۶۔ اشفاق احمد، ''شورا شوری۔تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۹۶

۳۷۔ اشفاق احمد، ''شورا شوری۔تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۹

۳۸۔ اشفاق احمد، ''ڈھنڈورا۔تلقین شاہ'' لاہور، سنگ میل،۲۰۰۴ء،ص ۲۹۴

۳۹۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ''اردونثر'' مشمولہ: ''جدید اردوادبیات'' کراچی، خضرا کیڈمی پاکستان، ۱۹۸۹ء،ص ۲۰

۴۰۔ ممتاز مفتی، ''اوراوکھے لوگ'' لاہور، فیروزسنز، ۱۹۹۱ء،ص ۱۲۱

۴۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''اشفاق احمد۔فکروفن'' مشمولہ: ''اردوافسانہ۔تحقیق وتنقید'' ملتان، بیکن ہاؤس،گل گشت، ۱۹۸۸ء،ص ۴۸۲

۴۲۔ ماہنامہ، ''ٹی وی ٹمپو'' ، کراچی : جولائی ۱۹۸۶ء،ص ۲۵

۴۳۔ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ۲۶۲

۴۴۔ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ۲۴۳

۴۵۔ طارق اسماعیل ساگر، ''باتیں ان کی یادرہیں گی'' مشمولہ ''ادب لطیف۔اشفاق نمبر'' لاہور، مکتبہ جدید پریس، ۲۰۰۵ء،ص ۳۷۰

۴۶۔ اشفاق احمد، ''کھٹیا ویٹا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء،ص ۳۰

۴۷۔ اشفاق احمد، ''شاہلاکوٹ۔تلقین شاہ'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء،ص ۲۷۸

۴۸۔ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا'' ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء،ص ۳۱

۴۹۔ اشفاق احمد، ''شاہلاکوٹ۔تلقین شاہ'' ،ص ۱۴۴

۵۰۔ اشفاق احمد، ''سفر درسفر'' لاہور، غالب پبلشرز، ۱۹۸۱ء،ص ۹۲

۵۱۔ اشفاق احمد، ''حیرت کدہ'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء،ص ۵۸

۵۲۔ اشفاق احمد، ''باباصاحبا'' ،ص ۳۸۱

۵۳۔ راقمہ سے ملاقات،

۵۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر ''گمشدہ لوک دانش کا کھوجی'' مشمولہ: ''اردو کا آخری داستان گو'' ، ص ۹۶

۵۵۔ عطاء الرحمٰن، پروفیسر، ''اردو کا آخری داستان گو'' ،ص ۸۰

۵۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اِک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا'' ، مشمولہ: ''اردو کا آخری داستان گو'' ،ص ۹۸

۵۷۔ عطاء الرحمٰن، ڈاکٹر، ''اردو کا آخری داستان گو'' ،ص ۸۲

۵۸۔ ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر، ''تصوف اور معاشرتی ترقی کے امکانات'' ، مشمولہ: ''تصوف۔ ہرانسان کی ضرورت'' ،

لاہور،تخلیقات علی پلازہ،۲۰۱۰ء،ص ۵۹

۵۹۔ اشفاق احمد،''تحائف''مشمولہ:''زاویہ۔۲''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،ص۳۰۳

۶۰۔ شمیم حسین قادری،سید،''اسلامی ریاست قرآن وسنت کی روشنی میں''لاہور،شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف پنجاب،جون۱۹۸۴ء،ص ۴۸

۶۱۔ پریشان خٹک، پروفیسر''معاشرے کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ، مقالات'' کل پاکستان اہل قلم کانفرنس، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۸۹ء،ص ۳۳۹

۶۲۔ اشفاق احمد،''ترقی''مشمولہ''بابا صاحبا''،ص۵۴۴

۶۳۔ اشفاق احمد،''قوم/معاشرہ''مشمولہ''بابا صاحبا''،ص۶۳۴

۶۴۔ اشفاق احمد،''گلدان۔تلقین شاہ''لاہور،سنگ میل،۲۰۰۱ء،ص ۵۸

۶۵۔ اشفاق احمد،''ڈھنڈورا۔تلقین شاہ''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء،ص۱۴۳

۶۶۔ اشفاق احمد،''زنجیر تعلق۔تلقین شاہ''لاہور،سنگ میل،۲۰۰۸ء،ص۳۵۴

۶۷۔ اشفاق احمد،''دھینگا مشتی۔تلقین شاہ''لاہور،سنگ میل،۲۰۰۴ء،ص۱۲

۶۸۔ اشفاق احمد،''کھیل تماشا''لاہور،سنگ میل،۲۰۰۰ء،ص ۱۸۷

۶۹۔ اشفاق احمد،''دھینگا مشتی۔تلقین شاہ''،ص ۱۵۔۱۴

۷۰۔ اشفاق احمد،''ڈمی سٹی''مشمولہ''بند گلی''، لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء،ص۴۷۳

۷۱۔ اشفاق احمد،''بندہ زمانہ۔تلقین شاہ''لاہور سنگ میل، ۲۰۰۷ء،ص ۲۱۹

۷۲۔ اشفاق احمد،''جنگ بجنگ۔تلقین شاہ''لاہور،سنگ میل، ۲۸۹

۷۳۔ اشفاق احمد،''تسلیم ورضا کے بندے''،مشمولہ:''زاویہ۔۲''ص ۲۶۷

۷۴۔ اشفاق احمد،''جنگ بجنگ۔تلقین شاہ''لاہور،سنگ میل،۲۰۰۱ء،ص ۲۲۵

۷۵۔ اشفاق احمد،''اُچے برج لاہور دے''، لاہور،عزیز پبلی کیشنز،۱۹۹۳ء،ص۳۲۲

۷۶۔ شمس العلماء،مولانا،محمد ذکاءاللہ،''محاسن اخلاق'' مرتبہ احمد رضا، لاہور،مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء،ص۱۵۲

۷۷۔ اشفاق احمد،''اُچے برج لاہور دے''،ص ۲۷

۷۸۔ اشفاق احمد، ''آسودگی۔تلقین شاہ''، لاہور سنگ میل، ۲۰۰۷ء،ص ۲۴۲

۷۹۔ اشفاق احمد، ''حسرتِ تعمیر۔تلقین شاہ'' لاہور سنگ میل، ۲۰۰۱ء،ص ۲۰۰

۸۰۔ اشفاق احمد، ''اُچے برج لاہور دے''،ص ۳۲۴

۸۱۔ اشفاق احمد، ''زنجیر تعلق۔تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء،ص ۲۶۵

۸۲۔ اشفاق احمد، ''حسرت تعمیر۔تلقین شاہ'' لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۱ء،ص ۱۷۸

۸۳۔ اشفاق احمد، ''بانسری'' مشمولہ ''زاویہ۔۲''،ص ۲۰۸

۸۴۔ اشفاق احمد، ''پڑاوَ۔تلقین شاہ'' لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۷ء،ص ۱۸۳

۸۵۔ اشفاق احمد، ''دھرتی کے رشتے''، مشمولہ: ''زاویہ۔۲''،ص ۳۱۸

۸۶۔ اشفاق احمد، ''پڑاوَ۔تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۷ء،ص ۱۵۹

۸۷۔ اشفاق احمد، ''بندہ زمانہ۔تلقین شاہ'' لاہور سنگ میل، ۲۰۰۷ء،ص ۲۱۹

۸۸۔ اشفاق احمد، ''زنجیر تعلق۔تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء،ص ۲۰۰

۸۹۔ اشفاق احمد، ''دولت'' مشمولہ ''بابا صاحبا''،ص ۵۹۵

۹۰۔ اشفاق احمد، ''آسودگی۔تلقین شاہ''، ۲۰۰۷ء،ص ۱۴۱

۹۱۔ اشفاق احمد، ''شوراشوری۔تلقین شاہ''، ۲۰۰۵ء،ص ۹۴

۹۲۔ اشفاق احمد، ''شہر آرزو''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء،ص ۱۹۱

۹۳۔ اشفاق احمد، ''ملفوظات، ارشادات'' مشمولہ بابا صاحبا، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۸ء،ص ۶۱۸

۹۴۔ اشفاق احمد، ''زندگی سے پیار کی اجازت درکار ہے'' مشمولہ: ''زاویہ۔۲''،ص ۱۷۵

۹۵۔ اشفاق احمد، ''قدس سرہٗ'' مشمولہ ''بابا صاحبا''، ۲۰۰۸ء،ص ۴۷۶

۹۶۔ اشفاق احمد، ''بندہَ زمانہ۔تلقین شاہ'' لاہور سنگ میل، ۲۰۰۷ء،ص ۲۱۸

۹۷۔ اشفاق احمد، ''مہمان سرائے''، مشہور زمانہ ٹی وی سیریل ''کارواں سرائے''، لاہور، سنگ میل، ۱۹۹۶ء،ص ۶۳

۹۸۔ اشفاق احمد، ''ایک اور دستک'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء،ص ۱۶۳

۹۹۔ اشفاق احمد، ''ایک اور دستک'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۶۳

۱۰۰۔ اشفاق احمد، ''پڑاؤ۔ تلقین شاہ''، ۲۰۰۷ء، ص ۱۹۴

۱۰۱۔ اشفاق احمد، ''پنجاب کا دوپٹہ'' مشمولہ ''زاویہ۔۲'' ص ۱۲

۱۰۲۔ اشفاق احمد، ''زندگی سے پیار کی اجازت درکار ہے'' مشمولہ ''زاویہ۔۲'' ص ۱۷۸

۱۰۳۔ اشفاق احمد، ''زنجیر تعلق۔ تلقین شاہ'' ص ۲۶۱

۱۰۴۔ اشفاق احمد، ''زنجیر تعلق۔ تلقین شاہ'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۳۱۴

۱۰۵۔ اشفاق احمد، ''توتا کہانی۔ بارھویں کہانی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء، ص ۴۲۰

۱۰۶۔ اشفاق احمد، ''Snap Shot'' مشمولہ: ''زاویہ''، ص ۲۴۵

۱۰۷۔ اشفاق احمد، ''برگِ آرزو''، مشمولہ ''ننگے پاؤں''، لاہور، فیروزسنز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۴۴

۱۰۸۔ اشفاق احمد، ''آشیانے۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۲۵۲

۱۰۹۔ اشفاق احمد، ''جنگ بجنگ۔ تلقین شاہ'' لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۲۲۷

۱۱۰۔ اشفاق احمد، ''گلدان۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۲۹۴

۱۱۱۔ اشفاق احمد، ''وطن کی مٹی II''، مشمولہ عرضِ مصنف''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۰

۱۱۲۔ اشفاق احمد، ''ٹاہلی تھلے'' پنجابی ڈرامے، لاہور، مکتبہ جدید پریس، مارچ ۱۹۷۲ء، ص ۸۰

۱۱۳۔ اشفاق احمد، ''فہمیدہ کہانی۔ استانی راحت کی زبانی، ڈرامہ ۸۶'' مشمولہ: ''ننگے پاؤں'' لاہور، فیروزسنز، ۱۹۹۱ء، ص ۲۴۲

۱۱۴۔ اشفاق احمد، ''برگِ آرزو'' مشمولہ: ''ننگے پاؤں''، ص

۱۱۵۔ اشفاق احمد، ''حیرت کدہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء، ص ۸۵

۱۱۶۔ اشفاق احمد، ''روح کی سرگوشی'' مشمولہ ''زاویہ۔۳''، ص ۳۱۰

۱۱۷۔ اشفاق احمد، ''السیف (Warrior)'' مشمولہ: ''زاویہ۔۳''، ص ۲۷۲

۱۱۸۔ اشفاق احمد، ''سگنل اور سنگل بیڈ'' مشمولہ: ''اردو ڈرامے''، ص ۲۰۲۔۲۰۱

۱۱۹۔ اشفاق احمد، ''تصوف اور کامیاب ازدواجی زندگی'' مشمولہ زاویہ۔۳'' ص ۱۸۱

۱۲۰۔ اشفاق احمد، ''زندگی سے پیار کی اجازت درکار ہے'' مشمولہ ''زاویہ۔۲'' ص ۱۸۹

۱۲۱۔ شازیہ صدف، ''اشفاق احمد کی ادبی خدمات۔اردو ادب کے تناظر میں'' مقالہ برائے پی۔ایچ ڈی، مملوکہ لائبریری، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص ۱۶۲

۱۲۲۔ اشفاق احمد، ''ڈیپریشن کا نشہ'' مشمولہ ''زاویہ۔۲'' ص ۱۷۴

۱۲۳۔ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۲

۱۲۴۔ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۵

۱۲۵۔ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۴۲

۱۲۶۔ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶۱

۱۲۷۔ اشفاق احمد، ''مہمان سرائے'' لاہور، سنگ میل، ۱۹۹۶ء، ص ۱۳۹

۱۲۸۔ اشفاق احمد، ''حرام بکرا'' مشمولہ ''زاویہ۔۳''، ص ۱۶۰

۱۲۹۔ شازیہ صدف، ''اشفاق احمد کی ادبی خدمات، اردو ادب کے تناظر میں'' مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مملوکہ لائبریری، پنجاب یونیورسٹی، ص ۱۶۷

۱۳۰۔ اشفاق احمد، ''معدنِ محبت'' شمولہ: ''ایک محبت سوڈرامے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۴۹۹

۱۳۱۔ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا'' لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۱۰

۱۳۲۔ اشفاق احمد، ''تصوف اور کامیاب ازدواجی زندگی'' مشمولہ ''زاویہ۔۳'' ص ۱۷۹

۱۳۳۔ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۸۶

باب چہارم

اشفاق احمد کے افسانوں میں اخلاقیات

ا۔ اشفاق احمد کی افسانہ نگاری

ب۔ ایک محبت سو افسانے

ج۔ گڈریا۔ اُجلے پھول

د۔ سفر مینا

و۔ ایک ہی بولی۔ پھلکاری

ہ۔ صبحانے فسانے

ز۔ طلسم ہوش افزاء

ح۔ دیگر افسانے

ا۔ اشفاق احمد کی افسانہ نگاری

اردو ادب میں افسانہ مقبول ترین صنف ہے، کہانی کہنا، بننا اور سننا انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ دور قدیم سے عہد جدید تک افسانے نے بہت سے مراحل طے کیے ہیں۔ مغرب ہو یا مشرق افسانہ قابل فخر روایات کا حامل رہا ہے۔

دی انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں شارٹ سٹوری کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

Short story, brief fiction prose narrative that is shorter than a novel and that usually deals with only a few characters. The short story is usually concerned with a single effect conveyed in only one or a few significant episodes on scenes..... The short story had its precedents in ancient Greek fables and brief romance, the tales of the Arabian Nights.....(۱)

دی انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کی اس تعریف سے واضح ہے کہ مختصر افسانہ ایک ایسی صنف ادب ہے جو ضخامت میں ناول سے کم ہے اور زندگی کے کسی ایک تاثر کو بیان کرتی ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق:

''اس سے مراد نثر میں ایک مختصر سا قصہ ہے جس میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو بے نقاب کیا گیا ہو۔'' (۲)

یعنی زندگی کا کوئی ایک واقعہ جو مختصر ہونے کے ساتھ ایک ہی نشست میں پڑھا بھی جا سکے افسانہ کہلاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایڈگر ایلن پو (Edger Allen Poe) لکھتے ہیں کہ:

"A short story is a prose narative requiring from half an hour to one, two hours in its perusal."(۳)

ایڈگر ایلن پو کے مطابق نہ صرف افسانہ مختصر ہو بلکہ ایک ہی نشست میں پڑھا بھی جا سکے، اگر وہ ایک ہی نشست میں نہ پڑھا جائے تو اپنا تاثر کھو بیٹھتا ہے۔ مختصر کہانی کے بارے میں ڈاکٹر پروین اظہر لکھتی ہیں کہ:

''ایڈگر ایلن پو وقت کی قید لگاتے ہوئے ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کرتا ہے کہ اسے ایک نشست میں پڑھا

جانا چاہیے۔ اگر ایک نشست میں نہ پڑھی جا سکے تو وہ اپنا اثر زائل کر دیتی ہے۔'' (۴)

حالانکہ ڈاکٹر انور سدید نے لفظ مختصر پر اعتراض کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''افسانہ کے ساتھ مختصر کے سابقے نے ایک غیر معقول صورت کو جنم دیا ہے۔''(۵)

لیکن اس اعتراض کے باوجود افسانے کے ساتھ اختصار ہی اس کی شناخت ہے۔ اختصار سے مراد یہ بھی ہے کہ تحریر جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے اپنا وحدت تاثر برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

اختصار کے ساتھ ساتھ ''افسانہ'' کا کینوس بے حد وسیع ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے اس لیے ''اختصار'' سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ اس میں معنویت نہیں ہوتی، بہت سے عالم فاضل افسانہ لکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں کیونکہ تخلیقی عمل ہرگز آسان کام نہیں ہے۔

اس سلسلے میں راجندر سنگھ بیدی لکھتے ہیں کہ:

''افسانہ لکھنے کے عمل میں بھولنا اور یاد رکھنا دونوں عمل ایک ساتھ چلتے ہیں غالباً یہی جہ ہے کہ بڑی بڑی ڈگریوں والے۔ پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ اچھا افسانہ نہیں لکھ سکتے...... افسانہ ایک شعور، ایک احساس ہے، جو کسی میں پیدا نہیں کیا جا سکتا، اسے محنت سے حاصل تو کیا جا سکتا ہے، لیکن حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی دست بہ دعا ہی رہتا ہے...... اگر ہمینگ وے پانچ سو صفحے لکھ کر ان میں سے صرف چھیانوے صفحے کا مواد نکال سکتا ہے، تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔''(۶)

افسانہ لکھنے کے لیے جہاں مواد کا اچھا ہونا ضروری ہے وہاں اس اسلوب کو بیان کرنے کے لیے پیش کرنے کے فن سے آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ افسانے میں کوئی جھول نظر نہ آئے، محمود ہاشمی کے مطابق:

''افسانہ ہمیں جس قدر آسان معلوم ہوتا ہے، اس قدر آسان نہیں ہے، اس کا ہر جملہ، ہر سطر، ایک ہی لمحے کا بیان تخلیق کو خطرناک منزلوں میں پہنچا دیتا ہے۔ ایسی منزلیں جہاں فن کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہمیں ایک ایک جملے میں جان ڈالنی پڑتی ہے اور جو جملہ بھی زائد ہوتا ہے وہی افسانے کی موت بن جاتا ہے۔''(۷)

افسانہ نگار بڑی مہارت سے اپنے اردگرد ہونیوالے واقعات کا تاثر کہانی میں ڈھالتا ہے اور نہایت سوچ سمجھ کر اور

محنت سے قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ قارئین اس تاثر کی شدت سے واقف ہوسکیں اور کائنات کی معنویت سے آگاہ ہوسکیں اور اس سلسلے میں افسانہ ہی مددگار ثابت ہوسکتا ہے،''اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا'' میں درج ہے کہ اردو افسانہ میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ کائنات کے وسیع رنگوں کو بیان کرسکتا ہے۔ بقول رام لعل:

> ''اردو افسانہ ہر قسم کے تخلیقی تجربات کر کے اور اتنی بڑی کائنات میں انسانی وجود کی بے معنویت کے عام احساس کو سمجھنے اور اسے بامقصد اور باعمل بنانے اور اس میں معنویت بھی تلاش کر لینے کے لیے ہر دور میں خود کو توانا سے توانا تر ہونے کا ثبوت فراہم کرسکتا ہے۔'' (۸)

کائنات میں جنم لینے والے ہر احساس کو افسانہ نگار اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بقول مرزا حامد بیگ:

> ''افسانہ اظہار احساس ہے، افسانوی کینوس پر پھیلے ہوئے جدل کے ہر ہر منظر میں برسرپیکار جذبات کو تخلیق کار اپنے سینے سے گزار کر پیش کرتا ہے۔'' (۹)

افسانے کا جنم خود بخود نہیں ہوتا بلکہ افسانہ نگار کے اندر کوئی نہ کوئی احساس کا بیج پھوٹتا ہے جو اس کا سبب بنتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر آغا قزلباش لکھتے ہیں کہ:

> ''دراصل افسانے کو جنم دینے والا بنیادی جذبہ وہ لمحہ استعجاب یا حیرت ہے جو انسانی شعور کو ایک مخصوص ڈگر پر چلنے اور سوچنے سے روکتا ہے، بلکہ اسے نیند سے جگا دیتا ہے۔ درحقیقت یہ ''جاگنا'' یا ''سونے کا شعور'' حاصل کرنا ہی کہانی کے وجود میں آنے کا اصل محرک قرار پاتا ہے۔'' (۱۰)

افسانے میں، افسانہ نگار نہ صرف کسی ایک واقعے کو پیش کرتا ہے بلکہ حقیقت اور تخیل کی آمیزش سے جنم لینے والے نئے رجحانات کی ترجمانی کرتا ہے اور اس فن کو سمجھنے کے لیے افسانے کے اجتماعی احساس کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق:

> ''کیونکہ مختصر افسانے کا فن بہرصورت ایک نئی تہذیب اور معاشرت کا نقیب، ادب اور فن کے لیے نئے میلانات کا عکاس اور فلسفہ و جمالیات کی نئی قدروں کا ترجمان ہے۔'' (۱۱)

افسانہ محض تخیلاتی یا محض حقیقی نہیں ہوسکتا بلکہ افسانہ نگار بات کی گہرائی تک پہنچ کر اصل حقائق کو باہر لاتا اور بیان کرتا

ہے تا کہ تہذیبی ارتقاء کے تمام پہلوؤں کو پیش کر سکے اور پڑھنے والا اس سے اثر پذیر ہو سکے۔

سعادت حسن منٹو کے خیال میں:

''ایک تاثر خواہ وہ کسی کا ہو، اپنے اوپر مسلط کر کے اس انداز سے بیان کر دینا کہ وہ سننے والے پر وہی اثر کرے، یہ افسانہ ہے۔'' (۱۲)

افسانے سے مراد گویا وہ مختصر کہانی ہے جو زندگی کے کسی ایک واقعے یا پہلو کو بیان کرے اور اسے ایک نشست میں پڑھا جا سکے اور اس کی ضخامت اتنی ہو کہ کسی ایک تاثر کو پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس بارے میں پروفیسر سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

''مختصر افسانہ ایک ایسی مختصر فکری داستان ہے جس میں ایک خاص کردار، کسی ایک خاص واقعہ پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ اس میں پلاٹ ہو اور اس پلاٹ کے واقعات کی تفصیل اسی طرح گھٹی ہوئی اور اس کا بیان اس قدر منظّم ہو کہ وہ ایک متحد اثر پیدا کر سکے۔'' (۱۳)

افسانہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں زندگی کے ایک پہلو کو اس طرح سے بے نقاب کیا جاتا ہے کہ مطالعہ کرنے والا مختصر سی مدت میں افسانہ نگار کی گرفت میں قید ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر ایک تاثر جنم لیتا ہے۔ وحدت تاثر کے لیے افسانہ نگار کو موضوع، کردار اور واقعات پر پوری گرفت رکھنا ضروری ہے۔ جزئیات نگاری، جدت پسندی، مضمر بیانی بلندی خیال اور سوچ کا وسیع تناظر ایک کامیاب افسانہ نگار کی خصوصیات ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ افسانہ نگار کو ان جزئیات کو اختصار سے بیان کرنے کے ہنر سے بھی واقف ہونا چاہیے۔

اشفاق احمد ایک ایسے ہی افسانہ نگار ہیں جو اپنے مشاہدے کی گہرائی اور معجز بیانی سے انسان کے باطن گرہیں کھولتے اور زندگی کے ہر واقعے کو جزئیات سے پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نگہت ریحانہ لکھتی ہیں کہ:

''وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو جزئیات نگاری، ہمواری و توازن، نظم و ضبط اور روانی نے معیاری بنا دیا ہے۔ خصوصاً جزئیات نگاری میں فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ پس منظر کہانی پر غالب نہ آنے پائے۔'' (۱۴)

انسان اور زندگی کے بارے میں اشفاق احمد کا مشاہدہ بہت وسیع اور گہرا ہے اور اس کو بیان بھی وہ پوری جزئیات

کے ساتھ کرتے ہیں۔ اشفاق احمد نے اپنی افسانہ نگاری کی ابتدا ہی میں وہ مقام حاصل کرلیا جہاں تک پہنچنے کے لیے ایک عمر لگتی ہے۔ اس بارے میں انتظار حسین لکھتے ہیں کہ:

''شاعر ہوں یا افسانہ نگار مختلف مراحل طے کرتے ہوئے رفتہ رفتہ وہ اس مقام پر پہنچتے ہیں جہاں انھیں اپنے فن کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔ اشفاق نے پہلے ہی ہلے میں ''گڈریا'' جیسی کہانی لکھ ڈالی جہاں اس کے فن کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔'' (۱۵)

اشفاق احمد کی جزئیات نگاری کی صفت بارے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ:

''منٹو، بیدی، کرشن اور عصمت کی موجودگی میں نئے افسانہ نگاروں کا نمایاں ہونا بہت دشوار تھا مگر اشفاق احمد نے اس دشواری کو بڑی سہولت اور خوداعتمادی سے طے کر لیا۔ وہ اس فن کی سعی جہات پر استادانہ مہارت سے حاوی ہیں۔ وہ اپنے موضوع اور کرداروں کے انتخاب میں بھی منفرد ہیں اور جس بے تکلفی اور بے ساختگی سے وہ کہانی سناتے ہیں وہ بس انہی کا حصہ ہے۔ زندگی اور انسان کے بارے میں ان کا مشاہدہ بے پناہ ہے۔'' (۱۶)

اشفاق احمد نہ صرف موجودہ زندگی اور معاشرت اور اس کے مسائل کا بیان اپنے افسانوں میں کرتے ہیں بلکہ تقسیم اور ہجرت کے کربناک واقعات کا بیان بھی ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ تقسیم سے پہلے کی زندگی ان کے افسانوں میں خوشگوار یاد کی صورت میں کبھی آنسو بن کر جھلکتی ہے اور کبھی یہ آنسو موتی بن کر ان کے اندھیروں میں جھلملاتے ہیں۔ ماضی کے حوالے سے ان کے افسانوں میں درد کے اس میٹھے احساس کی ترجمانی پروفیسر سید وقار عظیم اس طرح سے کرتے ہیں کہ:

''انسان اپنے گردوپیش کی زندگی سے اکتا کر ماضی کی یادوں میں پناہ اور بسیرا لیتا ہے۔ یہ یاد ان کے افسانوں میں عموماً دل خوش کن نغموں کی طرح گونجتی اور نسیم بہار کی طرح لہراتی ہے، ان یادوں میں بڑوں کے لیے وہی لذت ہے جو بچوں کو پریوں کی کہانیوں میں محسوس ہوتی ہے۔'' (۱۷)

انھیں ماضی کی ہر شے سے محبت ہے اور یوں لگتا ہے کہ یہ محبت برباد: ناکام، مایوس اور لٹی پٹی نہیں ہے بلکہ ان کی یادوں میں ہر دم اِک جہاں آباد ہے۔ ڈاکٹر محمد عالم خان لکھتے ہیں:

''وہ ہر چیز کو دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے ہیں اور انھیں اپنے دل میں آباد کیے ہوئے ہیں۔'' (۱۸)

اشفاق احمد محبت اور محبت کے پھیلاؤ پر یقین رکھنے والے انسان تھے اور ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع بھی ''محبت''، ہی ہے اس سلسلے میں سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد نے کسی ماحول کو منتخب کرنے کے بجائے ایک موضوع کو اپنے لیے منتخب کر کے مختلف فضاؤں میں اس موضوع کو مختلف صورتیں اختیار کرتے دکھایا...... یہ موضوع محبت ہے۔'' (۱۹)

اشفاق احمد کے ہاں محبت کا جذبہ، تقدیس کے نور میں لپٹا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن انسان کے فطری جذبہ سے ماورا نہیں ہوتا بلکہ اس کو اس کی اصل صورت سے واقف کرواتا ہے اور محبت کے پاکیزہ احساس سے اس کا تعارف کرواتا ہے جو محبت کا حسن ہے اس حوالے سے غلام حسین اظہر لکھتے ہیں کہ:

''اس نے محبت میں جسمانی تقاضوں کو اہمیت دی لیکن وہ انتہا پسندی کا شکار نہیں ہوا۔ اس کے ہاں محبت افلاطونی محبت نہیں وہ جسمانی قربت کی پیداوار ہے۔ وہ جسمانی لمس سے پروان چڑھتی ہے، جلا پاتی ہے لیکن محبت کا پیمانہ لبالب بھر جانے کے باوجود چھلکتا نہیں......'' (۲۰)

محبت کا یہ احساس ان کے افسانوں کا خاص موضوع ہے جو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے یہ محبت کہیں بھی نہ تو اپنے حواس کھوتی ہے اور نہ ہی اپنے مقام سے نیچے آتی ہے بلکہ یہ پڑھنے والوں کے دل میں محبت کی میٹھی میٹھی حرارت پیدا کر دیتی ہیں۔ مثلاً خالد حسین کے مطابق:

''اشفاق احمد کے افسانوں کا مجموعہ ''ایک محبت سو افسانے'' رگ و پے میں ایک عجیب سی لہر دوڑا دیتا تھا۔ اگر آپ اسے آج بھی پڑھیں تو اس میں آپ کو محبت کی چند ایسی انتہائی دلگداز داستانیں ملیں گی جو اردو زبان میں اب تک کم لکھی گئی ہیں۔'' (۲۱)

''ایک محبت سو افسانے'' میں چھپا محبت کا یہ احساس، قارئین کے دلوں میں ''محبت'' کی صحیح معانی کو جاننے کی سعی ہے اسی سلسلے میں جمیل الدین عالی ایک اخباری کالم میں رقمطراز ہیں کہ:

''ایک محبت سو افسانے'' ان کی ایک اہم تخلیق ہے جو عاشقانہ اور مدبرانہ بھی تھی اور ایک خاص پیغام بھی دیتی تھی۔'' (۲۲)

اشفاق احمد کے افسانوں میں مرکزی موضوع محبت ضرور ہے لیکن اس سے یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ یہ افسانے خواب

وخیال کی افسانوی دنیا میں جھولے جھولتے ، مافوق الفطرت جھیلوں میں غوطہ زن ہیں بلکہ ان کے افسانے تلخ حقائق کے بھی عکاس ہیں، لیکن یہ سب وہ اپنی ذات کے ٹھہراؤ کے ساتھ نہایت سلیقے سے بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی حقیقت نگاری کھری، بے ہنگم، اذیت ناک، فاحش اور انتہا پسند نہیں ہوتی۔'' (۲۳)

اشفاق احمد کے ہاں محبت کا یہ جذبہ سماجی اور اجتماعی نوعیت کا ہے۔ اس میں انسانی قدروں کی پاسداری کے ساتھ ساتھ زندگی کی پیچیدگیوں کا بھی گہرا شعور ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فردوس انور قاضی لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد نے اس زندگی کے ایک اور رخ کو اپنایا...... جس میں سماجی حیثیت کی پیدا کردہ الجھنیں شامل ہیں اور ان الجھنوں سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیاں، محرومیاں، دکھ اور خوشیاں ان کے افسانوں کا موضوع ہیں۔'' (۲۴)

اشفاق احمد خود افسانوں کے بارے میں ایک واضح اسکیچ رکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

''افسانہ جو مادہ زندگی سے بڑی حدت دے کر اخذ کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ سیال حالت میں پایا جاتا ہے اور سیال چیزوں کی طرح اس پر چند اصول لاگو ہوتے ہیں۔ افسانوں میں ایک خاص قسم کی Viscosity ہوتی ہے یعنی افسانے میں ایک متعین شدہ بہاؤ ہوتا ہے جس طرح شراب میں یہ خاصیت ہے کہ پانی سے جلدی بہہ نکلتی ہے۔ شراب اور پانی کے مقابلے میں شہد اتنی جلدی بہنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح ہر افسانے میں سیال چیزوں کی طرح بہنے کی قوت ہوتی ہے۔ کچھ افسانے سست رو شہد کی طرح چلتے ہیں کچھ آبشاروں کی طرح گرتے ہیں اور اپنے ساتھ قاری کو بھی بہا لے جاتے ہیں اور کچھ مہراں دریا کی طرح چلتے ہیں جن کا بہاؤ ہر میل پر ہر کوس پر اندر سے تیز اور اوپر سے سست ہوتا جاتا ہے۔ کچھ افسانے لاوے کی طرح ابلتے اور گرم چشموں کی طرح پھونکتے ہوئے بہتے ہیں۔'' (۲۵)

اشفاق احمد کے افسانوں میں ہر انسان کے دل میں چھپی ہوئی محبت کا سچا تصور جھلکتا ہے۔ بقول پروفیسر وقار عظیم:

''اشفاق احمد کی کہانیاں کسی مخصوص ماحول کی پابندی کے بغیر ایسی سچی محبت کی کہانیاں ہیں جس کا نور ہر

دل میں موجود ہے۔'' (۲۶)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں محبت کے کسی ایک پہلو کو بیان نہیں کرتے بلکہ محبت کے سبھی رنگ مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں۔ یہ محبت صرف مرد اور عورت کی محبت تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر رشتے میں اس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

''محبت، گھریلو زندگی، معصوم بچے...... یہ چیزیں اشفاق احمد کے دلپسند موضوعات ہیں لیکن ایک اور موضوع جو زمانے کے اثر نے انھیں دیا ہے۔ انسانی ذہن کی اس کیفیت کی مصوری ہے جو حال کی زندگی کے انتشار اور اضطراب نے پیدا کی ہے۔'' (۲۷)

اشفاق احمد نے زمانے کی تلخیوں کو لطافت کی شیرینی میں ڈبو کر کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے کہ یہ شیرینی پڑھنے والے کو معنی کے نئے نئے ذائقوں سے آشنا کرواتی ہے، اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت کا حسی تصور بے حد لطیف اور کثیر الاضلاع ہے۔ ان کے افسانے بظاہر محبت کے مرکزی نقطے پر گردش کرتے ہیں تاہم ان کے موضوعات متنوع ہیں اور وہ محبت کی قندیل سے زندگی کے بے شمار گوشوں کو منور کرتے چلے آتے ہیں۔'' (۲۸)

اشفاق احمد زندگی کے سبھی پہلوؤں کو بے نقاب کرنا اپنا ادبی فرض سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں انسان پر بیتنے والے ہر احساس کو بیان کرنا اپنا مقصد گردانتے ہوئے کہانیاں لکھتے ہیں۔ بقول محمد حمید شاہد:

''اشفاق احمد کی شخصیت کے کئی روپ میں تاہم اس کے افسانے میری نظر میں یوں اہم ہیں کہ وہ چلتی کہانی کے بہاؤ کو توڑ کر انسانی لاشعور سے برآمد ہونے والے سوالات سے مقابل ہوتا رہا ہے۔ یوں کہ کہانی کے اندر کے معنی تہہ در تہہ ہو جاتے ہیں۔ خارجی حقیقت اس کے ہاں ٹوٹ پھوٹ کر بڑی اور ازلی حقیقت میں تحلیل ہو جاتی ہے، محض کہانی لکھنا، اشفاق احمد کا مسئلہ نہیں ہے کہ وہ مسلسل زندگی کو بہت گہرے معنی دینے کے جتن کرتا رہا ہے۔'' (۲۹)

اشفاق احمد کے ایک افسانے میں کئی افسانے سما جاتے ہیں۔ وہ زندگی کی متنازع ہیئتوں کو کہیں بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے، اور نہ ہی ان کا ماضی، حال اور مستقبل سے رشتہ توڑتے ہیں بلکہ وہ وقت کی قید سے آزاد بہتے ہوئے وقت کے

تمام اثرات حد نظر تک موجودہ وقت اور صورتحال میں بیان کرتے ہیں۔

اسی لیے ان کے افسانے ماضی سے آزاد بھی نہیں ہوتے اور حال پر ان کی گرفت بھی نہیں چھوٹتی، اس سلسلے میں مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں کہ:

''چاہے جانے کے جذبے کا تنوع (خصوصاً حیاتی سطح پر اس جذبے کی متنوع صورتیں) اشفاق احمد کے ہاں ان کے نمائندہ افسانوں خصوصاً ''گڈریا''، ''اجلے پھول اور قصہ نل دمینی'' میں ظاہر ہوا ہے جبکہ لوک دانش کا حوالہ (افسانہ: حقیقت نیوش) اور تصوف کی جانب میلان (افسانہ: مانوس اجنبی) اشفاق احمد کے ہاں پاکیزگی اور خیر کی فضا بندی کرتا ہے۔ دوسری طرف اشفاق احمد نے ''رشوت'' جیسے شدید جنسی حسیت کے افسانے قلم بند کیے ہیں۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ افسانوں میں خاص نوع کی گہرائی پائی جاتی ہے (مثالیں: چچا سام کے دیس میں اور بندر لوگ) ان افسانوں میں اشفاق احمد نے تیسری دنیا کی بے بسی اور سامراج کی ریشہ دوانیوں پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ۱۹۴۷ کے فسادات کے متعلق اشفاق احمد کا افسانہ ''گڈریا'' اردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔'' (۳۰)

اشفاق احمد زمانہ حال کی بے اعتنائی سے مایوس نہیں ہوتے اور نہ ہی اپنے قارئین کو مایوس ہونے دیتے ہیں، بلکہ وہ زندگی کے گھپ اندھیرے میں بھی امید کی شمع جلانے میں ہمہ وقت مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''اشفاق احمد زندگی کے اندھیرے سے چھوٹے چھوٹے جگنو چننے اور پھر ان سے پورے مطمع کو روشن کرنے والے افسانہ نگار ہیں...... اشفاق احمد نے افسانے کو سماجی تنقید کا وسیلہ بنانے کے بجائے اس سے مجموعی طور پر نیکی اور خیر کی فضا تعمیر کرنے کا کام لیا ہے۔'' (۳۱)

اشفاق احمد کو اپنے افسانوں میں زندگی کو اس کے مثبت انجام کی طرف لے جانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں اور اس کے لیے وہ زندگی میں آنے والے مصائب اور تکلیفوں کے بیان سے گھبراتے نہیں بلکہ ان مشکلات میں برسرپیکار رہنے کا جذبہ اور رجحان عنایت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فردوس انور قاضی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد نے اس زندگی کے ایک رخ کو اپنایا...... جس میں سماجی حیثیت کی پیدا کردہ الجھنیں شامل ہیں۔ ان الجھنوں سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیاں، محرومیاں، دکھ اور خوشیاں ان کے افسانوں کا

موضوع ہیں۔'' (۳۲)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں انسان کی محرومیوں، نارسائیوں، تکلیفوں اور اذیتوں کو بیان کر کے قارئین کو اس میں رونے یا بلکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیتے بلکہ ان زخموں پر مرہم رکھتے ہیں اور علاج کے طریقے بتاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد عالم خان لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد اپنے افسانوں میں معاشرے کے دکھوں اور افراد کے آنسوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کے ہاں جذبے اور کیفیات کا حسین سنگم ملتا ہے۔ وہ زندگی کی نارسائیوں اور بے بسی پر خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں۔ لیکن یہ اس کے اسلوب کی خوبی ہے کہ وہ اپنی تحریروں کو نوحہ یا مرثیہ نہیں بننے دیتا اور فکری تجزیوں اور اپنے تخیلاتی زاویوں سے تحریر کی شگفتگی اور حسن کو برقرار رکھنے کا فن جانتے ہیں۔'' (۳۳)

اشفاق احمد اپنے آنسوؤں میں جن مصائب کا ذکر کرتے ہیں ان کو محض بیان نہیں کرتے بلکہ ان کا تجزیہ اپنے تجربے اور مشاہدے کے مطابق کر کے، موجودہ صورتحال کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کی تسکین کے لیے بلکہ اجتماعی بھلائی کے لیے لکھتے ہیں، اس سلسلے میں ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد کے آنسو محض اور محض ذاتی محرومیوں کے کتھارسس کے لیے نہیں ہیں، نوک خار پر رقص کرنے والے یہ آنسو قارئین کے لیے خالص موتی ہیں۔'' (۳۴)

اشفاق احمد معاشرتی بھلائی اور اخلاقی اصلاح کے لیے کہانیاں لکھتے ہیں لیکن اس سلسلے میں وہ افسانے کے فن سے لمحہ بھر کو بھی اپنی نظر نہیں ہٹاتے، وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ضرور ہیں لیکن ان حقائق کو بیان کرنے کا ان کا انداز لطیف، نرم اور سبک ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مطابق:

''وہ جس ماحول یا کردار سے متاثر ہو کر افسانہ لکھتے ہیں اسے حد درجہ سبک، نرم، میٹھے، سادہ اور دھیمے لہجے میں قاری کے دل و دماغ میں اتار دینے کی کوشش کرتے ہیں، یہ نہیں کہ اصلاحی اور تعمیری مقصد ان کے یہاں نہیں ہوتا۔ ضرور ہوتا ہے لیکن اس طور پر نہیں کہ مقصد کا تبلیغی مشن آگے نکل جائے اور افسانہ پیچھے رہ جائے، وہ اپنے مقصد یا فلسفہ حیات کو افسانے کی سطح پر تیرانے کے بجائے اسے معنی کی گہری تہوں میں

اتار کر کہانی سناتے ہیں۔ کہانی میں ان کی نظر ماحول سے زیادہ کردار پر ہوتی ہے لیکن کچھ اس انداز خاص سے کہ افسانے کا ماحول خود بخود قاری پر روشن ہو جاتا ہے۔''(۳۵)

فلسفہ حیات کو اپنے افسانے میں سمونے کے لیے انھیں کسی بڑے حادثے یا واقعے کا سہارا نہیں لینا پڑتا بلکہ وہ حیات انسانی کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے کسی بھی جز کو اپنے افسانے کا موضوع بنا لیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبدالغفور شاہ قاسم:

''اشفاق احمد چھوٹے سے واقعہ پر ایک بڑی کہانی کی عمارت استوار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''(۳۶)

اشفاق احمد زندگی کی تمام ناہمواری، بدنظمی، انتشار اور اضطراب کو نہایت سلیقے، تمیز اور سبھاؤ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان لکھتی ہیں کہ:

''انھوں نے پنجاب کے دیہات اور پاکستان کی ثقافتی تبدیلیوں پر اچھے افسانے لکھے۔ اس کے علاوہ مختلف انسانی رشتوں جیسے ماں، بیوی، بچے، یتیم و بے کس افراد اور ملازم وغیرہ کی عکاسی منفرد انداز میں کی ہے...... وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو جزئیات نگاری، ہمواری و توازن، نظم و ضبط اور روانی نے معیاری بنا دیا ہے۔''(۳۷)

اشفاق احمد نے نہایت میٹھے اور سبک انداز میں تلخ حقائق کو اپنے قارئین کے حلق میں اتارا ہے وہ کچھ اس طرح سے کہ اس عرق سے ان کے قارئین کو شفا بھی ملی ہے اور ان کا کتھارسس بھی ہوا ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد کے فن میں دست صبا کی سی نرمی ہے اور اس کے افسانوں کے ہاتھ ہمارے دل کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں، یہ وہی خیر ہے جسے Healing Power کہا گیا ہے...... ان کے فن میں ضبط و نظم ہے ان کے کردار کہانی کی فضا میں پوری شخصیت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لیے ہم پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔''(۳۸)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں دست صبا کی نرمی ضرور ہے لیکن اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ وہ خوابوں کی دنیا میں تخیلاتی فضا میں کھو کر زندگی کے تلخ حقائق سے بے خبر ہو کر اپنے اردگرد کے ماحول سے ناطہ توڑ دیتے ہیں اور رومانوی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ اس بارے میں ڈاکٹر غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں کہ:

''اشفاق احمد کے افسانوں میں صبا کے ہاتھ کی نرمی اور قوس قزح کے ساتوں رنگ موجود ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ افسانے کی فضا کو رومانوی بنانے کے لیے صرف فطرتی مناظر کو پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ وہ خواب ضرور دکھاتے ہیں مگر اس مشاقی سے کہ زمین اور اردگرد کے ماحول سے رشتہ برقرار رہتا ہے۔'' (۳۹)

اشفاق احمد کے افسانوں کے پس پردہ ایک ہی مقصد نہاں نظر آتا ہے اور وہ ہے انسانیت کی فلاح اور اخلاقی اقدار کی ترویج، جس سے وہ فرد اور معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود اپنی افسانہ نویسی کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جب میں نے لکھنا شروع کیا تو بہت کٹھن لگتا تھا، مگر آہستہ آہستہ جھجک نکلی۔ پہلے تو میں نفسیاتی افسانے لکھتا تھا، وہ چھوڑ دیا، لیکن نقطہ نظر اب بھی نفسیات ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ انسان کے دل میں محبت پیدا ہو اور لوگ ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ معاشرے میں ہم آہنگی اور یکجہتی کی فضا پیدا ہو۔'' (۴۰)

ان کے اس بیان کی تصدیق ان کے افسانوں سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے معاشرتی اصلاح و تعمیر کے لیے افسانے لکھے اور انسانی زندگی کے سبھی رشتوں کو تمام رنگوں اور جذبوں کے ساتھ پیش کیا اور انسان کے کسی بھی روپ سے نفرت کرنے کے بجائے، قابل نفرین اور حقیر جذبوں کو بھی محبت کے ساتھ پیش کیا۔ اسی روشنی میں ان کے افسانوں کا اخلاقی تناظر پیش خدمت ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر جذبہ، احساس، رنگ بیان بغیر مذہب و ملت، رنگ و نسل کی تخصیص کے ساتھ بلاتعصب پیش کیا گیا ہے۔

(ب) ایک محبت سو افسانے

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں نہ صرف معاشرے میں پنپنے والی اخلاقی برائیوں کا بیان کرتے ہیں بلکہ ان برائیوں میں حائل انسانی فطرت کے ان پہلوؤں پر بحث کرتے ہیں جو عام آدمی کی نظر میں بظاہر اہمیت کے حامل نہیں ہوتے۔ ان کے افسانے ''توبہ'' میں ایک ایسی ہی اخلاقی برائی کا بیان ہے جو معاشرے میں عام ہے۔ اس کی ابتداء اور ماں باپ کی منت وسماجت کے باوجود اس کو جاری رکھنے کی لت کا بیان کرتے ہیں اور اسی لت کے شکار کردار اعجاز کو اس کی اپنی آنکھ سے اس طریقے سے دکھاتے ہیں کہ وہ خود بخود سگریٹوں کو پھینک دیتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ جب تک انسان خود نہ

چاہے برائیوں کا سدباب نہیں ہوسکتا ہے۔ کتنے ہی عزیز رشتوں کے واسطے کیوں نہ ہو جب تک اندر سے سائرن نہیں بجتا، اور اپنی آنکھ کو برائی نظر نہیں آتی کیسی بھی اخلاقی برائی یا بری عادت ہو اِس کو چھوڑا نہیں جا سکتا ہے۔

اشفاق احمد نے مرکزی کردار 'اعجاز' کی 'ماں' کے منہ سے کوئی کم جذباتی جملے نہیں کہلوائے۔ جسے سن کر کوئی بھی بیٹا پگھل سکتا ہے۔ مثلاً:

''لے آج سے توبہ کر کہ آئندہ سگریٹ پیوں تو اپنی امی کا خون پیوں''۔ (۴۱)

وہ اس مجبوری کا فائدہ اٹھا کر فوراً بی۔ایس۔اے سب سے اچھے ماڈل کی سائیکل کی فرمائش کر دیتا ہے تو ان کا جواب ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

''مگر آج کل؟ ان دنوں؟ ......'' وہ سوچتے ہوئے بولے۔'' (۴۲)

ان پانچ لفظوں میں اور دو چھوٹے چھوٹے سے سوالیہ فقروں میں جو مجبوری حالات کا بیان ہے، خاص طور پر ان ایام میں جب مالی طور پر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے باوجود اعجاز کو سائیکل مل جاتی ہے لیکن اس کے سگریٹ نہیں چھوٹتے۔ ماں، باپ کی تمام تر کوششیں بے کار ہو کر رہ جاتیں اور جب خود اپنی آنکھ سے نظارہ ہوتا ہے تو کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''اس ننھی سی لو میں اس کا چہرہ میں نے آنکھ کی جھری میں سے دیکھا جیسے الحمرا کے کسی بڑے دالان میں ایک بجھتی ہوئی موم بتی کے آگے کوئی الف لیلہ پڑھ رہی ہو۔'' (۴۳)

اور یوں جو واردات دل و جان پر گزری اس کے نتیجے میں اب اعجاز کے منہ سے یہ نکلتا ہے کہ ملاحظہ فرمایئے:

''میرے اس طرح ایک دم سگریٹ چھوڑ دینے پر سبھی حیران ہیں اور جب کوئی مجھ سے اس کی وجہ پوچھتا ہے تو آپ ہی کہیے میں کیا جواب دوں۔ یہی نا کہ مضر چیز تھی، چھوڑ دی۔'' (۴۴)

اشفاق احمد معاشرتی اصلاحی نقطہ نظر سے قارئین پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جب تک کسی بھی برائی کو خود برائی نہ سمجھا جائے اور خود ترک کرنے کا ارادہ نہ کیا جائے ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور نکتہ یہ بھی اس افسانے سے سامنے آتا ہے کہ ہم بذاتِ خود بہت سی برائیوں کا شکار رہتے ہیں اور انہی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہتے ہیں لیکن جب اسی برائی میں اپنے پیارے کو مبتلا دیکھتے ہیں تو تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔ یعنی اگر ہم

برائیوں سے سماج کو یا اپنے عزیزوں کو پاک رکھنا ہو گا تو خود بھی ان سے اجتناب کرنا ہو گا۔ اسی طرح اپنے خاندان، معاشرے، ملک وقوم کی اصلاح ممکن ہے۔

اشفاق احمد ''فہیم'' میں بیان کرتے ہیں کہ ماں باپ کو اپنے بچوں کو معاشرے کے صحت مند شہری بنانے کے لیے ان سے پیار اور محبت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اس افسانے میں اشفاق احمد یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> ''میرے اتنے بچے ہوئے'' نانی اماں نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''مگر تمہارے نانا نے کبھی ان کو پھول کی چھڑی تک نہ ماری۔ کہا کرتے تھے بچے تو فرشتے ہوتے ہیں، ان کو مارنا گناہ ہے...... میں کہتی تم اسے خراب کر دو گے تو الٹا مسکرانے لگتے کہ فرشتے کبھی خراب نہیں ہوتے۔'' (۴۵)

یعنی بچوں پر ظلم گویا گناہ کے مترادف ہے، اس لیے بچوں کو سمجھانے کے لیے مار پیٹ کے بجائے پیار، محبت اور شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ دوسری صورت میں بچوں میں منفی عادات پیدا ہوتی ہیں اور صحت مند زندگی گزارنے سے محروم رہتے ہیں۔ اس لیے ماں باپ کو اس سے باز رہنا چاہیے۔ اشفاق احمد اس افسانے میں غرور اور تکبر کی طرف لے جانے والے ہر جز کو اپنی زندگی سے خارج کر دینے کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ جس طرح کہ نانا جی سرکاری نوکر رہنے کے باوجود فوجی بوٹ نہیں پہنتے تھے کیونکہ اس سے غرور ٹپکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''وہ اتنا عرصہ سرکاری نوکر بھی رہے، تجارت بھی کی، دوسری ملازمتیں بھی کیں مگر سوائے فوج کے کبھی بوٹ نہ پہنے۔ میری خواہش تھی کہ وہ بھی میرے بھائیوں کی طرح ٹھپ ٹھپ کرتے چلیں۔ آخر کون سی کمی تھی ان میں، مگر وہ نہیں مانے۔ یہی کہتے رہے۔ بوٹ پہن کر آدمی مغرور ہو جاتا ہے۔ اس کی اونچائی اور آواز انسان کے دل میں تکبر پیدا کر دیتی ہے۔ میں اور سارے کام کرنے کو تیار ہوں، پر بوٹ نہیں پہنوں گا......'' (۴۶)

اشفاق احمد نے ہر چھوٹے بڑے عمل یا شے جس سے بھی غرور اور تکبر جیسی منفی عادات جنم لیتی ہوں ان کو ظاہر کر کے ان کی مذمت کی ہے کیونکہ برائی کی ابتداء ہی تکبر سے ہوتی ہے۔ اس سے اپنی برتری اور دوسروں کی کمتری کا احساس دل میں ابھرتا ہے۔ جو معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر بداخلاقی کا موجب بنتا ہے اس لیے ہر وہ شے جو غرور کو جنم دے اس کو سختی سے رد کر دینا چاہیے۔

اشفاق احمد ''رات بیت رہی ہے'' میں محبت کی آفاقیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محبت کے سامنے تمام فیصلے، نظریات، مباحث، افکار، دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ محبت کے چھن جانے کا خوف انسان سے وہ سب کرواتا ہے جس کے کرنے کے بارے میں وہ سوچتا بھی نہیں اور یہ جذبہ کسی مخصوص رنگ، نسل، قوم یا مذہب کے لوگوں تک محدود نہیں ہے بلکہ پیٹر بھی اسی لیے امریکی فوج میں ہوا باز ہے کیونکہ اس کی محبوبہ مارگریٹ کی یہی خواہش تھی، جب پیٹر اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہوتا ہے تو مارگریٹ کی تصویر کو قریب سے دیکھ کر کہتا ہے کہ:

> ''مارگریٹ نے مجھے کہا تھا کہ مرد فوج میں بھرتی ہونے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھو میری ٹوپی پہن کر کس قدر خوش نظر آتی ہے، اسے ہوائی فوج سے انس تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ میں ایک اچھا پائلٹ بن سکوں۔ میں پائلٹ تو بن گیا مگر شاید اچھا نہیں! یہ اکثر کہا کرتی تھی کہ جب تم وردی پہن کر میرے ساتھ پرنسٹن کی گلیوں میں چلا کرو گے تو ہر بری اور بحری فوجی ہمیں سلام کیا کرے گا۔ کاش اس کی یہ آرزو پوری ہوسکتی......'' (۴۷)

ایک مرتے شخص کے منہ پر ہوتا ہی سچ ہے۔ پیٹر فوج میں گیا کیونکہ یہ اس کی جان تمنا کا حکم تھا۔ اور مرتے دم تک اسی کی آرزوؤں کی تکمیل چاہتا ہے اور یہی بے لوث محبت ہے جس میں کوئی لوبھ، لالچ، خودنمائی، خودستائی، حسد، جلن، برائی نہیں ہے۔ اشفاق احمد اس جذبے کو کسی ایک قوم یا فرد کی نظر سے نہیں بلکہ بطور آفاقی جذبہ متعارف کرواتے ہیں۔ بغیر کسی بھید بھاؤ اور تعصب کے جتنی شدید محبت پاکستان میں بسنے والے دو عاشق و محبوب میں تھی اتنی ہی پاک، نفیس اور شدید محبت امریکی پیٹر اور مارگریٹ میں بھی تھی۔ دونوں ہوا باز ایک ہی جذبے میں بھیگے، محبت کے سامنے سرِ تسلیم خم تھے اور یہی محبت کی آفاقیت ہے اور یہی اس کا پیغام بھی کہ محبت کرنے والا ہر دل ایک انداز سے دھڑکتا ہے اور محبت ہر جگہ ایک ہی رنگ میں پائی جاتی ہے۔

اشفاق احمد ''تلاش'' میں جہاں اس پہلو کو اٹھاتے ہیں کہ ہمیں یہ غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہمارے عزیزوں کو کون سی شے عزیز ہے اور سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ کس طرح سے ان کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اشفاق احمد نے بچوں کے نازک آبگینوں جیسے دلوں اور چھوٹی چھوٹی خواہشات کو عزت دینے کی بات بھی کی ہے کہ بچوں کے کھلونے، پالتو جانوران کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں اور ہمیں اس چیز کو سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی خاص طور پر

سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ایک شے کی اہمیت ہماری زندگی میں صفر ہو لیکن دوسرے کی زندگی میں، وہی شے زندگی کا باعث ہو جیسا کہ جیکی کی اہمیت، احسان کی زندگی میں کیا ہے یہ کوئی بھی نہ جان سکا۔ اس کے ننھے سے دل میں چھپا محبت کا دریا اسے زندگی کے کن طوفانوں کے مقابل کر دے گا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

اسی طرح ایک اور اخلاقی پہلو یہ بھی اس افسانے میں بیان ہوا کہ جب کوئی دفتر سے گھر آئے تو آتے ہی اس پر حملہ نہیں کر دینا چاہیے ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی غلط قدم اٹھالے۔ جیسا کہ جب پہلے خان کو امی سے صلواتیں سننی پڑیں تو اس نے بالکل بھی برا نہیں منایا۔ افسانے میں یوں مرقوم ہے کہ

''خان ہنسنے لگا اور اس نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا،''امی جان مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے، یوں سمجھو کہ میں اکیلا آپ کے گھر میں نہیں آیا۔ میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی بھی ہے''۔ سب ہنسنے لگے اور امی کے ہونٹ بھی پھیل گئے۔'' (۴۸)

لیکن یہی خان جب دوسری بار صلواتیں سنتا ہے تو اس کا ردعمل ہی مختلف ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''لیکن جب خان اندر داخل ہوا اسے بھی ایسی ہی صلواتیں سننا پڑیں تو وہ سیخ پا ہو گیا۔ آج شام اس کی ہیڈ کلرک سے جھڑپ ہو گئی تھی۔'' (۴۹)

اور غصے میں اس نے جیکی کو دبوچا اور ہمیشہ کے لیے کہیں چھوڑ آیا، غصے میں انسان کو کوئی بھی قدم اٹھانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ویسے بھی غصہ حرام ہے، یہ نکتہ بھی اسی افسانے میں اشفاق احمد بیان کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب سب کا غصہ اتر جاتا ہے تو وہ یہ توقع نہیں کرتے کہ خان واقعی میں جیکی کو کہیں چھوڑ آئے گا۔ لیکن ایسا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس وقت خان کے سر پر غصے کا بھوت سوار تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

''پھر پٹھان کا پوت، گھڑی میں اولیا، گھڑی میں بھوت، سائیکل باہر نکال کر جیکی کو ٹرنکوں والی کوٹھڑی میں جا دبوچا۔ وہ چلایا تو اس کا گلا دبا کہ خان ہے، احسان نہیں۔'' (۵۰)

اس طرح وہی خان جس کی مدد سے جیکی ہندوستان سے آیا تھا اسی کے غصے کی نذر ہو جاتا ہے۔ مثلاً

''ویسے تو یہ دانا پانی کے اختیار کی بات ہے، لیکن اگر خان کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو جیکی ہندوستان میں ہی رہ جاتا۔'' (۵۱)

اور پھر احسان کو کھو دینے کے بعد اسی خان کو ہمیشہ کے لیے یہ گھر بھی چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔

''خان نے لاٹھی ہاتھ میں لے کر دروازے پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور چل دیا۔اس نے تہیہ کر لیا کہ اگر احسان نہ ملا تو گھر واپس نہ آئے گا۔'' (۵۲)

محبتوں کو نظر انداز کرنے، ایک دوسرے کو نہ سمجھنے، ایک دوسرے کی اہم چیزوں کو اہمیت نہ دینے کے باعث ہی گھرانے آندھیوں کی نذر ہو جایا کرتے ہیں جو اس افسانے میں صاف دکھائی دیتا ہے اور اس کے ایک ایک پہلو کو قارئین کے سامنے بے نقاب کر کے اشفاق احمد محبتوں کی راہ میں کھڑی ان ناسمجھی کی فصیلوں اور غم و غصے کی دیواروں کو گرانا چاہتے ہیں تاکہ انسان و حیوان کی بقائے حیات میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔

اشفاق احمد افسانے ''سنگ دل'' میں بلاتخصیص مذہب و ملت انسانی ہمدردی، محبت اور خلوص جیسے جذبات کو کھل کر بیان کرتے ہیں۔ اس افسانے کو پڑھ کر یہ احساس ابھرتا ہے کہ 'محبت' کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور احساس کے لیے مخصوص اقوام نہیں ہے بلکہ 'انسان' خواہ کسی بھی مذہب سے ہوں انسانیت سے محبت کا درد رکھتا ہے۔جیسا کہ مذہبی بھید بھاؤ سے بالاتر اس کہانی کا مرکزی کردار دنیا میں صرف دو شخصیات سے ڈرتا ہے۔اشفاق احمد یوں لکھتے ہیں

''ابا جان کے بعد اگر مجھے کسی سے خوف آتا تھا تو وہ پتا جی تھے۔'' (۵۳)

کیونکہ پتا جی سے اس نے وہی محبت اور شفقت پائی تھی جو ابا جان سے، اسی طرح ''امر'' جب مسلمانوں کے بارے میں بات کرتا ہے کہ وہ صرف مارنا جانتے ہیں تو پمی اور افسانے کے ہیرو کے بیچ جو ذہنی مطابقت اور دلی احساس میں یگانگت نظر آتی ہے وہ قابل دید ہے۔'امر' نے وہ ماحول نہیں دیکھا جس میں ہندو مسلم پیار محبت سے زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی دوستی مثالی ہوا کرتی تھی۔ کمال کی بات یہ ہے کہ اشفاق احمد نے ہر تعصب سے پاک ہو کر سچائی کو افسانے میں ڈھالا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''شام کو ہم سیر کرنے ولگن میں گئے تو امر نے بتایا کہ ''اب یہ علاقہ مسلوں سے بالکل صاف ہو چکا ہے۔ مسلے بہت برے ہوتے ہیں۔'' اس نے ہوا میں گھونسا گھما کر کہا ''سب کو مارتے ہیں۔''

پمی نے اسے جھڑکا۔ ''یہ بڑا آوارہ ہو گیا ہے۔اسے ابا جان کے پاس لے جاؤ۔'' امر نے گھبرا کر پوچھا۔

''ابا جان کون؟''

''ہیں ایک......'' پمی ہنسی ''ہم سب ان سے پٹ چکے ہیں۔ ایک دفعہ تم بھی ان کی مار کھا لو گے تو ٹھیک ہو جاؤ گے اور ایسی بکواس نہیں کرو گے۔''

امر سہم گیا ''کیا وہ بھی مُسلے ہیں؟'' ہم دونوں ہنس پڑے۔'' (۵۴)

درج بالا اقتباس میں پمی ایک مسلمان کے بار میں کس محبت اور تیقن سے بات کر رہی ہے کہ یہ سب بکواس ہے کہ مسلمان مارتے ہیں یا برے ہوتے ہیں کیونکہ اس کی تربیت میں ''ابا جان'' کا بھی ہاتھ ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ امر بھی ان کے ہاتھوں سیدھا ہو جائے گا اور اس کے یہ خیالات بدل جائیں۔ 'امر' کو یہ سمجھ ہی نہیں کہ وہ اس وقت ایک مسلمان کے ساتھ اعتماد سے چل پھر رہا ہے۔ صرف سنا سنایا خیال اس کے لبوں پر ہے۔ اشفاق احمد پمی کے ہاتھوں حسنا کو رہائی دلا کر یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ سرحد کے دونوں جانب درد میں ڈوبے دل دھڑکتے ہیں تا کہ محبتوں کے بیج بوئے جا سکیں اور اس کے لیے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں نے بھی اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کی جان بچائی ہے۔ اشفاق احمد تعصب سے پاک، مذہب سے بالاتر، انسانیت کی بنیاد پر قائم اخلاقی اقدار کی پرداخت چاہتے ہیں تا کہ چاہت کے پھول حدوں میں محدود نہ ہو جائیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس کی آنکھوں میں غالبؔ کے اداس شعر چمکے۔ ''مجھے پھولوں سے بہت پیار ہے، میں ان پر جان دیتی ہوں۔ ہو سکے تو وہاں سے......'' حسنا اور دو بازیافتہ لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے ''ایسے پھول بھیجتے رہنا۔ میں تمہیں بہت یاد کروں گی......اور......اچھا اب تم جاؤ۔ دیکھو کتنی روشنی پھیل گئی ہے۔'' (۵۵)

پمی کو اپنی فکر نہ تھی۔ وہ ہر تعصب سے بالاتر صرف درد کی زبان سمجھتی تھی اور اس کے لیے وہ خود کو بھی قربان کر چکی تھی۔ یعنی اپنی محبت کو بھی الوداع کر دیتی ہے، اس سے بڑھ کر انسانی ہمدردی کی مثال اور کیا ہو گی۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''جہاں پمی کو اترنا تھا، وہاں ٹرک رکا۔ پمی نیچے اتری۔ حسنا کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے ہولے سے کہا۔ ''پمی'' وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میری آنکھیں دھندلا گئیں۔ پھیکی پھیکی سوگوار چاندنی میں اس نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ پھر اس کے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ ''الوداع''......، میرا سارا وجود کھوکھلا ہو گیا۔ الوداع، پمی۔'' (۵۶)

اور یوں پمی اپنی محبت کو کھو کر ایک مغویہ لڑکی کو بحفاظت اس کے وطن کی طرف روانہ کر دیتی ہے۔ اس افسانے کی

توسط سے اشفاق احمد نے سرحد کے دونوں جانب کے لوگوں کے دلوں میں موجود خلوص، محبت، ہمدردی اور ایثار وقربانی کی جو شمع روشن کی ہے وہ دلوں کی سیاہی سے نفرت کے داغ دھونے کی قابل قدر کاوش ہے۔

اشفاق احمد اپنے افسانے ''شب خون'' میں دق کے مریضوں کے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات کو بیان کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ عام لوگوں کا برتاؤ کیسا ہوتا ہے اور وہ کیا محسوس کرتے ہیں۔ گھر والے موجود ہونے کے باوجود ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے۔ سب کے ہوتے ہوئے وہ دنیا میں تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے پیارے انھیں ہسپتالوں میں مرنے کے لیے چھوڑ آتے ہیں۔ تبھی تو بیٹرس اسے ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھنے کی خواہش کرتی ہے کیونکہ بیماری میں وہی تیمارداری کرتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''بیٹرس کو عشق عباس سے ہی ہوا لیکن پیار سب سے زیادہ شقو پر آیا۔ اگر شقو صحت یاب ہو جائے، اس نے سوچا تو کتنا اچھا ہو۔ میں اسے کبھی گھر واپس نہ جانے دوں۔ وہ لوگ تو ناامید ہو چکے ہیں اور اب انھیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اگر ہوتی تو سالمی میں کئی بیڈ خالی تھے، کوئی ریزرو کروالیا ہوتا۔'' (۵۷)

ایسے مریض مرض کے ساتھ لڑتے لڑتے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے منہ سے اپنی موت کا پیام سنتے سنتے زندگی میں ہی زندگی سے عاجز آجاتے ہیں اور بجائے پروگریس کرنے کے روز بروز کمزور پڑتے جاتے ہیں۔ یا پھر اس قدر جینے کے لالچی ہوجاتے ہیں کہ ان میں بے حسی شدت اختیار کر جاتی ہے اور وہ اپنے سوا ہر کسی کو موت کی خبر سناتے اور تصور کرتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی رویہ مسٹر بھومکا کا بھی ہے کہ وہ اپنے سوا ہر کسی کو موت کی خبر سناتا ہے جبکہ شقو کے ہاں دوسری صورت نظر آتی ہے کہ وہ زندگی کا ایک ایک پل گن کر گزارتا ہے کہ کب موت آئے اور اس کی جان زندگی سے چھوٹے۔

شقو اپنے موذی مرض کے جراثیم، بیٹرس کے جسم میں منتقل کر کے مرنا چاہتا ہے لیکن ایسا اس لیے نہیں ہو پاتا کیونکہ بیٹرس بھرپور خلوص سے اس کی خدمت کر رہی تھی، محض ڈیوٹی سمجھ کر نہیں بلکہ اس کو شقو سے محبت تھی اور قدرت کو یہ ناانصافی منظور نہ تھی۔ اشفاق احمد دق کے مریضوں کی ذہنی حالت کے بدلتے ہوئے پہلو ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ عزیزوں کی بے حسی، غیروں کی بے رحمی، مسیحاؤں کے کاٹ دار جملے آخر مثبت سوچ کے حامل، زندگی سے جنگ کرتے ہوئے شقو کو اس مریضانہ ذہنیت کا مالک بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنی مسیحا کو بھی اسی کرب کا شکار دیکھنا چاہتا ہے جس کا وہ خود ہے۔ اشفاق احمد اس افسانے کے ذریعے شعبہ جاتی اخلاقیات کی بات کرتے نظر آتے ہیں کہ کیا ڈاکٹر کو مریض کے سامنے یہ کہنا چاہیے کہ:

''حیرت ہے یہ ابھی تک زندہ ہے۔'' (۵۸)

اور یہ جملے ان کی شخصیت پر اور صحت پر کس طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں اس افسانے میں ڈاکٹروں اور نرسوں کے رویے سامنے آتے ہیں اور یہ سبق ملتا ہے کہ اس پیشے سے وابستہ لوگوں کو کیسے مریضوں سے برتاؤ کرنا چاہیے۔ تا کہ مریض صحت یاب بھی ہوں اور زندگی کی امنگ بھی زندہ رہے اور کوئی شفقو اپنے مسیحا کے ہاتھ اپنی رالوں سے تر کرنے کے بارے میں نہ سوچے۔ اشفاق احمد مریضوں کے عزیز و اقارب میں بھی یہ احساس جگانا چاہتے ہیں کہ اپنے پیاروں کو کسی روگ کی بموجب خود سے الگ کرنے والے لوگ، موت سے پہلے ہی ان کو زندگی سے محروم کر دیتے ہیں جو سراسر ظلم ہے، زیادتی ہے۔ زہر دینے کے مترادف ہے۔

اشفاق احمد ''عجیب بادشاہ'' میں ایک ضدی، اکھڑ، بدتمیز مگر محبت اور عقیدت سے بھرے دل کے مالک نوجوان کی کہانی سناتے ہیں کہ یہ لڑکا اساتذہ کے سامنے بالکل بھیگی بلی بن جاتا ہے، یہ صرف اس لیے کہ اس فولادی باکسر کے دل میں استاد کا احترام ہے۔ استاد اور شاگرد کے محبت اور عقیدت کو اشفاق احمد نے بڑے سبھاؤ سے بیان کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''بابا جی کے سامنے اس نے کبھی سگریٹ نہیں پیا، اونچے نہیں بولا، ضد نہیں کی اور کسی بات سے انکار نہیں کیا۔ ڈائی نیمکس کی کامیابی دیکھتے ہوئے وہ زمان کو بلاتے اور کان پکڑ کر آہستہ آہستہ مسلتے جاتے اور کہتے ''یہ کیا کیا ہینگ والے، یہ کیا کیا؟'' زمان کے منہ میں گھنگھنیاں بھری ہیں، آنکھیں نیچی ہیں، جواب دینے کی سکت نہیں۔ اسی طرح کمان بنا کھڑا ہے۔ اگلا صفحہ پلٹ کر بابا جی اس کا کان چھوڑ کر پیٹھ ٹھونکتے اور خوش ہو کر کہتے ''میرا ہینگ والا ہے لائق، لیکن پاپی پڑھتا نہیں! مکے بازی پر جان دیتا ہے۔'' پھر اس کی کاپی بند کر کے کہتے ''جا میرے لیے ٹھنڈے پانی کا گلاس لا۔'' اور زمان فخر سے سر اونچا کر کے دروازے کی طرف یوں بڑھتا جیسے کسی نے دو جہان کی بادشاہی اسے بخش دی ہو۔'' (۵۹)

باکسنگ چیمپئن شپ جیتنے والے، بے دھڑک انسان بھی جب اپنے استاد کے سامنے آتے ہیں تو عزت و احترام سے جھک جاتے ہیں۔ جو جی میں آئے کہہ دینے والا شخص استاد کے سامنے یوں بے زبان ہو جاتا ہے گویا قوت گویائی نہیں رکھتا، کسی کا کام نہ کرنے والا شخص استاد کے لیے یوں پانی کا گلاس لینے دوڑا چلا جاتا ہے جیسے دو جہان کی دولت لینے بڑھ رہا ہو۔ اشفاق احمد نے استاد اور شاگرد کے اسی تعلق کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ اساتذہ کے احترام کا جذبہ ہماری اخلاقی

اقدار کا حصہ ہیں اور ہر دل میں یکساں رفتار سے دھڑکتا ہے۔ ہمارے ہاں کوئی کتنا بھی بڑا سورما ہو استاد کے سامنے چھوٹی سی معصوم بے زبان بھیڑ بن جاتا ہے کہ اب چرواہا اپنی مرضی سے جہاں مرضی لے جائے۔ اشفاق احمد ان اخلاقی اقدار اور روایات کا بیان کر کے آنے والی نسلوں کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اشفاق احمد ''بندرابن کی کنج گلی میں'' بیان کرتے ہیں کہ انسان جب تک اپنی اصلیت کے ساتھ زندہ رہتا ہے آسانی میں رہتا ہے اور کوئی ڈر، خوف، ملمع کاری کا بھید کھل جانے کا خدشہ اسے لاحق نہیں ہوتا۔ جیسا کہ نمدار جب تک کالج میں رہتا ہے اسے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''چونکہ کالج میں ہر کوئی جانتا تھا کہ میں سجاول مچھیرے کا لڑکا ہوں اس لیے مجھے اپنی غریبی چھپانے کی چنداں ضرورت نہ ہوتی۔ میرا ہر ہم سبق بڑی خندہ پیشانی سے مجھے اپنی کتابیں پڑھنے کو دے دیا کرتا۔ دوپہر کا کھانا اکثر اوقات میں اپنے ان دوستوں کے ساتھ ڈائننگ روم میں کھایا کرتا، جو ہاسٹل میں رہتے تھے۔'' (۶۰)

اور یہی نمدار جب لاہور پہنچتا ہے تو یہاں اس کی اصلیت کسی کو نہیں معلوم ہوتی جو اس کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''چونکہ یہاں کسی کو میرا اصلی نام معلوم نہ تھا اور میں نامدار صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا، اس لیے اور بھی مصیبت تھی، گردوپیش نے مجھے اپنی مفلسی چھپانے اور بڑا بننے پر مجبور کر دیا تو میں نے دونوں باتوں کو اپنا لیا۔'' (۶۱)

لیکن اپنی اصلیت چھپانے کے لیے صرف لنڈے کے کوٹ اور پینٹ ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ شخصیت دورخی ہو جاتی ہے اور بناوٹ کے باوجود انسان اپنے ماضی سے خوفزدہ رہتا ہے اور ہر وقت یہی پریشانی رہتی ہے کہ کہیں کسی پر اس کی اصلیت نہ کھل جائے۔

اشفاق احمد یہ بات زیر بحث لاتے ہیں کہ جو انسان اپنے اصل کے ساتھ، اپنی ذات کی سچائی کے ساتھ جیتا ہے اسے کوئی ڈر، خوف، خدشہ لاحق نہیں رہتا اور اس کے لیے زندگی کے ایام آسانی سے بسر کرنا ممکن رہتا ہے جبکہ دوسری صورت میں آپ نقلی روپ دھارن کر کے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے پیاروں کو بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ نمدار گھر واپس نہ جا سکا، کیونکہ وہ اپنے

خوابوں کے ٹوٹنے کے اعتراف سے ڈرتا تھا اور یہ صدمہ وہ اپنے گھر والوں کو نہیں دینا چاہتا تھا حالانکہ کئی مرتبہ ماں کی یاد نے ستایا لیکن وہ واپس پلٹ نہ سکا۔ ملاحظہ فرمائیے:

''کئی مرتبہ جی میں آئی کہ چاچا کو لکھ دوں کہ میاں کہاں ہو لیکن پھر خیال آتا کہ ماں کو میری موت سے زیادہ مجھے بنگلہ اور کار نہ ملنے کا دکھ ہوگا...... ماں ہر روز میری لالٹین صاف کر کے جلاتی ہوگی اور اس کے پاس ٹاپا لے کر بیٹھ جاتی ہوگی، جس میں وہ سہہ کی گولیوں کے بجائے اپنے آنسو پروتی ہوگی۔ ایسی بارشوں نے مجھے بے چین کر دیا۔ دریائے سندھ کے کنارے کی یہ دیہاتی زندگی مجھے شدت سے اپنا وطن یاد دلانے لگی اور میں نے تالپوروں کی نوکری چھوڑ دی۔'' (۶۲)

اور یوں نمدار، نمدار صاحب ہو کر نہ ہی محبت پا سکا اور نہ ہی ماں باپ کی شفقت، اسی لیے اشفاق احمد ایسی زندگی جینے کا درس دیتے ہیں جس میں آپ اپنی اصلیت کے ساتھ زندہ رہیں اور حقیقت کو تسلیم کریں، نہ کہ خوابوں خیالوں کی دنیا میں سفر کرتے کرتے تنہا رہ جائیں۔ اشفاق احمد اصل اور سچائی کے ہی صراط مستقیم پر چلنے کا درس دیتے ہیں اس لیے اس کی الٹ صورت میں ہونے والے نقصانات کا بھی بیان کرتے ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانہ ''بابا'' کی بنیاد انسانیت، انسانی محبت، ہمدردی اور عزت ہے۔ اس افسانے کے کردار محبت میں گندھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں تعصب کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی، انھیں رشتوں کا پاس ہے اور ایک دوسرے کا احساس ہے۔ افسانے کی ابتدا میں ہی جب ایلن وحید کو جگاتی ہے تو منظر ملاحظہ کیجیے، اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''ایلن اپنے مرمریں ناک کی گلابی پھننگ کو پیار سے وحید کے گالوں کے اس ریگ مال پر پھیرا اور دو کنکنے ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ کر اس کو ہلانے لگی۔ درفتنہ باز ہوا۔ وحید نے ایلن کے گریبان سے باہر لٹکی ہوئی طلائی صلیب کو دیکھا اور اسے اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ سورج کی کرن دبے پاؤں پھر باہر نکل گئی۔'' (۶۳)

وحید کا طلائی صلیب کو پیار سے چوم لینا اس بات کی غماز ہے کہ اس کے دل میں ایلن کے مذہب کے بارے میں بھی پیار و محبت کے جذبات ہیں، عقیدت ہے۔ وہ نہ صرف ایلن کی صلیب کو چومتا ہے بلکہ اس کے گھر والوں کے لیے اس کا اداس ہونا بھی سمجھتا ہے اور بار بار یقین دلاتا ہے کہ وہ جلد ہی اس کو ان سے ملوانے کے لیے لے کر جائے گا۔ اشفاق احمد

لکھتے ہیں کہ:

''وحید نے ایک دم اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کے کندھے پر ٹھوڑی رگڑ کر کہنے لگا ''اچھا! اچھا! ہم انگلڈن چلیں گے، پاپا سے ملیں گے۔ جوزف سے ملیں گے اور تمہارے سپنل کو ساتھ لے کر آئیں گے۔'' (۶۴)

اسی طرح ایلن وحید کے باپ ''بابا'' کے جذبات اور احساسات کی قدر کرتی ہے اور وحید کو بھی ہمیشہ ان کی عزت کرنے اور بات ماننے کا کہتی ہے۔ وہ ''بابا'' کے بارے میں ایسے ہی جذبات رکھتی ہے جیسے کوئی اپنے باپ کے لیے سوچتا ہے اور ان کی ہر خواہش کا احترام کرنا چاہتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ جب بٹر وحید سے اس کی نوکری کے بارے میں پوچھتا ہے تو ایلن یوں کہتی ہے کہ:

''مسٹر بٹر، میرے خاوند ایف۔آر۔سی۔ایس ہیں اور بجائے آپریشن کرنے کے زمین کھود کر آلو نکالنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ بابا جب انھیں پل پر بیٹھے گھوڑوں کی ٹخ ٹخ کرتے دیکھتا ہے تو خون کے آنسو پی کر رہ جاتا ہے۔ اس کا اس دنیا میں سوائے اس بیٹے کے اور کوئی نہیں۔ اپنی آبائی زمین کا بیشتر حصہ بیچ کر اس نے انھیں ولایت بھیجا، ان کی خوشنودی کے لیے مجھ سے شادی کرنے کی اجازت دی اور جب یہ تعلیم سے فارغ ہو کر لوٹے تو نوکری سے انکار کر کے بابا کے ارمانوں کا خون کر دیا اور آتے ہی اس جدی پشتی پیشے کو سینے سے لگا لیا۔'' (۶۵)

ایک میم کے منہ سے یہ مکالمات، بلاتعصب اشفاق احمد ہی کہلوا سکتے ہیں۔ مذہبی تعصب سے کام لے کر انھوں نے یہ نہیں کہلوایا اور نہ ہی پھیلایا کہ ایک میم کے دل میں باپ کے جذبات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہو سکتی۔ اس طرح بابا کا دل بھی ایلن کے لیے شفقت سے بھرا ہوا ہے اور دونوں کے درمیان مثالی محبت اور یگانگت اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا احساس نظر آتا ہے۔ اشفاق احمد اپنے افسانوں میں رنگ، نسل، مذہب کی تخصیص کو ختم کر کے انسانی محبت کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں کیونکہ ہر مذہب محبت، امن اور انسان دوستی کا درس دیتا ہے اور ایسے ہی مثبت اخلاقی اقدار کی پروان اور پھیلاؤ ہی ایک سچے ادیب کا اولین فرض ہے اور اس افسانے میں اشفاق احمد نے ایلن کی محبت نہ صرف شوہر، بچے اور اپنے بوڑھے سسر سے دکھائی ہے بلکہ ایلن کی ہمدردی جانوروں سے بھی اسی طرح سے ہے اور وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر بچھڑے کی جان بچانے

کے لیے پانی میں کود پڑتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''ایلن نے ایک کمبل کونے میں بابا اور مسعود کے لیے بچھا دیا اور دوسرا اپنے گرد لپیٹ کر کپڑے اتارنے ہی لگی تھی کہ چتلی کے ڈکرانے کی آواز آئی۔ وہ زور زور سے ڈکراتی ہوئی اصطبل کی طرف آ رہی تھی۔ ایلن نے ایک دم کہا'' بابا چتلی کا بچھڑا کھونٹے سے بندھا رہ گیا...... تمہیں تیرنا آتا ہے؟، بابا نے منہ پھاڑ کر کہا۔ ''نہیں''، ایلن کمبل پرے پھینک کر اصطبل سے باہر بھاگ گئی۔''(٦٦)

اور ایسی اندھیری رات جب شدید بارش میں ہاتھ ہاتھ کو سجھائی نہیں دیتا۔ ایلن بچھڑے کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گویا بعد میں یہ خمیازہ اسے اپنی جان دے کر ادا کرنا پڑتا ہے۔

اشفاق احمد اس افسانے میں انسانیت کے بلند معیار کو پیش کر کے لوگوں کے دلوں سے تعصب کی اندھیری سیاہی کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسرے مذاہب کی جانب سے اچھا رویہ پیش کر کے اپنی سوچ اور قلب کو وسیع کرنے کی جانب اشارہ کرتے ہیں تا کہ مثبت اخلاقی مذہبی اقدار پنپ سکیں اور سوچ کے وہ اندھیرے باب جو صدیوں سے نفرت و حقارت کی صورت نسل در نسل منتقل ہو رہے ہیں ختم ہو سکیں۔

اشفاق احمد نے ''پناہیں'' میں سختی سے بچوں کو مارنے کی مذمت کی ہے اور اس مار سے ہونے والے منفی اثرات کو بیان کیا ہے۔ آصف ہنستا کھیلتا، شرارتی اور ذہین بچہ تھا، جو ماں باپ کی آپسی چپقلش کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

''اماں صرف جھڑکیوں اور گھرکیوں پر ہی اکتفا نہ کرتیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ طمانچہ یا دھموکا بھی لگا دیتیں اور پھر آصف سے تو انہیں خاص چڑ تھی جو بیٹھے بٹھائے ابا کے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا۔''(٦٧)

اس طرح باپ سے محبت کی وجہ سے آصف ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور پھر جب اس کی ماں خاص طور پر اس کے ابا کو سنانے کے لیے تقریر کرتی ہے کہ جب آصف کے ساتھ جانے کے لیے ضد کرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب رضامند نہیں ہوتے تو کہتی ہیں کہ:

''کیا کرے گا وہاں جا کر؟ پہلے کون سی ایسی خاطر ہوئی جو اب پھر تیار ہو گیا ہے۔ ایک بار جو شرما شرمی لے گئے تو تو اسی پر بھول بیٹھا۔ ذرا آئینے میں اپنا حلیہ خود دیکھ ہلدی کی گانٹھ بنا ہوا ہے۔ دو دن بخار

چڑھا اور اٹھا کر میرے پاس بھیج دیا۔ کسی کی بکری، کون ڈالے گھاس! باپ کا دل اور ایسا کٹھور...... محلوں کا خواب دیکھے گا تو جھونپڑے کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔'' (٦٨)

یہ باتیں ماں کیسے جا رہی ہے، اس کا مقصد صرف اپنے شوہر کو سنانا ہے۔ بچے کی شخصیت پر اس کے کیا اثرات ہو رہے ہیں وہ اس سے بے خبر، دل کی بھڑاس نکالے جا رہی ہے اور پھر ڈاکٹر آصف کو لے آتے ہیں اور راستے میں جو اس کے ساتھ سلوک کرتے ہیں وہ بھی قابل مذمت ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''اس کے منہ سے مسلسل چیخوں کے علاوہ ''ابا جی میری توبہ! ابا جی میری توبہ! لرز لرز کر نکل رہا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب ایک ہی رفتار پیٹے جاتے تھے۔ حرام زادے چغل خور، لگائی بجھائی کرتا ہے۔ اس کمینی سے میری شکایتیں کرتا ہے۔ اب درست ہو جائے گا ذلیل انسان۔ کتے کی اولاد۔ سور کا بچہ...... ایسی فطرت عورت میرے منہ آئے۔ ایک سید زادے کے منہ۔ جس نے آج تک کسی سے تو نہیں کہلوایا تو نہیں کہلوایا، حرام زادے تو نہیں کہلوایا اور پھر ہر تو کے ساتھ کنڈے کی ''ژوں'' میں بھی اضافہ ہوتا گیا مگر ادھر سے وہی صدا بلند ہوتی۔ وہی ''ابا جی میری توبہ، ابا جی میری توبہ'' جو آہستہ آہستہ دیوؤں کے کنویں میں محبوس سیاہ آنکھوں والی آدم زاد کی سسکیاں بنتی گئی۔'' (٦٩)

چار سال کے بچے کے ساتھ یہ اذیت ناک سلوک، اپنی بیوی کی طرف سے سارا غصہ اس سرکنڈے میں منتقل ہو کر نازک بدن پر معصوم ذہن پر برستا رہا اور پھر آصف واقعی بدل گیا۔ بقول اس کے باپ کے ''اب تو درست ہو جائے گا'' تو وہ ایسا درست ہوا کہ باپ کی لاکھ کوششوں کے باوجود اس کی شخصیت کا اعتماد لوٹ نہ سکا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''اب ہسپتال میں نہ کوئی شرارت ہوتی تھی، نہ شور مچتا تھا۔ اسلم کی ماں نے کئی مرتبہ اسلم سے کہا کہ اپنے دوست کو بھی کہانیاں سنانے کے لیے لایا کر مگر دوست آتا تو اسلم لاتا۔ کئی بار اسلم نے ریت کے گھر بنانے کی تجویز پیش کی۔ پچھلے دنوں کی مزیدار کھیلیں یاد کرائیں۔ ہسپتال سے چیزیں چرانے کا لالچ دیا مگر وہ نہیں مانا۔'' (٧٠)

اور یوں ایک ہنستا مسکراتا چہرہ اپنے بچپن کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتا ہے اور لاکھ کوشش پر بھی واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب آصف میں پہلا والا آصف دیکھنا چاہتے تھے، اس کی شرارتوں پر ہنسنا چاہتے تھے، اس سے باتیں کرنا چاہتے

تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کو کھوتے ہی چلے جاتے ہیں۔ آصف وہ مار کبھی بھی فراموش نہیں کر پاتا اور اس کی شخصیت کی ساری بے باکی، محبت، خلوص، دلیری، اعتماد سب مار کی نذر ہو کر خوف میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہو پاتی۔

والدین کا سلوک ان کے منہ سے ادا ہوئے کلمات اور ان کا آپس میں رشتہ ہی بچے کی شخصیت کو بناتا اور سنوارتا ہے اور یہی بگاڑ کا سبب بھی بنتا ہے۔ اس لیے اشفاق احمد نہ صرف بچوں کے والدین کو یہ تلقین کرتے نظر آتے ہیں کہ آپ کا آپس میں رشتہ کچھ بھی ہو لیکن بچوں کے سامنے زبان اور ہاتھ کو کنٹرول میں رکھیں اور اپنی محرومیوں کا ازالہ بچوں کے ساتھ ناروا سلوک کر کے نہ کریں اور نہ ہی کوئی اور ایسا رویہ ان کے ساتھ کریں کہ عمر بھر کے لیے ان کو کھو دیں۔

اشفاق احمد نے ''امی'' میں ایک کردار کو مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا ہے جس کی ماں اس کی تعلیم و تربیت کے لیے دوسری شادی کرتی ہے لیکن وہ اس بات کو فراموش کر ڈالتی ہے۔ مثلاً:

''مسعود کی ماں نے اپنے خاوند کی موت کے ایک سال بعد ہی اپنے دوست کے رشتہ دار سے شادی کر لی تھی۔ اول اول تو اس کی دوسری شادی کا مقصد مسعود کی تعلیم و تربیت تھی لیکن اپنے دوسرے خاوند کی جابرانہ طبیعت کے سامنے اسے مسعود کو تقریباً بھلا ہی دینا پڑا۔'' (۷۱)

اور ایسی ماؤں کے بچے انھیں تمام عمر کوسنے کے سوا کچھ نہیں کرتے جیسے موجودہ افسانے میں جب ماں بھی اپنی نہ رہی اور جابر سوتیلے باپ کے رحم و کرم پر مسعود کو رہنا پڑا تو اس کا رشتہ اپنی ماں سے بھی ٹوٹ گیا۔ اشفاق احمد یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''خوف، نفرت اور تشکر کے ملے جلے جذبات سے مسعود کی آنکھیں پھٹتیں، بند ہوتیں اور پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتیں اور وہ نوٹ اپنی مٹھی میں دبا کر ماں کو بتانے دوسرے کمرے کی طرف چل پڑتا اور چچا اپنے کمرے میں حقہ بجاتے ہوئے ہانک لگاتا ''فیس دے دی ہے جی تمہارے شہزادے کو...... ڈپٹی صاحب کو!'' یہ سنتے ہی مسعود ایک دم رک جاتا اور جی ہی جی میں اپنی ماں کو ایک گندی سی گالی دے کر وہ الٹے پاؤں اسی کوٹھڑی میں جا کر بستہ باندھنے لگتا۔ چچا جیسے بیہودہ آدمی سے شادی کر کے اس کی ماں اس کی نگاہوں میں بالکل گر چکی تھی اور وہ چچا کی طعن آمیز باتوں کا بدلہ ہمیشہ انہی کو گالی دے کر چکایا کرتا۔'' (۷۲)

اشفاق احمد مسعود کی شخصیت کے دو رخ دکھاتے ہیں۔ ایک طرف ماں ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے لیکن لا پروا رہی ہے۔ دوسری طرف امی ہیں جو دوست کی ماں ہے لیکن اپنے بیٹے کی طرح سے اسے چاہتی ہے اور مسعود ان کی عزت دل سے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب گلریز کو روپوں کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ ادھار رقم اٹھا کر جوا کھیلنے چلا جاتا ہے اور اٹھارہ سو کی رقم لے کر گھر کی طرف بڑھتا ہے اور فکر مند ہے کہ باقی دو سو روپے کہاں سے آئیں گے۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''پھر وہ اپنے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ تو کل اٹھارہ سو ہوئے اور گلریز نے دو ہزار مانگے ہیں۔ باقی دو سو کا بندوبست کیوں کر ہو گا اور وہ ابھی باقی دو سو کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے گلے میں صافہ ڈال کر اسے زمین پر گرا دیا۔ گرتے ہی ایک تیز دھار چاقو کا لمبا پھل اس کے سینے سے اتر کر دل میں اتر گیا۔'' (۷۳)

اور یوں مسعود اپنے دوست گلریز اور امی کی مجبوری اور ضرورت کو پورا کرنے کی فکر میں اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ برے راستوں کو اختیار کرنے کا نتیجہ بھی برا ہی ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان برائی کے راستوں پر قدم کیسے اٹھتے ہیں اور اس افسانے میں اشفاق احمد نے وہ حالات کھلے لفظوں میں بیان کر دیے ہیں کہ کیسے ہماری بچپن کے حالات و واقعات اور اردگرد کا ماحول ہمارے مستقبل کے راستے متعین کرتے ہیں۔

یہ افسانہ نہ صرف والدین کے اخلاقی رویوں کے لیے سرزنش کے طور پر لکھا گیا ہے بلکہ ایسی راہوں پر چلنے والوں کے لیے نتیجہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ اس دلدل میں اترنے والے چاہ کر بھی برائی کے برے اثرات سے بچ کر نہیں نکل سکتے اور آخر ان کی زندگی حادثوں کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ مسعود کا مقصد اس بار نیک تھا، وہ امی اور گلریز کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ مرتے دم تک اس کی یہی چاہ تھی، اس کے لبوں پر بس ایک نام تھا، اپنی محسن امی کا یا جس سے اسے ممتا ملی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے

> ''مٹھی میں پکڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا ''امی......می......میں......امی......''
>
> لہو کی آخری بوند زمین پر گری اور اس کی مٹھی ڈھیلی ہو گئی۔ امی نے ٹھنڈے پانی میں انگلی ڈبو کر ایک قطرہ کٹ کیٹ پر ٹپکاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا ''ابھی تک آیا نہیں!'' (۷۴)

اور یوں مسعود چاہ کر بھی امی کی مدد نہیں کر پاتا۔ اشفاق احمد ایسے شخص کو نیک نیتی کے باوجود موت کا شکار ہوتا دکھا کر قارئین پر یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ برے راستوں پر چلنے کا نتیجہ برا ہی ہوتا ہے چاہے آپ کے حالات کیسے بھی ہوں آپ کو سیدھے رستے پر چل کر دین و دنیا میں سرخروئی حاصل ہو سکتی ہے۔ جوئے کی لت کے شکار انسان کی موت یہ اشارہ کرتی ہے کہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جو آپ کی نیکیاں بھی چھین لیتا ہے اور یہ توفیق نہیں دیتا کہ آپ اپنا روپیہ نیک مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔ اشفاق احمد معاشرے سے اخلاقی برائیوں کا خاتمہ کر کے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی نشو و نما چاہتے ہیں۔

ج۔ گڈریا۔ اُجلے پھول

''گڈریا'' اشفاق احمد کا شاہکار افسانہ ہے۔ مذہب، سماج، دوستی، محبت، ایثار کی معراج اس افسانے میں باکمال ہے۔ حکمت کی باتیں، اقوال کی صورت ذہن و دل کو روشن کرتی چلی جاتی ہیں۔ انسان افسانہ پڑھتے پڑھتے ٹھہر سا جاتا ہے اور اک ایسے سفر کی جانب گامزن ہو جاتا ہے جہاں معنی کے کئی جہاں اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ جیسے کہ داؤ جی اپنی بیٹی بی بی کو قرۃ کہہ کر پکارتے ہیں اور جب بے بے (ان کی بیوی) اس پر ناراض ہو کر گالیاں دیتی ہے تو وہ جو کہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا، اس کے منہ میں جو آتا، کہتی چلی جاتی، پہلے کوسنے، پھر بددعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤ جی کہتے ''ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو......تم انھیں روکومت، انھیں ٹوکومت۔'' (۷۵)

مذہبی اخلاقیات میں تعصب کی کوئی جگہ نہیں، انسان جو اخلاق کی ہر تعریف میں سب سے اعلیٰ منصب پر فائز ہے، وہ محبت کو پا جائے تو، اللہ کا ہو جاتا ہے اور خود بخود مذہب کا احترام کرنے لگ جاتا ہے۔ جب گولو نے پہلی مرتبہ داؤ جی کے کہنے پر سورۃ فاتحہ سنائی تو داؤ جی کا احترام قابل دید تھا مثلاً۔

> ''جب میں سنانے لگا تو انھوں نے اپنا پائجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب میں نے ولاالضالین کہا تو میرے ساتھ ہی انھوں نے بھی آمین کہا۔'' (۷٦)

استاد اور شاگرد کے رشتے میں جہاں داؤ جی اور گولو کے رشتے میں محبت اور محنت نظر آتی ہے اس سے کہیں بڑھ کر

داؤ جی اپنے استاد سے محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ مثلاً

''میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔ داؤ جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور
آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں؟
اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟
داؤ جی نے مسکرا کر کہا ''جو طویلے کے ایک خر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی چیت رام ہے، یہ منشی جی
ہیں، وہ مسیحا نہ ہو وہ آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو۔'' (۷۷)

استاد شاگرد کی اس محبت میں مذہب، ذات پات کی تخصیص کہیں دکھائی نہیں دیتی بلکہ ایثار ہی ایثار ہے۔ جیسے داؤ جی کے استاد کے ہاں بغیر مذہب کی قید کے درِفیض سب کے لیے کھلا تھا اسی طرح گولو بھی داؤ کے ایک سکھ کو مومن کہہ دینے پر چپ سا ہو جاتا ہے لیکن کہتا کچھ نہیں کہ داؤ جی کو دکھ ہو گا، یہ جبر وہی کر سکتا ہے جو دلوں کو جیتنا جانتا ہو اور وہ بھی جن دلوں میں رب بستا ہو۔ مثلاً:

''اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی میں میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لیے ہوا تھا کہ اگر
میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات نکلے گی جس سے داؤ جی کو بڑا دکھ ہو گا۔'' (۷۸)

داؤ جی نے گولو کو اپنی اولاد سے بڑھ کر پیار دیا، بیٹے کی طرح عزیز رکھا۔ گولو کی تمام بدتمیزیوں کو برداشت کیا لیکن اس کو پڑھانے سے نہیں چوکے۔

اشفاق احمد نے ''گڈریا'' کے مرکزی کردار نے اپنی زبانی، اپنی تمام تر کوتاہیوں کا اعتراف کیا، اپنے آپ کو نیچا دکھا کر اپنے استاد کو سب کی نظر میں اونچا کر دیا ہے۔ ہر عیب خود میں ڈال کر، ہر اچھائی اپنے استاد میں ڈال دی ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے، انھیں عالم فاضل، دین دار، محبتی دکھایا ہے اور استاد ہونے کے شعبے کے ساتھ جو اخلاقیات کا درس دیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ اس پیشے میں اخلاق کے ہر معیار پر داؤ جی کا کردار پورا ہوتا ہے۔ اساتذہ جن کے ہاں فیض در بلا تخصیص مذہب، حسب نسب سب کے لیے کھلا ہے، معاشرتی اعتبار سے نیک و بد، اچھے برے انسانوں کے رویوں کو پیش کیا ہے۔ اشفاق احمد کا یہ افسانہ اردو ادب میں اخلاق کا بہترین نمونہ ہے۔

اشفاق احمد کے افسانے ''گل ٹریا'' میں انسان اور جانور (کتا) ایک سطح پر آ جاتے ہیں۔ ''ت'' بھی کسی کے جھانسے

میں آ کر جا ہے وہ جھانسا دولت ہی کا تھا، بڑی لہک کے ساتھ، یہ لہک یقیناً دولت کو پانے کی کامیابی کی تھی کسی اور کی کار میں سوار ہو جاتی ہے۔ اشفاق احمد انسان اور کتے کو ایک جیسا قرار دے کر ثابت کر کے دراصل انسان کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ جانداروں میں سب سے بالا ہے تو پھر جانور وفاداریوں میں اس سے آگے یہ اس جیسا کیوں ہے، یہ لمحہ فکریہ اپنے قارئین کے اندر جگاتے ہوئے اشفاق احمد کا یہ جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ وہ انسان کو اشرف المخلوقات اور انسانیت اخلاق کے اس معیار پر دیکھنا چاہتے ہیں جو ابتداء سے انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔''ت'' کی بے نیازی پر مصنف کا جی چاہتا ہے کہ وہ اسے گولی سے اڑا دے۔ ملاحظہ فرمائیے::

> ''اس نے سر جھکا کر کار میں ایسے قدم رکھا جیسے وہ بھیا کو جانتی ہی نہیں۔ آج میرے پاس پستول ہے لیکن وہ چل نہیں سکتا۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے کالا ڈبو گل ٹریا کو لیے جاتا ہے اور میں اپنے پیارے بھیا کی مدد نہیں کر سکتا۔'' (۷۹)

کالا ڈبو تو گل ٹریا کو چپکے سے لے کر جاتا ہے اور دونوں بھائی ابا کا پستول لے کر نشانہ باندھے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن یہاں دن دیہاڑے کسی کی محبت کھو رہی ہے جان سے عزیز شے جا رہی ہے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گویا یہاں جانور انسان سے بالاتر ہو گیا۔ اس پیغام کے ذریعے اشفاق احمد بطور ایک مخلص ادیب کے معاشرے میں محبت کی اہمیت پر زور دینے پر مصر ہے کہ بڑھتی ہوئی دولت کی ہوس میں محبت کہیں گم ہو کر دفن ہو رہی ہے۔

اشفاق احمد کا افسانہ''تنکہ'' محبت کی ایک ایسی کہانی ہے جس کا آغاز داستانوی انداز سے ہوتا ہے لیکن اس میں حقیقی زندگی کے تلخ اور سنگین سچ موجود ہیں اور یہ طبقاتی تقسیم، دولت کی تقسیم اور انسانیت کی تقسیم کی صورت آج بھی ہمارے معاشرے کا المیہ ہیں۔ کہانی کے آغاز میں ہی اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ امیروں اور غریبوں کے شوق مختلف ہوتے ہیں اور اگر غریب کا لڑکا پڑھنے لگ جائے تو یہ اس کے لیے برائی سمجھا جاتا ہے جیسے کہ کب صوبیدار رتے خان کا بیٹا پڑھنے لگ جاتا ہے تو مصنف لکھتے ہیں کہ:

> ''صوبیدار رتے خان کے لڑکے کو پڑھنے کی لت پڑ گئی''۔ (۸۰)

''لت'' کا لفظ پڑھتے ہی قاری کا ذہن پریشان ہو جاتا ہے کہ اب پڑھائی کا انجام برا ہو گا۔ جب اسی غریب لڑکے کو گاؤں کے مالک پیرزادہ صاحب کی بھتیجی سے محبت ہو جاتی ہے تو بجائے وہ اس محبت کو محسوس کر کے خوش ہوتا وہ سوچ میں پڑ جاتا

ہے اور وسوسے اسے ڈرانے لگتے ہیں۔

طبقاتی تقسیم کی یہ مثال پیرزادہ صاحب اور ریتے خان کے درمیان بھی واضح ہے کہ غریب چاہے جتنا مرضی پڑھ لکھ جائے، نام اور عزت کما لے لیکن لوگ دولت اور رتبے کو ہی سلام کرتے ہیں۔ شرافت، ایمانداری اور محنت کی یہاں کوئی قدر نہیں ہے۔ جیسا کہ اس افسانے میں بھی ملاحظہ فرمائیے:

''سارا گاؤں پیرزادہ صاحب کی اس لیے عزت کرتا تھا کہ وہ گاؤں کے مالک تھے، ان کی بے شمار زمینیں تھیں۔ ان گنت مزارعے......لیکن لوگ ریتے خان کی عزت نہ کرتے تھے حالانکہ اس کے پاس ملٹری کراس تھا۔ اس نے گاؤں کی بہو بیٹی کو زندگی نہ تاکا تھا اور اس نے کسی کو نہ ستایا تھا۔'' (۸۱)

عالیہ کی منگنی عزیز الدین سے ہو جاتی ہے۔ تو وہ بجائے احتجاج کے یا اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کے سرور کو ایک نئے راستے پر ڈال دیتی ہے کہ تم بھی انیس ہزار روپے کماؤ، ڈھیر سارا روپیہ کماؤ تو ابا جی انکار نہیں کریں گے لیکن یہ محبت تو نہیں تھی، یا شاید عطیہ کی محبت میں وہ حوصلہ اور ہمت، دلیری نہیں تھی۔ وہ سرور سے کہتی ہے کہ:

''جب تک تمہارے پاس کافی روپے ہو جائیں گے۔ تم ایک ایک پائی جمع کرتے رہنا اور دو سال بعد اپنی کار میں گاؤں آنا۔ اس وقت تو ابا جی انکار نہ کر سکیں گے۔'' (۸۲)

اور یوں سرور اپنی زندگی چونیوں اور اٹھنیوں کے گننے میں وقف کر دیتا ہے۔ ڈاک خانے کے دونوں بابو اس کو بے حد کنجوس سمجھتے تھے۔ روپے کی ضرورت، محبت کی محرومی نے اس کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ ہر آنے جانے والے کو روپے کی اہمیت کے بارے لمبی لمبی تقریریں کرتا، وعظ کرتا یہاں تک کہ لوگوں نے اس سے عاجز ہو کر سیونگ بینک میں روپیہ رکھنا بند کر دیا۔ مثلاً ملاحظہ کیجیے:

''سرور اپنی کرسی سے اٹھتا اور کھڑکی کے پاس آ کر کہتا ''روپیہ کیوں نکلواتے ہو بھائی، پچیس روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ سینکڑے کی ایک چوتھائی۔ روپیہ نکلواؤ نہیں جمع کرو......جمع کرو، جمع کرو۔ پھر تمہاری عزت ہو گی۔'' (۸۳)

اور اپنی محبت کو پانے کی جستجو میں چونیوں، اٹھنیوں اور روپیوں کو گننے کی دھن میں کب اس کے پاس سے عزیز الدین کے نام ہیپی میرج کا تار گزر جاتا ہے اسکو خبر ہی نہیں ہوتی اور اسی طرح ایک دن اس کی اٹھنی پٹڑی پر گر جاتی ہے، گاڑی بڑھتی چلی

آتی ہے لیکن سرور اٹھنی کو ڈھونڈنے میں مگن اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ مثلاً

''گاڑی بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اٹھنی پتھروں میں جا چھپی تھی۔ لوگ پلیٹ فارم پر شور مچا رہے تھے۔ انجن فلک شگاف وسل دے رہا تھا اور سرور پتھروں کو تیزی سے ہٹائے جاتا تھا...... وہ ہر سنگریزے کی طرف بھاگتا، ہر اٹھنی کی طرف لپکتا اور ہر کرن پر ٹوٹ کر گرتا...... رکتا ہوا انجن سرور کی طرف بازو پھیلائے بڑھ رہا تھا۔ کھڑ ڑنک، ڑنک، کھڑ ڑنک......ن......ن......ک......ڑ ڑنک......'' (۸۴)

اور یوں محبت کی وہی روایتی کہانی ایک بار پھر اپنے انجام کو پہنچتی ہے اور سرور کی محبت دم توڑ دیتی ہے۔ اشفاق احمد اس افسانے کے ذریعے معاشرتی ناہمواریوں اور غیر انسانی رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان سے نقاب اٹھاتے ہیں تاکہ ان کو ختم کیا جا سکے۔ تعلیم کی، اخلاق کی، خلوص کی اور انسانیت کی قدر ہو، جہاں محبت کرنا بھی انسان کا حق سمجھا جائے اور اس کا یہ حق اس کو عزت سے دیا جائے۔ جہاں دولت کے نام پر سلام نہ کیا جائے، جہاں کاموں کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ انیس ہزار کے لیے زندگیاں برباد نہ کی جاتیں جہاں اٹھنی کے لیے کوئی سرور اپنی زندگی نہ گنوا دے۔ ایسا معاشرہ ایسی صورت میں ہی ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ جب ان اخلاقی قدروں کو معاشرے میں عام کیا جائے اور انسانیت کی قدر کی جائے اور سب میں یہ شعور جاگے تاکہ انسان اہم ہو جائے اور احساس کا بول بالا ہو۔

اشفاق احمد اپنے افسانے ''حقیقت نیوش'' میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ معاشرے کے اس کردار نے ان سے یہ کہانی لکھوائی تاکہ ایسے رویوں کی بیخ کنی کی جا سکے۔ اشفاق احمد نے اس افسانے میں اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ انسانوں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں ان کی طرح طرح کی عادات اور فطرت ہوتی ہے جیسے کہ جمیل کی فطرت کے ذریعے وہ خاص طور پر لڑکیوں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ ان کو بھی ''محبت'' کی راہ پر چلتے وقت ایک بار سوچ لینا چاہیے، پھر دوسرے شخص کو الزام دینا چاہیے۔ مثلاً وہ جمیل کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

''جمیل بے وفا نہیں تھا یز فیک تھا۔'' (۵۵)

اسی طرح نجمہ پر جب جمیل زبیدہ کی محبت کی بات کھولتا ہے تو وہ جمیل کو بہت برا کہتی ہے۔ حقیقت نیوش یہ الزام صرف جمیل کو دینے کو تیار نہیں بلکہ نجمہ کو بھی اس میں شریک سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''میں بھی یہ رمزیں سمجھنے سے عاری تھا ورنہ نجمہ سے ضرور پوچھتا کہ بھلا اس نے کسی جولائی کی انیس یا

کسی اگست کی سات تاریخ کو صبح کے ساڑھے دس بجے یا شام کو پونے چار بجے جونہی اس کی محبت شروع ہوئی جمیل سے یہ کیوں نہ پوچھ لیا کہ اسے کسی اور سے محبت تو نہیں۔'' (۸۶)

یہی حال مس تیلما اور بلقیس کا بھی تھا دونوں ہی بغیر یہ دیکھے کہ اگلا شخص آپ کی محبت کا متحمل ہو گا کہ نہیں محبت کی اندھی کھائی میں اترتی چلی جاتی ہیں مثلاً مس تیلما جب صحت یاب ہوتی ہے یا غم کی کیفیت سے نکلتی ہے تو سیدھی جمیل کی طرف ہی بڑھتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''جب وہ ہنسنے لگی تو اسے ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہوئی جو اس کی ہنسی میں شرکت کرے اور اس کی ہنسی جس پہلے آدمی سے ٹکرائی تھی وہ سوائے جمیل کے اور کوئی نہ تھا۔'' (۸۷)

اسی طرح ''بلقیس'' جو بیوہ ہے اور ہر رشتے سے انکار کر کے غم و اندوہ میں ڈوبی رہتی ہے۔ اور 'میر' کے اشعار پڑھتی ہے وہ بھی جمیل کی طرف خود ہی بڑھتی ہے۔ مثلاً

''جمیل ہاتھ دھونے کے لیے اٹھا تو آپا نے دروازے کے قریب آ کر کہا۔ ''آپ کے پاس اتنے رسالے آتے ہیں مگر آپ نے ایک بھی نہ بھیجا۔'' جمیل کوئی جواب نہ دے سکا اور کتنی دیر ایسے ہی ساکت و جامد کھڑا رہا۔'' (۸۸)

یوں لگتا ہے کہ اس افسانے میں جہاں اشفاق احمد مرد کی فطری کمزوری کا بیان بہت ہی میٹھے انداز سے کرتے ہیں اور بہت سی جگہوں پر اسے نرم دل، ہمدرد انسان کے لفظوں میں لپیٹ کر مرد کے ''فلرٹ'' کو مارجن دیتے چلے جاتے ہیں وہاں ایک سچے ادیب کا فرض نبھاتے ہوئے عورتوں کے لیے یہ پیغام دیتے ہیں کہ اول تو محبت کی راہ کٹھن ہے۔ اس پر چلنا محال ہے اور اگر یہ وہ جذبہ ہے جس پر اختیار نہیں ہے تو پھر گلہ کیا اور طنز و ملامت کیا۔ جبکہ اس افسانے کی چاروں خواتین، زبیدہ، نجمہ، مس تیلما اور بلقیس اپنی اپنی خواہشوں کی تسکین کے لیے جمیل کی طرف بڑھی اور سچائی جان کر کچھ پیچھے ہٹی اور کچھ کو جمیل نہیں اپنا سکا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ اخلاقی جرأت کی کمی نے بہت سی زندگیوں کو حادثات کی نذر کر دیا۔

''توشے بلے'' میں اشفاق احمد نے اخلاقی کمزوری کے اس نکتے کو اجاگر کیا ہے کہ اخلاقیات کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ آپ کی شرافت دوسروں کی زندگی کا آزار بن جائے اور خود آپ کی کمی بن جائے، ''حقیقت نیوش'' کے جمیل کے برعکس یہ لڑکا شریف ہے لیکن کمزور طبع ہے یا کم ہمت ہے جس کے باعث نہ خود خوشی حاصل کر پاتا ہے اور نہ یہ دوسروں کے لیے سکون و

راحت کا باعث بن سکتا ہے۔اس کی فطرت کو اشفاق احمد یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''وہ بڑا ہی کمزور طبیعت اور شریف انسان تھا۔ ہر وقت کسی گہری سوچ میں کھویا رہتا لیکن سوچ کی اونچی نیچی گھاٹیوں میں ارادے کی ایک بھی کونپل نہ پھوٹتی۔''(۸۹)

وہ شخص خود بھی پشیمان ہے لیکن خود اظہار کرنے کی جرأت نہیں رکھتا، کچھ کہنے کی ہمت جٹا نہیں پاتا بلکہ خود کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑے ہوئے ہیں۔مثلاً

''جب ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ اس کی نسبت اس کے چچا کے یہاں ہو چکی ہے تو میں نے پوچھا کہ ''تمھیں میری پکار سنائی نہیں دی تھی۔ میں تمھیں آواز دیتی رہی، سال ہا سال تک تمہارا انتظار کرتی رہی اور تم آئے بھی تو اپنا دام کسی اور کے ہاتھوں میں تھما کر!'' یہ سن کر اس کے آنسو بھر آئے اور وہ جواب نہ دے سکا۔''(۹۰)

ایسا شخص جو جواب تک دینے کی ہمت نہیں رکھتا تو کیا وہ محبت کرنے کی ہمت رکھتا ہے اور اگر اس کا جواب یہ ہے کہ محبت تو ہو جاتی ہے تو پھر اشفاق احمد اس بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے اور تمام کائنات پر حاکم بنایا ہے کہ وہ اس کو زیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو پھر ارادے کی کونپل کا اس میں نہ پھوٹنا کیا معنی رکھتا ہے دراصل اشفاق احمد قاری کو خود سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ سوچے کہ کیا ایسا کرنا درست ہے او کیا یہ اخلاق کے زمرے میں آتا ہے کہ آپ کی کمزوری سے آپ کا چاہنے والا خود کو ختم کر لے۔مثلاً جو اس لڑکے کی منگنی ٹوٹ کر دوبارہ کسی اور جگہ ہو جاتی ہے تو پھر لڑکی خاموش ہو کر رہ جاتی ہے۔مثلاً:

''چچا کے یہاں نسبت ٹوٹنے کے بعد اس کے والد کو تجارت کا شوق چرایا اور انھوں نے اپنے بیٹے کی بات اپنے شریک کار کے یہاں ٹھہرا دی۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے سب سے منہ موڑ لیا حتیٰ کہ اپنے پیارے ابی کو بھی عمر بھر کے لیے روتا دھوتا چھوڑ کر مادر فطرت کو سمجھانے لگی۔''(۹۱)

زندگی کے بظاہر کم اہم رویے جب فطرت کا حصہ بنتے ہیں تو انسان بے بس ہو جاتا ہے۔اس لیے ضرورت اس بات کی ہے، ان پر شروع میں ہی قابو پا لیا جائے ،لڑکے کی کمزوری اور لڑکی کی ضد اور خودسری دونوں کی ابتدا بچپن سے ہی ہو گئی تھی جو افسانے میں واضح ہے۔اس لیے ابتداء سے ہی ان اخلاقی کمزوریوں پر قابو پانا چاہیے۔

''صفدر ٹھیلا'' میں اشفاق احمد نے طلباء کی نفسیات کی عکاسی کی ہے کہ کوئی سٹوڈنٹ جتنا مرضی طاقت ور ہو یا استاد سے عاجز ہو استاد کو مشکل میں دیکھ کر اپنے تمام برے منصوبوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی جان پر کھیلنے کی اخلاقی جرأت رکھتا ہے۔ یہ رویہ ''عجیب بادشاہ'' کے زمان میں بھی نظر آتا ہے کہ شاگرد، استاد کے سامنے ہمیشہ مؤدب ہی رہتا ہے، یہ ہی ہماری روایت بھی ہے اور یہی ہماری مذہبی اور سماجی اخلاقیات کا تقاضا بھی ہے۔ جیسا کہ صفدر ٹھیلا جو ایک طاقتور انسان ہے، جس سے سارا سکول ڈرتا تھا، بھرے سکول میں ایک کمزور اور نحیف جثہ کے مالک مولوی صاحب سے مار کھائے جا رہا ہے تو یہ اس کی سعادت مندی ہے۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیے:

> ''مولوی ابوالحسن صاحب کے ہاتھ میں شہتوت کی ایک لچکدار چھڑی تھی اور وہ ڈرل گراؤنڈ میں کھڑے غصہ سے کانپ رہتے تھے۔ میں ٹھیلا کو ساتھ لے کر آیا تو وہ چیل کی طرح جھپٹے اور پٹے کے ہاتھ چلانے شروع۔ ٹھیلا جھوٹ موٹ مر گیا جی۔ ہائے مر گیا جی کہہ رہا تھا اور مولوی جی اسے عربی فارسی کی متروک گالیاں دیے جا رہے تھے۔'' (۹۲)

اشفاق احمد نے اس افسانے میں نہایت ہی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ''عجیب بادشاہ'' کے زمان کی طرح صرف سب اچھا ہی نہیں دکھایا بلکہ جب صفدر ٹھیلے کی پنڈت جی سے ان بن ہو جاتی ہے تو صفدر غیر حقیقی طور پر ان کی عزت ہی نہیں کرتا چلا جاتا بلکہ پنڈت جی سے بدلہ لینے کی سوچتا ہے اور اس میں سارے دوست صفدر ٹھیلے کا ساتھ دیتے ہیں۔ مثلاً:

> ''اس وقت ہم پنڈت جی کی بگھی کا انتظار کر رہے تھے اور صفدر ٹھیلے کی بے عزتی کا بدلہ چکانے بیٹھے تھے۔ صفدر خود سڑک کے درمیان کھڑا ہو کر بگھی روکنے والا تھا۔ انور طوطے کے ذمے بھیا کوچوان کو گردن سے پکڑ کر نیچے گرانے کی ڈیوٹی تھی۔ دونوں پہیوں کے آگے اینٹیں رکھنے کا ذمہ دار برکت مہاشا تھا اور مجھے یہ حکم تھا کہ ہاکی اسٹک سے گھڑی کی ٹانگوں پر پے در پے ضربیں لگاتا جاؤں۔ باقی لوگ کمک کے طور پر تھے کہ جونہی ضرورت محسوس ہو تو سیٹی بجا کر انھیں بلا لیا جائے۔'' (۹۳)

افسانہ پڑھتے ہوئے درج بالا مقام پر یوں لگتا ہے کہ جیسے صفدر ٹھیلا اب بدی کی راہ میں دور تک چلا جائے گا۔ اب یہ سارے دوست جو اب تک معصوم شرارتیں کرتے چلے آ رہے تھے اب گناہ کے مرتکب ہوں گے جس پر قاری بھی انھیں ملامت کرنے لگے گا۔ لیکن اس ذلت انگیز منظر سے ہی ایک دم مصنف اس قدر بلندی تک پہنچ جاتے ہیں کہ صفدر ٹھیلے پر

رشک آنے لگتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''گھوڑی خوفزدہ ہو کر بھاگ رہی تھی۔ بگھی کا ایک پہیہ کچے پر اتر گیا اور گاڑی دائیں بائیں ڈول رہی تھی۔ اگلی سیٹ پر پنڈت جی اور ان کی بیوی بیٹھے تھے اور پچھلی سیٹ پر ان کی دونوں لڑکیاں ایک دوسرے سے چمٹی چیخیں مار رہیں تھیں...... ٹھیلا عقاب کی طرح آگے جھپٹا اور اچھل کر گھوڑی کا دھانہ پکڑ لیا۔ گھوڑی الف ہو گئی اور زور سے ہنہنائی اور جھنجھلا کر سر جھٹکا۔ ٹھیلا کی گرفت چھوٹ گئی اور سڑک کے بیچوں بیچ گرا۔ گھوڑی کا ایک سم اس کے ماتھے اور دوسرا چھاتی پر پڑا...... پنڈت جی گاڑی کے پہلو میں کھڑے اپنی بیوی اور لڑکیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر چلا رہے تھے۔ ''میرا سٹوڈنٹ ہے صفدر...... میرا سٹوڈنٹ...... صفدر میرا سٹوڈنٹ......'' (۹۴)

اور یوں صفدر ٹھیلا جو بدلہ لینے آیا تھا، اپنی جان گنوا کر اپنے ہیڈ ماسٹر اور اس کے کنبے کی جان بچا لیتا ہے اور ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانے ''اُجلے پھول'' میں نہایت لطافت سے فطرت کے گہرے رنگوں کو بیان کیا ہے کہ اگر خود پر اعتماد ہو تو برے سے برے حالات کو اچھا بنایا جا سکتا ہے۔ اخلاقیات کا تقاضا ہے، کہ بری محفلوں کا چلن بدلا جائے، روایات کا پاس کیا جائے اور ایسی سوچ کو ابھارا جائے جس سے بہتری کی صورت پیدا کی جا سکے۔ مایوسی، دکھ، درد اور خوف سے دامن چھڑا کر امید، خوشی، مسرت اور دلیری کی طرف قدم بڑھائے جائیں جیسے کہ آلا جی کی مجلس اہل قلم کے آخری اجلاس میں یوں گویا ہوتی ہے کہ:

> ''اس دنیا میں پہلے کیا کم دکھ ہیں جو تم لوگ کرب ناک کہانیاں اور درد انگیز قصے لکھ کر ان میں مزید اضافہ کرتے رہتے ہو۔ ایسی باتیں کرنے سے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، جی چھوٹ جاتے ہیں اور عمل کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔'' (۹۵)

اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری باتوں سے، تحریر سے، تقریر سے وہ لفظ ادا ہوں جو دوسروں کے لیے امید کا باعث بنیں۔ پوری قوم میں بے عملی کے خلاف جذبہ پیدا ہو اور سب مل کر عمل سے اپنی زندگی کو جنت بنائیں۔ کیونکہ آلا جی کی بات کو ٹوک کر انجم بھائی کہتے ہیں کہ:

''آلا جی ٹھیک کہتی ہیں۔ ہم ہی تو ہیں جو دکھوں کے جٹائل ناریل کو توڑ کر اس میں سے جان بخش پانی حاصل کرتے ہیں۔ وہ ہمیں تو ہیں جنھوں نے زندگی کو دلآویز بنانے کے لیے سمندر پھاڑ ڈالے، پہاڑوں سے دریا بہائے اور خارزار وادیوں کو تختِ گل بنایا۔'' (۹۶)

اشفاق احمد اپنے افسانوں کے ذریعے انسان کی عزت خود اس کی اپنی نظر میں وضع کرتے ہیں کہ حضرت انسان تقدیر کے رخ کو موڑ دیتا ہے۔ ہواؤں کو چیر دیتا ہے اور پہاڑوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔ تقدیر اس کی باندی ہے کیونکہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قسمت بناتا ہے۔ مثلاً

''تقدیر آپ سے قوی تر ہے۔ مقدر کا لکھا ان مٹ نہیں ہوتا۔ تقدیریں بدلی جاتی رہی ہیں اور بدلی جاتی رہیں گی۔'' (۹۷)

یعنی گو تقدیر زبردست ہے مگر اس کو ہمت اور کوشش سے بدلا جا سکتا ہے اور ایک ادیب کا یہی جوت جگانا اس کا اخلاقی فرض ہے۔ اشفاق احمد یہ اپنے ہمعصروں کو بتانا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ مثلاً:

''اس دنیا میں پہلے کیا کم دکھ ہیں جو تم کرب ناک کہانیاں اور دردانگیز قصے لکھ کر ان میں مزید اضافہ کرتے رہتے ہو۔'' (۹۸)

اشفاق احمد اپنے افسانوں کے ذریعے لوگوں کو سیدھی راہ دکھانا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں اور یہ بیداری قارئین کے ساتھ ساتھ ادیبوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس افسانے میں اشفاق احمد ہمارے مذہبی اور معاشرتی اخلاقیات کا بھی واشگاف انداز میں ذکر کرتے ہیں اور مشرق کی تہذیب کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اگلی صبح آلا جی نے مجھے اور آپی کو بلا کر صرف اسی قدر کہا۔ ''تم مشرق کی بیٹیاں ہو، یورپ کی گلیمر گرلز نہیں ہو اور مشرق کی بیٹیاں بڑوں سے پوچھے بنا کہیں نہیں جاتیں۔'' (۹۹)

اور یوں اشفاق احمد اپنے رسم و رواج کا اعادہ کروانا بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ بنیادی اخلاقی تقاضوں کو کسی جگہ بھی فراموش نہ کیا جائے۔

اشفاق احمد نے ''برکھا'' دسویں پاس لڑکی کی عمر خوبصورتی اور ذائقے کو بڑی نفاست کے ساتھ بیان کیا ہے اور گریجویٹ پر میٹرک پاس لڑکی کو ترجیح دی ہے۔ سولھواں برس ہر لڑکی کے لیے خطرناک ہوتا ہے اور اس میں سنبھلنا مشکل ہوتا

ہے اس افسانے کی بنیادی وجہ اس عمر کے خطروں سے آگاہ کرنا ہی ہے مثلاً اس میں اشفاق احمد بیان کرتے ہیں کہ:

''یہ میٹھا برس بڑا خطرناک ہوتا ہے گوئیاں۔'' امینہ نے بڑی بوڑھیوں کا سا انداز اختیار کر کے کہا۔ ایک تیری سانولی سلونی کشش دوسرے اس سفید چوہے کی بے نیازیوں کے پھندے دونوں ایسی پھٹکی میں پھنسو گے کہ مجھ ایسی سہیلیاں بارہ بارہ برس شکل دیکھنے کو ترس جائیں گی۔'' (۱۰۰)

اس لیے اس عمر میں اپنی حفاظت کرنا ضروری ہو جاتی ہے تاکہ آنے والے برے وقت سے بچا جا سکے۔ نہ جذبات کو ٹھیس پہنچے نہ ہی ناقابل نقصان کا کوئی شکار ہو۔ اس عمر میں اکثر لوگ یک طرفہ، چاہت کا بھی شکار ہو جاتے ہیں جیسا کہ اس افسانے میں ثریا کے ساتھ ہوا۔ مثلاً:

''اگر گیارہ گنتے گنتے وہ اس کھڑکی کے پاس آ کر السلام علیکم کہہ دے تو چاہے کچھ بھی ہو میں مصافحہ کے لیے ہاتھ باہر نکال دوں گی۔ جب ثریا سات پر پہنچی تو وہ کھڑکی سے دو تین قدم آگے نکل چکا تھا۔'' (۱۰۱)

اشفاق احمد اسی دل آزاری سے بچانا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر لڑکیاں اس عمر میں اس طرح کے جذبات میں سنجیدہ ہو کر کافی دور تک نکل جاتی ہیں جہاں سے واپسی کبھی کبھی مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتی ہے اور اشفاق احمد انھیں جذبات کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں تاکہ تکلیف کا سبب بننے والی وجوہات کو روکا جا سکے۔ انسان کی بڑھتی ہوئی عمر میں کئی اتار چڑھاؤ اور تبدیلیاں آتی ہیں اور ہر عمر کی اپنی خوبصورتی اور تقاضے ہیں۔ اشفاق احمد نے اس افسانے میں سولھویں سال میں فرصت کی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے۔

اشفاق احمد نے ''ایل ویرا'' کے پہلے حصے میں انسان کو وراثت میں ملی شرافت کا ذکر کیا ہے کہ بچپن کی تربیت، ماں باپ سے ملی ہوئی اقدار اور تہذیب کی تعلیم اس طرح سے گھٹی میں پڑتی ہے کہ چاہنے سے بھی انسان ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا اس لیے ابتدائی تعلیم و تربیت کسی بھی انسان کے اخلاق کو بہتر بنانے کے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے اس افسانے میں جب دونوں دوست لڑکیوں کو ساتھ بٹھاتے ہیں تو اشفاق احمد بیان کرتے ہیں کہ:

''ٹھاکر جی اور بھلی لڑکی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میرے کھاتے میں انھوں نے وہ بدتمیز اور بد دماغ لڑکی ڈال دی۔ میں موٹر چلا رہا تھا اور پسینے کے باعث سٹیرنگ میرے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا تھا......
میرے باپ دادا کی بڑی بڑی سفید پگڑیاں میرے پیر چچا کی دستار مبارک ہمارے مزارعوں کی اٹھتی

انگلیاں اور ہمارے ملازموں کی دبی ہنسی ایک ساتھ موٹر کے پہلو میں اڑی آتی تھی۔'' (۱۰۲)

دوسرا پہلو اشفاق احمد نے یہ بیان کیا ہے کہ بعض اوقات ہم اپنے غرور، تکبر اور ہوس کے اندھے پن میں ان محبتوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں جو سچائی اور خلوص پر مبنی ہوتی ہیں۔ ایل ویرا کی محبت کو کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی اور ماریا کے خاندانی رعب داب کی وجہ سے ایل ویرا اب بری لعنت سی بن گئی تھی۔ ماریا کی محبت کے نشے میں مصنف کو ایل ویرا کا ایثار اور بے لوث چاہت حماقت کے سوا کچھ نہیں لگتے۔ مثلاً:

''ٹکٹ لینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مڑے تڑے ہزار ہزار لیرے کے دو نوٹ میری جیب میں پڑے تھے۔ مجھے ایل ویرا کی حماقت پر ہنسی آ گئی۔'' (۱۰۳)

ایل ویرا نے طوائف ہونے کے باوجود اپنی قیمت مصنف کو واپس کر دی لیکن وہ اس کو انسان تک سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے صرف اس لیے طوائف تھی جس کے پاس جذبات و احساسات کچھ نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف کو نیپلز کے ساحل تک بھی ایل ویرا کو آنے کی اجازت نہیں دی کیونکہ اسے ماریا کا انتظار تھا۔ اسی لیے جب ساحل پر سب لوگ اپنے دوست احباب کو خدا حافظ کر رہے تھے تو مصنف کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''رات کے نو بج چکے تھے اور ماریا اور آنا کا پتہ نہ چلتا تھا۔ میں گینگ وے کے پاس کھڑا پریشان نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔'' (۱۰۴)

ماریا کو نہیں آنا تھا وہ نہیں آئی اور مصنف جہاز کے عرشے پر تنہا رہ گیا۔ اسی اثناء میں جہاں اسے ماریا کی کار کے ہارن کا وہم ہوتا ہے۔ وہاں دور اسے ایل ویرا کا سایہ دکھائی دیتا ہے۔ ایل ویرا کا مصنف کے منع کرنے کے باوجود ساحل پر الوداع کے لیے پہنچنا ہی وہ بنیادی پیغام ہے جو مصنف دینا چاہتے ہیں کہ ہم سونے چاندی، مقام مرتبے کی ہوس میں اصلی اور خالص محبتوں کو خود اپنی مرضی سے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیتے ہیں لیکن محبت مر نہیں سکتی، منع نہیں ہو سکتی، وہ اپنی اور خود کو منواتی ہے اور اسی کا نام محبت ہے۔ جو اشفاق احمد کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔

د۔ سفر مینا

اشفاق احمد ''اٹوٹ مان'' میں بیان کرتے ہیں کہ انسان خود پسندی اور نرگسیت سے ذہنی امراض کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے رویے معاشرے میں برائیوں اور منفی رجحانات کا باعث بنتا ہے اور کبھی کبھی سارے علم و حکمت اور تعلیم کے حصول

کے باوجود ہم باپ دادا کی غلط روایات کو اپنا کر اپنا اور دوسروں کا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ اشفاق احمد ان منفی رویوں پر سختی سے سرزنش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مور غمناک لہجے میں بولا۔ ''بس بزرگوں کے وقت سے یہی ریت چلی آئی ہے میں تو خود اس کے خلاف ہوں لیکن کیا کیا جائے بوڑھے مور نہیں مانتے اور کم بخت بزرگوں کے سامنے دال نہیں گلتی۔''

پیرو نے کہا ''اب تو سب بوڑھے دفان ہو گئے اب تو تمہارا اپنا اختیار ہے۔'' (۱۰۵)

اشفاق احمد بنے بنائے، غلط راستوں پر چلنے کے بجائے ان کو سختی سے رد کرنے کے حق میں ہیں کہ ہمیں ایسی روایات کو جو فطرت اور قدرتی عمل کے برخلاف ہو ان سے چھٹکارا پانے میں دیر نہیں لگانا چاہیے۔

نرگسیت یا خود پسندی چاہے وہ اپنی ذات، رنگ، نسل، قوم کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو، انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتی بلکہ اس کو بدصورت، تنہا اور کمزور بنا دیتی ہے۔ ایسے تمام عناصر جو انسان کے لیے نقصان دہ ہیں اور بری عادتوں میں ڈھل کر فطرت کا حصہ بن جاتے ہیں اشفاق احمد ان کی نفی کرتے ہیں۔ جانوروں کی زبان سے انسانوں کی تضحیک سے مراد یہ بھی ہے کہ آج کا انسان اپنی انسانیت کے درجات اور معیار کو بھول چکا ہے اور جانوروں سے بھی نچلی سطح پر پہنچ چکا ہے اس لیے ضرورت خود احتسابی کی ہے۔ جب تک خود اپنے آپ کو درست نہیں کریں گے، بوسیدہ اور گھٹیا روایات پر چلنے کے بجائے ان کا قلع قمع نہیں کیا جائے گا۔ تبدیلی نہیں آئے گی، مان ٹوٹتے رہیں گے اور ملاح اپنے بیٹوں کو آواز دیتے دیتے تھک کر بے ہوش ہوتے رہیں گے اور بنت السود کے کمرے کی بتی بجھا اور چٹخنی چڑھا کر اجنبی نوجوان بتی بجھاتے رہیں گے۔

اشفاق احمد ''قاتل'' میں بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ایک شریف نوجوان قاتل بن جاتا ہے۔ اشفاق نے اس افسانے میں بیماریوں کی روک تھام کے لیے اور شدید درد کو عارضی طور پر کم کرنے کے لیے نشہ آور چیزوں کے استعمال، خواہ وہ گولیوں کی صورت میں ہو یا ٹیکوں کی سخت مذمت ہے کیونکہ جیسا کہ افسانے میں مرقوم ہے کہ نشہ ٹوٹتا ہے تو انسان ٹوٹ کر، تڑپ کر رہ جاتا ہے اور پھر ساری شرافت دھری کی دھری رہ جاتی ہے اس لیے حتی المقدور کوشش کرنی چاہیے کہ تکلیفوں اور بیماریوں کے علاج کے لیے نشہ آور دوائیوں سے پرہیز کیا جائے کیونکہ ان کا استعمال غلط ہے۔ صحت اور اخلاق دونوں کے لیے وبال جان ہے۔ اشفاق احمد اس افسانے میں ڈاکٹروں کی اخلاقی شعبہ جاتی اقدار کا بھی بیان کرتے ہیں کہ ڈاکٹر، اصل میں زندگی کو بچانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور یہی ان کا اخلاقی فرض ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ

ڈاکٹر گھوش نے کہا۔ ''بابا ہم ڈاکٹر ہے قاتل نہیں ہے، آخری دم تک کوشش کریں گا۔'' (۱۰۶)

یعنی ڈاکٹر آخری دم تک زندگی کو بچانے کے لیے فکرمند رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب محمد سلیم ٹھیک ہو جاتا ہے تو ڈاکٹروں کی مسیحائی ثابت ہو جاتی ہے، ڈاکٹروں کی کاوشیں رنگ لے آتی ہیں، صرف اس وجہ سے کہ ڈاکٹروں نے شدید تکلیف میں مایوسی اختیار نہیں کی اور نہ ہی محمد سلیم کو مایوس ہونے دیا اور محمد سلیم کو نئی زندگی عطا کی۔ اس خالق کی رضا کے مطابق محمد سلیم پر ثابت ہو گیا کہ ڈاکٹر مسیحا ہوتا ہے قاتل نہیں۔ وہ لکھتے ہیں

> ''پورے پینتیس دن بعد جب وہ ہسپتال سے نکلا تو ڈاکٹروں نے اسے گھیر کر کہا۔ کیوں سلیم صاحب ڈاکٹر قاتل ہوتا ہے یا مسیحا؟ سلیم کا سر شرم سے جھک گیا۔ ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور تھوڑی دیر کے لیے خالق اکبر کو دل ہی دل میں مسکرا کر یاد کیا۔'' (۱۰۷)

اور یوں سلیم ڈاکٹروں کا شکرگزار ہوا اور ڈاکٹر حضرات خالق حقیقی کے کرم کے شکرگزار ہوئے کیونکہ دنیا میں ڈاکٹر ہی خالق اکبر کی طرف سے وہ وسیلہ ہیں جو بیماریوں اور تکلیفوں کو رفع کر کے زندگی عطا کرتے ہیں۔ اشفاق احمد شعبہ جاتی اخلاق و فرائض کے ساتھ ساتھ مذہبی اخلاقی حوالے کو بھی فراموش نہیں کرتے اور ڈاکٹروں کی نیت، خلوص اور محنتی کردار کو سامنے لے کر آتے ہیں اور معاشرے میں ان کی کوششوں کو سامنے لاتے ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانے ''قصہ نل دمینتی'' میں جب محبت کی دیوی، محبت کی راہ میں قربان ہوئی جا رہی ہوتی ہے تو اس پر سہیل کی ذہنی، قلبی، معاشی، معاشرتی حالت واضح ہونے لگتی ہے اور سہیل اس کو بتاتا ہے کہ اس کی شائستہ سے محبت کی اصل وجہ کیا ہے اور کیوں سہیل شائستہ پر مرتا ہے۔ اشفاق احمد سہیل کے جذبات و احساسات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''شائستہ حیرانی سے سہیل کا منہ تکنے لگی وہ کہہ رہا تھا کہ میں Over-indulgence سے اور بے پایاں اظہار سے اور لایعنی Communication سے بالکل تھک کر تم سے محبت کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ میری محبت آج پہلی مرتبہ میرے اصل وجود میں پلانٹ ہوئی ہے...... پھر آنے والے مبصر یقین سے کہہ سکیں گے کہ سہیل کی محبت اس کٹھن دور سے ایک فرار تھی۔'' (۱۰۸)

سہیل کہتا چلا جاتا ہے اور شائستہ پر حیرانی کے دروازے کھلتے بند ہوتے ہوئے اسے ایک حتمی فیصلے کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ سہیل کو چھوڑ کر واپس اپنے گھر لوٹ جاتی ہے جہاں اس کی مہندی پر اس کی سہیلیاں بھنگڑا ناچ رہی تھیں۔

اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''یہ باتیں اور ایسی بہت سی باتیں کرتے کرتے سہیل اسی طرح شائستہ کی گود میں سو گیا اور جب وہ نیند کی وادی میں بہت آگے نکل گیا تو شائستہ نے آہستہ آہستہ اپنی گود کا حلقہ وا کیا اور سہیل کا سر سرہانے پر رکھا۔ اس کی پیشانی پر ایک ننھا سا بوسہ دیا اور اپنا پرس اٹھا کر گربہ پائی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ سڑک کے کنارے اس نے لاہور کی طرف جانے والی بس کو ہاتھ دے کر روکا اور اس میں بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ جہاں اس کی سہیلیاں اس کی مہندی والی رات میں لڈی کے بعد بھنگڑا ناچ رہی تھیں۔'' (۱۰۹)

اور یوں محبت کی انمول داستان انجام کو پہنچی۔ اشفاق احمد موجود دور میں ہر انسان میں موجود اپنی ذات کی آسائش کو ضروری سمجھنے کی سوچ وضاحت کرتے ہیں کہ انسان دراصل خود اپنے آپ سے، اپنی مرضی سے محبت کرنے لگ گیا ہے اور اپنے عیش اور آرام پر محبت کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ شائستہ کو سہیل سے محبت نہیں تھی بلکہ محبت کا آخری بوسہ آخری لمحے تک سہیل سے وابستگی کا اظہار ہے لیکن اس سے بھی اہم اس کی اپنی ذات ہے اور اس کی آسائش ہے۔ وہ کسی ایسے انسان کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تیار نہیں جو دنیا و مافیہا سے بے خبر محبت کی وادی میں کھو کر اپنی معاشرتی اور معاشی حالت خراب کر لے۔ اسی لیے فرار کے راستے پر جانے سے انسان اپنے آپ سے اور اپنی محبت سے بھی محروم ہو جاتا ہے ضرورت اس بات کی ہے حالات کا مقابلہ کیا جائے۔ مسائل کا حل تلاشا جائے اور جدوجہد سے حقیقی دنیا میں زندگی گزاری جائے۔

اشفاق احمد کے افسانے ''چور'' میں ایک چور کی کہانی ہے جس میں وہ یہ واضح کر دیتے ہیں کہ ضمیر کی آواز کے باوجود ایک چور چوری کیے ہوئے روپے واپس نہیں کر پاتا حالانکہ اس کی نیت واقعی ان روپوں کو لوٹانے کی ہوتی ہے لیکن وہ ہمت نہیں کر پاتا، یہاں اشفاق احمد یہ اخلاقی درس بھی دینے میں کوشاں نظر آتے ہیں کہ ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے سے مراد اس غلطی کو سدھارنا ہوتا ہے جبکہ اکثر ہم ایسا نہیں کر پاتے اور اس غلطی کا ازالہ چند ادھر ادھر کی نیکیاں کر کے کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے آپ میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری ''یہ والی نیکی''، ''وہ والے جرم'' پر پردہ ڈالنے کے لیے کافی ہے جیسے کہ یہ چور بھی اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے ایسی ہی کچھ حرکات کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''......وہ سیدھا بھاٹی اپنے دوست کے پاس پہنچا اور اس سے دو روپے ادھار لے کر لنڈے چلا آیا، یہاں آٹھ آنے کی اس نے روٹی کھائی۔ ایک روپیہ بیٹھک میں جا کر ہار دیا اور باقی آٹھ آنے تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں فقیروں کو بانٹ دیے۔'' (۱۱۰)

اس کے بعد بھی اس کا ضمیر اسے چین نہیں لینے دیتا۔ لیکن تمام کشمکش کے باوجود چور روپے واپس نہیں کر پاتا یہاں تک بچہ بیماری سے مر جاتا ہے تو یہ اسی کے جنازے کو کندھا دے کر اپنا بوجھ کم کر دینا چاہتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ

''چور نے آگے بڑھ کر پست قد آدمی کی جگہ کندھا دیا اور اس سے ایک دوسرے آدمی نے کندھا بدل لیا۔'' (۱۱۱)

اور جب لوگ بچے کو دفنا کر چلے جاتے ہیں تو پھر چور ہمیشہ کے لیے اپنے بوجھ کو ہلکا کر لیتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں۔

''اس نے پھولوں سے بھرا ہوا ایک چھابہ بارہ روپے میں خریدا اور سقے کو ساتھ لے کر تازہ بنی ہوئی قبر پر پہنچ گیا، جب سقہ اس کی مرضی کے مطابق قبر کو تر بہ تر کر چکا تو اس نے تین روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور جب چور قبرستان میں باہر نکلا تو ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے باقی کے ایک سو پچپن میں سے دس کا نوٹ اور نکالا اور کھوکھے والے سے بولا ''ایک ڈبی کیپٹن چار پان'' ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے کے لیے چور کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور شکر کرنے لگا کہ اس ایک نیک کام سے اس کے ضمیر کا بوجھ بالکل ختم ہو گیا۔'' (۱۱۲)

اور یوں چور کی نظر میں اس کی ایک برائی یا جرم کا ازالہ، دوسری قسم کی نیکی سے ہو جاتا ہے حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ اشفاق احمد یہی بیان کرتے ہیں کہ ہم میں سے اکثر چور خواہ یہ چوری روپے پیسے کی ہو یا اصولوں کی یا دینی احکامات کی، جب ہم سے غلطی ہو جائے اور اس کا پتہ بھی چل جائے اور ضمیر چیختا چلاتا بھی رہے تو ہم اس کو سدھارنے میں یہاں تک ناکام رہتے ہیں کہ جانی نقصان تک کر بیٹھتے ہیں، روح کے قتل کا باعث بن جاتے ہیں لیکن صرف کندھا دے کر تماشا دیکھتے ہیں یا پھر قبر پر پھول چڑھا کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اس ضیاع کی وجہ ہم ہیں۔ اشفاق احمد ایسی ہی اخلاقی برائیوں سے ہمیں بچانے کے لیے ان پہلوؤں کو زیر بحث لاتے ہیں تا کہ ہم ان سے بچ کر ان برائیوں کا قلع قمع کر سکیں۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانے ''بیا جاناں'' میں سادھو، گیانی اور حنیف کے مکالمات کے ذریعے سے دنیا اور انسان

کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔مثلاً گیانی انسان کی اہمیت کے حوالے سے کہتا ہے کہ:

''آدمی بہت بڑی چیز ہے، ہم تو آدمی کے پیر کی دھول بھی نہیں''۔(۱۱۳)

یعنی انسانیت کے مرتبے اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے درجے کے بارے میں بتایا کہ آدمی ہونا بہت بڑی چیز ہے اور یہ شرف حاصل کرنے کے بعد کیا انسان خود کو پہچان سکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کس مرتبے پر فائز کیا اور کیا بلند مقام بخشا ہے کہ تمام مخلوقات اور کائنات اس کے قبضے میں تسخیر کرنے کے لیے بخش دی ہے۔آدمی ہونا یعنی انسان کو اپنی پہچان ہونا اور انسانیت کے درجے پر فائز ہونا اور انسانوں کے دکھ درد کو سمجھنا واقعی بہت بڑی چیز ہے۔اشفاق احمد نے یہ بھی بتایا کہ ہم دنیا میں رہتے ہوئے مختلف مقدس ہستیوں کا نام بے دھڑک لے لیتے ہیں حالانکہ اس قابل نہیں ہوتے کہ ان پاک ناموں کو ہماری زبان چھو سکے۔اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''حنیف نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور بے خودی کے عالم میں بولا''میری ماں......میری بی بی حضرت رابعہ بصری بھی تو اسی طرح ماری ماری پھرتی تھی۔حضور نے فرمایا...... گیانی نے ایک دم ٹوکا۔''ناں ناں حضور کا نام یہاں نہ لینا۔ ہم دنیا کے کتے...... لوبھی۔...... مایا کے بندے نہ بابا لوک...... دل کی میل دور کر کے یہ نام لینا...... نہ بابا لوک......'' حنیف نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور اس پر رقت طاری ہوگئی۔''(۱۱۴)

یعنی حضورؐ کا نام اس قدر پاک ہے کہ وہ ہم جیسے دنیا داری میں پھنسے ہوئے لوگوں کو اپنے کاموں کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔اور حضورؐ کے نام کو لینے سے پہلے دل کے میل کو دور کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ وہ جو حضورؐ سے محبت رکھتا ہے وہ ان کو پکارے بغیر نہیں رہ سکتا اور ان کا نام لینے کے لیے خود کو پاک صاف باطنی طور پر کرنا بہت ضروری ہے۔اشفاق احمد اسی بات کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ وہی لوگ اچھے ہوتے ہیں جو بناوٹ اور ریا کاری سے دور ہوئے ہیں اور جن میں انا اور لالچ جیسی برائیاں نہیں ہوتیں۔وہ لکھتے ہیں کہ

''ہم لوبھی ہیں، کامی ہیں، اہنکاری ہیں......تم اچھے ہو بابا لوک، ہم اپنے اپنے چور چھپاتے پھرتے ہیں، تم ظاہر باطن ایک ہو۔''(۱۱۵)

یعنی وہ لوگ اللہ کے نزدیک اور اس کے پسندیدہ ہیں جو اخلاقی برائیوں سے دور ہیں اور جن کا اصل سب کو دکھائی

دیتا ہے یعنی بناوٹ یا ڈپلومیسی سے کام نہیں لیتے بلکہ ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

اشفاق احمد ''محسن محلّہ'' میں بیان کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں ایک نیک دل انسان پر اعتماد کرنے کے بجائے اسے بدھو اور احمق سمجھ کر ٹرخا دیا جاتا ہے اور اس کی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ اس افسانے میں ''ماسٹر صاحب'' کا کردار اس کی بھرپور مثال ہے۔ جبار حلوائی جو بہت کم ہنستا تھا، اس سے بھی جب ماسٹر صاحب نے روپے مانگے تو اس نے ہنس کر اڑا دیا۔ ملاحظہ فرمایئے:

> ''انھوں نے دودھ پی کر اپنی نبض جبار کو دکھائی اور پھر گڑگڑا کر اس سے دوسو روپے قرض کی درخواست کی۔ جبار ہنس پڑا۔ اس کو پتہ تھا کہ ایسے الو کو کوئی ایک روپیہ بھی ادھار نہیں دے سکتا۔ یہ پورے دوسو مانگ رہا ہے۔ جب ایسی انہونی بات ہو تو ہر ایک کو ہنسی آ جاتی ہے اور اسی وجہ سے جبار ہنس پڑا ورنہ عام زندگی میں وہ بہت ہی کم ہنستا تھا۔'' (۱۱۶)

اور یوں سب کی ہنسی کا نشانہ بن کر ماسٹر صاحب لقمہ اجل کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کے مرتے ہی سب کی انسانیت جاگ اٹھتی ہے اور سب بڑھ چڑھ کر ماسٹر صاحب کی تدفین میں حصہ لیتے ہیں۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ

> ''شیخ کریم نواز نے دوسو روپے نکال کر سعید اور بلال کو سکوٹر پر بھیجا کہ جا کر قبر کا بندوبست کریں۔ تین سو روپے بابو جلال کو دیے کہ رحمت کو ساتھ لے جا کر لٹھے، کافور، عرق گلاب اور پھولوں کا بندوبست کریں۔ جبار حلوائی نے دودھ پتی کا ایک پتیلا کاڑھ کر صف پر پہنچا دیا۔ لوگوں نے ماسٹر صاحب کی رسم قل کے لیے پیسے جمع کرنے شروع کیے اور دیکھتے دیکھتے محسن محلّہ کے لوگوں نے آٹھ سو گیارہ روپے جمع کر کے شیخ کریم نواز صاحب کے پاس محفوظ کرا دیے۔'' (۱۱۷)

اور یوں ماسٹر صاحب جنھیں اپنی زندگی میں مکان کے کرائے کے لیے کسی نے ایک سو پچاس یا دوسو روپے کا ادھار نہ دیا اور وہ سخت سردی میں گھر سے باہر پڑے رہے۔ آٹھویں دن نمونیے کا شکار ہوئے اور کسی کو ترس نہ آیا۔ بیماری کے چوتھے روز مر گئے تو سارا محلّہ دکھی ہو گیا اور آٹھ سو گیارہ تدفین کے خرچ کے علاوہ جمع کر لیا۔ یہ رویہ ہمیں عام زندگی میں جا بجا نظر آتا ہے کہ زندگی میں انسانوں کی قدر نہیں کی جاتی اور مرنے کے بعد آنسو بہائے جاتے ہیں۔ اشفاق احمد کا یہ افسانہ نہ صرف ہماری اخلاقی تنزلی کا کھلا بیان ہے بلکہ اس رویے کی مذمت بھی ہے۔ اشفاق احمد یہی چاہتے ہیں کہ سادہ لوح لوگوں کو

زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیے اور لوگوں کی زندگی میں ہی ان کی مدد کرنی چاہیے نہ کہ مرنے کے بعد ان کی موت کا فائدہ اپنی رحم دلی دکھانے کے لیے اٹھایا جائے۔

اشفاق احمد نے افسانے ''پانچ میل دور میں'' میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ جب بھی کسی برائی کا آغاز ہوتا ہے تو اسے وہیں پر روک دینا چاہیے کیونکہ اس کے بعد انسان کا خود کو روک پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ رشوت ایک ایسی لعنت ہے جو کسی بھی معاشرے میں ناسور ثابت ہوتی ہے اور تباہ کر کے چھوڑتی ہے لیکن طاہر جب رشوت لیتا ہے تو خود کو ایسی تسلیاں دیتا ہے جو ہر رشوت لینے والا خود کو دیتا ہے۔ وہ خود کو دلاسہ دیتا ہے کہ اس امیر زادے سے اس نے روپے خود نہیں مانگے تھے۔ اشفاق احمد کے مطابق یہ رویہ سراسر غلط ہے۔ چاہے کوئی زبردستی دے تو بھی رشوت جائز نہیں ہوتی بلکہ برائی ہی رہتی ہے اور کسی بھی نیک عمل کرنے سے وہ گناہ معاف نہیں ہوتا گناہ ہی رہتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ

> ''فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو یہ سمجھا کر تسلی دے لی کہ یہ میری پہلی اور آخری رشوت ہی تو ہے۔ اس کے بعد نہ ایسا کارڈ آئے گا نہ میں ایسے جرم کا مرتکب ہوں گا اور پھر میں یہ دس روپے تنخواہ ملتے ہی غریبوں میں تقسیم بھی تو کر دوں گا کیا ہوا جو میں نے ایک امیر زادے سے چند روپے لے کر اس کا کام کر دیا۔ میں نے خود تو نہیں مانگے تھے اس نے آپ ہی آپ میرے ہاتھ میں تھما دیے تھے۔'' (۱۱۸)

اور اس طرح طاہر جو ابتدا میں پریشان ہے اور فیصلہ نہیں کر پاتا کہ رشوت جائز ہے یا ناجائز خود ہی اس کو جائز قرار دے دیتا ہے اور یوں اس جرم کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ اشفاق احمد نہ صرف معاشرے میں پنپنے والی ان برائیوں کو نقاب کرتے ہیں بلکہ اس کے اسباب بھی بیان کرتے ہیں کہ کیوں طاہر کے نزدیک یہ رشوت جائز ہو جاتی ہے جب نعیم اس کے بیگ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے تو اسے اپنی زیادتی کا احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اس کے لیے چاکلیٹ یا ٹافیاں کیوں نہیں لے کر آیا کیونکہ اب وہ ایک طالب علم نہیں بلکہ ایک معزز عہدیدار ہے اور اس محرومی پر وہ رشوت کے جائز اور ناجائز جیسے سوالات اور کشمکش سے بالکل باہر آ جاتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''طاہر نے کہا، ایسی زیادتی ہوتی ہی رہتی ہیں۔ لیکن اگر میں اس کیڈٹ سے دس کے بجائے پندرہ روپے لے لیتا تو ایسی زیادتی کبھی نہ ہوتی۔ پانچ روپے میں تو کافی چاکلیٹ آ جاتی ہے۔'' (۱۱۹)

اشفاق احمد کے نزدیک جب خواہشات اور حاصلات میں تفاوت ہو تو رشوت جیسی برائیاں عام ہو ہی جاتی ہیں۔ یہ

تو ایک ایسے نوجوان کی بدلتی ہوئی سوچ دکھائی ہے جو اس بارے میں سوچتا تو ہے جبکہ ہمارے ہاں محرومیوں کے مارے بے بس لوگ تو یہ سوچ ہی نہیں پاتے اور ابتدا میں یہ جرم ان کی مجبوریاں ہی کرواتی ہیں اور پھر وہ عادی ہو جاتے ہیں اور ایک معزز عہدیدار سے وابستہ لوگوں کی اس سے کچھ امیدیں وابستہ ہوتی ہیں جس کا تعلق اس کی عزت نفس سے ہوتا ہے اور پھر اس کے سامنے برائی برائی نہیں رہتی اس لیے اشفاق احمد اس فرق کو ختم کرنا چاہتے ہیں کہ کم از کم اتنی تنخواہ ضرور ہونی چاہیے کہ ایک پڑھا لکھا انسان اپنی عزت نفس اور خودداری کو بچا کر رکھ سکے اور شرمندگی سے پاک زندگی بسر کر سکے۔

اشفاق احمد ''گاتو'' میں ''احساس'' کے مر جانے کی بات کرتے ہیں۔ جو بیگم نیاز میں مر چکا تھا۔ ''گاتو'' قیومی کے لیے محض بلی کا بچہ نہیں تھی بلکہ اس میں اس کی جان تھی۔ لیکن بیگم صاحبہ کو اس پر ذرا ترس ہیں آتا۔ ننھا سا بچہ تمام رات سردی میں اپنی گاتو کے لیے بیٹھا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جان دے دیتا ہے کیونکہ اس کے لیے گاتو اس کی جان سے بڑھ کر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''سورج نکلنے سے کوئی گھنٹہ بھر بیشتر ایک بھیگا ہوا لنگڑا کتا ادھر سے گزرا تو قیوم کو یوں بیٹھے دیکھ کر رکا۔ اینٹوں پر پھدکتا اس کے پاس پہنچا۔ تھوتھنی اس کے قریب کی۔ سونگھا۔ ذرا سا جھکا اور منہ اوپر اٹھا کر رونے لگا۔ بارش سے بوجھل قیوم کے کپڑے اس کے ٹھنڈے یخ جسم سے چمٹے رہے اور لنگڑا کتا اس کے سرہانے کھڑا بین کرتا رہا۔'' (۱۲۰)

انسان کی بے حسی پر جانور خدا تعالیٰ کی طرف دیکھتا اور بین کرتا رہا۔ اس معصوم کی لاش پر ماتم کرتا رہا۔ لیکن ایک انسان، بیگم نیاز کی پلک نہ بھیگی نہ دل میں کوئی احساس ابھرا، نہ ہمدردی جاگی نہ ہی لمحہ بھر کو یہ خیال ابھرا کہ یہ بچہ کل رات سے گھر گیا بھی ہے کہ نہیں اگر اس کے اندر سے کچھ نکلا بھی تو حقارت اور نفرت سے بھری گالیاں ہی تھیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''غصہ سے دانت پیس کر وہ سنگار میز کے سٹول پر بیٹھ گئیں اور رونکھی ہو کر بولیں: توبہ! رذیلوں کی اولاد کس قدر ضدی اور اڑیل ہوتی ہے جو کچھ ماں باپ سکھا دیں کیا مجال جو رتی بھر بھی ادھر سے ادھر سرک جائیں۔ دیکھو صبح صبح پھر آ کے بیٹھ گیا حرامزادہ۔'' (۱۲۱)

بیگم نیاز کو بلی سے غرض ہے کیونکہ وہ اس احساس سے ہی ناواقف ہے کہ غریبوں کے پاس بھی کوئی اچھی چیز ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ بھی کہ غریبوں کے پاس بھی دل جیسی چیز ہے۔ انھیں بھی دکھ تکلیف ہو سکتی ہیں۔ اشفاق احمد جہاں اس

افسانے میں ایک امیر عورت کے ایک غریب کمسن بچے پر ظلم وستم کی انتہا دکھاتے ہیں وہاں اس بات کا بھی احساس دلاتے ہیں کہ انسان جب خدا کے بدلے انسان کو اپنا رزاق سمجھ لیتا ہے تو نقصان اٹھاتا ہے۔خواجہ صاحب نے اپنی نوکری کے ڈر سے اپنے بچے کی خوشی بلکہ بچے کو ہی قربان کر دیا۔اشفاق احمد لکھتے ہیں۔

''خواجہ صاحب بولے:''کیا کریں پوزیشن ہی ایسی ہے صاحب تو کھڑے کھڑے نوکری سے نکال سکتے ہیں۔اس وقت تو قیوم کی خوشی روتے ہیں اس وقت اس کی جان رونا پڑے گا۔''

''مٹی تمہارے منہ میں'' مریم نے غصہ سے کہا۔''نیاز صاحب کوئی ہمارے رزاق ہیں، روٹی تو اللہ دیتا ہے۔'' (۱۲۲)

اگر خواجہ صاحب کا یہی ایمان رہتا کہ اللہ تعالیٰ ہی رزاق ہے، ہم اسی کے آگے جھکنا چاہیے تو اپنے بچے کی خوشی کو عزیز رکھتے تو انھیں اپنے بچے کی جان سے ہاتھ نہ دھونے پڑتے کیونکہ جب ہم خدا کے بجائے انسان کو اپنا رازق اور وسیلہ خیال کرنے لگتے ہیں تو نقصان اٹھاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی ذات ہر بشر کو اس کی ضرورت کے مطابق رزق عطا کرتی ہے۔اس لیے اسے ہی اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کرنا چاہیے اور دنیا داری اور دنیاوی حاکموں کے لیے اپنے عزیزوں کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب ہم اس کے علاوہ کسی اور پر بھروسہ کرتے ہیں تو نہ صرف تمام عمر کے لیے نقصان اٹھاتے ہیں بلکہ روتے اور دانت پیستے رہ جاتے ہیں۔

افسانے ''فل برائٹ'' میں اشفاق احمد ایک فقیر کو بزنس مین کے مقابلے میں لا کھڑا کرتے ہیں کیونکہ اس فقیر کا کہنا ہے کہ بھیک مانگنا بھی ایک کاروبار ہے۔اور اس کا ہنر اس نے بڑے بڑے کامیاب بزنس مین حضرات سے سیکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب مصنف اس کو اپنی کمائی کے روپوں سے لطف اندوز ہونے کا کہتے ہیں تو وہ اس پر تیار نہیں ہوتا۔اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''ہائے ہائے محمد اسحاق'' اس نے مایوس ہو کر کہا'' گھاٹے ٹوٹے کا رونا ہر دے کو منانے کے لیے ہوتا ہے یارا۔سیٹھ دس ہزار کا نفع پا کے بھی منڈوے نہیں جاتا۔اپنا جی خوش نہیں کرتا......قسم قرآن کی میں بڑے بڑے سیٹھوں، بجنس مین آدمیوں کا منگتا رہا ہوں، میں نے ساری باتیں ان سے سیکھی ہیں۔اپنا بنج بیوپار وچار کے سب کام کرتے ہیں۔'' (۱۲۳)

یعنی بزنس مین نفع کمانے کے بعد نہ تو لٹا تا ہے اور نہ ہی شور مچاتا ہے، بلکہ گھاٹے کا سودا سناتا ہے تاکہ یہ نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنے آپ کو بھی سنائے تاکہ اور محنت کر سکے اور روپے کما سکے۔ اس کے برعکس نوکری پیشہ افراد کی طبیعت فرق ہوتی ہے۔ وہ تنخواہ پاتے ہیں اور اس کو لٹا دیتے ہیں۔ اشفاق احمد اس افسانے میں ''گداگری'' اور ''بزنس مین'' دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

ہ۔ ایک ہی بولی۔ پھلکاری

اشفاق احمد نے ''رکی ہوئی عمر'' میں اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ صرف عمر کے بڑھنے سے درجات نہیں بڑھتے۔ حضرت صاحب کے نزدیک ان کے بیٹے کی عمر اناٹھ سال نہیں بلکہ صرف دو سال تھی کیونکہ اس سے آگے وہ ضدی، خودغرض، انا پرست اور خود پسند ہو گیا تھا، دنیاداری میں پڑ گیا تھا۔ وہ ایک ایسا پھول تھا جو کھل ہی نہ سکا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

''حق سچ کوں چھڈ کے چیزاں وستاں کیاں محبتاں ماں نبھیا گیا...... جائداراں بنانیاں شروع کر دیناں، مال گھاؤ گھپ کر لئے۔ اپنے آپ اور اپنی ذات کا بندا بن گیا۔ مخلوق خدا کنوں اڈھوا کے صرف اپنی سیوا کرن لگ گیا۔ اناٹھ سال عمر ضرور پائی پر پہلے دو سالاں کنوں آگے نہ جا سکیا۔ ساری عمر ایونیوں ای اکارت گئی اینویں ای برباد ہوئی''۔ (۱۲۴)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں سیدھے راستے پر چلنے کی تاکید سیدھے انداز میں کرتے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں برے بھلے، اچھے برے، خوبی اور عیب کی بات جتا دیتے ہیں۔ اسی طرح اشفاق احمد کے ہاں اللہ کی رضا میں راضی ہونے کا نظریہ نظر آتا ہے اور جو اللہ کی رضا میں راضی رہتے ہیں ان کی برکتیں اور دعائیں اور اجر کا بھی ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔

اشفاق احمد نے ''ایک ہی بولی'' میں ''اخلاقیات'' کا وہ فلسفہ بیان کیا ہے جو انسانی زندگی کی بقاء کی بنیاد ہے، انھوں نے جانوروں دیسی بچھیری اور ولائیتی گھوڑے کے ذریعے سے پہلے تو مشرق ومغرب کے لوگوں کا، ذہنیت کا فرق بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ بولی کا فرق بہت بڑا ہوتا ہے جب ایک دوسرے کی بات سمجھ نہ آئے تو تعلق آگے نہیں بڑھ سکتا اور میل ملاپ ممکن نہیں ہو سکتا اور یہ بات صاف واضح کی ہے کہ جہاں انسان بات چیت کو سمجھے بغیر ہر میل کرنے کی طرف مائل نظر آتا ہے، وہاں جانوروں کے ہاں جہاں بات سمجھ نہیں آتی وہاں میل ممکن نہیں رہتا۔ اس افسانے کے آخر میں بھی یہ پہلو نمایاں ہوتا ہے کہ 'ماں' کے اثرات نسلوں تک رہتے ہیں مثلاً شاہ جی گھوڑی کی اس حرکت پر کہ وہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے کو چھوڑ

کرٹو کے ساتھ لگتی ہے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی۔ مثلاً

''سرنوا کے مٹھی آواز میں بولے'' اس کی ماں بھی بڑی کتی گھوڑی تھی اچھی نسل ہونے کے باوجود اوہ بی رلا پسند کرتی تھی کنجری''۔(۱۲۵)

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کھارے چشمے سے کھارا پانی ہی باہر آتا ہے اور میٹھے چشمے سے میٹھا۔ کانٹوں اور اونٹ کٹاروں پر کبھی بھی انگور کے خوشے نہیں لگتے۔ اس لیے جب گھوڑی کی ماں اپنے لیے رلا پسند کرتی تھی تو کیسے ممکن تھا کہ وہ اعلیٰ نسل کا انتخاب کرتی۔ افسانے کے آخر میں شاہ جی انسانوں اور جانوروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں مثلاً

''پر میں ہر ایک سے تنگ آ گیا ہوں بندوں سے بھی اور ڈنگروں سے بھی۔ سارے ای قتل کرن جوگے ہیں''۔(۱۲۶)

یعنی انسان اور جانور دونوں اعلیٰ اور ادنیٰ کی تخصیص سے ماورا ہو چکے ہیں۔ اس افسانے میں دو نظریات نظر آتے ہیں۔ پہلے حصے میں تو اشفاق احمد اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بولی ایک ہونا ہی بہترین میل کے لیے ضروری ہے۔ جب دیسی گھوڑی ولائیتی گھوڑے کا کلام ہی نہیں سمجھتی تو میل پر کیسے راضی ہو سکتی ہے اور یہ سارے مکالمے گاموں اور کرملی کے منہ سے نکلتے ہیں جو کامے ہیں۔ لیکن بات دل کو لگتی ہے اور وضاحت ہوتی ہے کہ دل ملنا ضروری ہے اور یہی اخلاقیات کا تقاضا بھی ہے کہ دو جانوروں یا افراد کی مرضی ملاپ میں شامل ضرور ہو۔ اور جانوروں کے ہاں یہ دیکھ کر انسان نادم ہو جاتا ہے کہ یہ تو انسان کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہونا چاہیے اور اسی طرح افسانے کے آخر میں قاری ایک دم شاہ صاحب کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سے چونک جاتا ہے اور اس کی توجہ نسل کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر جب، گھوڑی کی ماں کو 'کتی' اور 'کنجری' جیسی گالیوں سے نوازا جاتا ہے۔ افسانے کے آخر میں بچھیری کا لاپروا رویہ اس بات کا غماز ہے کہ وہ جو چاہتی تھی اس نے کیا اور نہ اس پر شرمندہ ہے نہ ہی اس کو کسی کی پروا ہے مثلاً:

''یہ کہہ کر سید کرم شاہ اپنے ڈیرے ال چلے گئے پر بچھیری نے اوہناں کوں مڑ کے نئیں ویکھا۔ پونچھل چھٹکدی اور دانہ کھاندی رئی''۔(۱۲۷)

بچھیری کا یہ بے پروا رویہ انسان اور جانور دونوں کا ہی اپنی حدود سے غافل ہونے کی طرف اشارہ نہیں ہے کہ جیسے موجودہ معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی غلطی پر نادم ہونے کی رسم بھی جاتی جا رہی ہے۔ جو بات ہمارے بڑوں کے لیے

اہم ہے ہمارے لیے غیر اہم ہے اور اب انسان، جانوروں کی طرح اچھے برے، نیک و بد، ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز بھول چکا ہے۔ اخلاق کا معیار تبدیل ہو چکا ہے اور سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا تنگ آ کر بس یہی سوچا جا سکتا ہے کہ بہتری لانے کی آخری امید بھی جاتی رہی اب ان کو قتل ہی کر دیا جائے اور اسی صورت میں معاشرے سے برائی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

اشفاق احمد کے افسانے ''کالا بدل'' میں ٹھمکی اور کالا بدل کی حد سے زیادہ دل بستگی دکھائی گئی ہے کہ اس کے جانے کے بعد ٹھمکی اپنے شوہر موجو کو بھی چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ موجو کی محبت ٹھمکی اور ٹھمکی کی محبت کالا بدل ہے، کالے بدل کے فوت ہوتے ہی ٹھمکی اپنے گھر والے کی پروا کیے بغیر جانے کدھر نکل جاتی ہے گویا اس کے جینے کا سہارا، آس، امید، محبت، پیار، ممتا جیسے جذبات صرف کالا بدل سے وابستہ تھے۔ اور اس کے جاتے ہی وہ اس کی کھال جو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ٹھمکی کی کل کائنات ہے لے کر وہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاتی ہے، اس افسانے میں ایک عجیب وغریب سا پہلو یہ بھی ہے کہ کہاں انسان کی محبت جانور سے اس قدر بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے شریک حیات یا شریک حیات نہ بھی ہو تو دوسرے انسان کو ہمیشہ کے لیے فراموش کر سکتا ہے۔

اشفاق احمد ''سلامتے کی مار'' میں شخصی آزادی کے ساتھ ساتھ اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کو اپنے حقوق کے لیے عزت نفس کے لیے خود ہی کوشش کرنی پڑتی ہے اور خود آواز اٹھانے سے، کوشش کرنے سے، ہمت دکھانے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں جیسا کہ اس افسانے میں سلامتے نے چوہدری کو ایسا سبق سکھایا کہ اس کے چیخنے کی آواز سب نے سنی چوہدری کی اپنی بیٹی سلامتے سے شاید کچھ ہی بڑی یا اس جتنی تھی لیکن وہ سلامتے کو لے جانے سے ذرا بھی نہیں۔

> ''چوہدری جلال نے کہا'' لے پھیر مجھے تو آج ہی ڈولا چاہیے سلامتے کا کل میں عارف والے جانا ایں میری چھوٹی دھی کا وڈا منڈا سنت بیٹھا اے۔''

ہوس میں ڈوبا چوہدری نکاح کا انتظار بھی نہیں کر سکتا یعنی خوف خدا بھی پیش نظر نہیں، اس افسانے میں اخلاقی تنزلی کی حد ہے بیان کی گئی ہے مثلاً:

> ''چوہدری جلال نے کہا'' پر مولوی کے نہ آنے تک میں تو نئیں رک سکتا ناں نکاح تو دو چار دن پچھے بھی ہو سکتا ہے''۔(۱۲۸)

اور پھر حق مہر پانچ ہزار پکڑ کر تو گاموں بے زبان ہو جاتا ہے۔

''گاموں نے جد پانچ ہزار کی تھی دیکھی تو کھڑا کھڑا پگھل گیا۔سوچیا چوہدری ٹھیک ہی کہتا ہے۔ پنج ہزار کے پچھے تو کوئی بے اصولی نئیں رہ جاتی''۔(۱۲۹)

اور یوں سلامتے کی بے بسی، مظلومیت اپنے عروج پر ہے۔سلامتے علامت ہے ہر مظلوم شخص کی اور چوہدری جلال ظالم اور جلاد کی اور گاموں وہ کردار ہے جو عام نظر آتے ہیں اور سب جانتے بوجھتے بھی روپیوں کے عوض بے اصولے ہو جاتے ہیں۔اشفاق احمد حقیقی بنیادوں پر حالات کا جائزہ لے کر مظلوم کو یہ بتا دینا چاہتے کہ اب اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے خود ہی اٹھنا ہوگا اور خود کو اپنے ہونے کا احساس دلانا ہوگا خود ہی ان ظلم کی زنجیروں کو توڑنا ہوگا۔ جہاں باپ بھی پانچ ہزار روپے لے کر تمام رشتے، مذہب، اخلاقیات، خون کی پکار بھول جاتا ہے وہاں خود ہی ان ناپاک اور انسانیت کو پامال کرنے والے ہتھیاروں کو خود انہی کی موت دیتی ہوگی۔اور سلامتے نے اسی طرح کیا۔گلو جب چوہدری کی کوک سن کر گاموں کو سارا حال سناتا ہے کہ:

''گلو بولیا''اوہ بڑی تکلیف وچ ھیگا۔ کہندا اے میں معصوم ملوک کوں بگھیاڑی پکڑ لیا اے۔سی وچ میری جان چھڑاؤ میں کون بچاؤ میرے تے رحم کرو''۔(۱۳۰)

گاموں،گلو کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا ہے کہ اب میرے جانے سے سلامتے تھوڑی چوہدری کو نہیں چھوڑے گی اور مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔افسانے میں مرقوم ہے کہ:

''گاموں بولیا''ہن میں کی کراں۔اوس سور کی بچی نے ہتھ ای ایسا پایا ہیگا کہ بندا اہل نئیں سکدا۔ یاں مر گیا ہاں تو بہ تلا کرے چھٹ گیا...... دعا کرو، نال منت خوشامد کرو۔ چوہدری بچ جائے، گاموں وی بچ جائے۔ بڑا بھاری مقدمہ بن سکدا ہیگا میرے پورے ٹبر تے......گلوا یہہ گل سن کے رولا پاتا، حال دھائی مچا تا پھیر حویلی کی طرف نس گیا پر گاموں اپنی تھاں تے اسی طرح بیٹھا رئیا''۔(۱۳۱)

اس افسانے کے آخر میں گاموں کے اطمینان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے وہ مطمئن ہو گیا ہے اور سلامتے کی مار سے چوہدری کو چھڑانا نہیں چاہتا ہے۔دوسرے مصنف اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں بلکہ یقین دلاتے ہیں۔خود کی حفاظت کے لئے، اپنے وقار کے لئے، اور عزت کو بچانے کے چوہدری جیسے کرداروں کو جب تک ایسی مروڑی نہ دی جائے کہ وہ بلبلا اٹھیں ظلم کو نہیں روکا جا سکتا اور یہ پہلو بھی ہے کہ حالات کے قدموں میں گرنا نہیں چاہیے بلکہ مقابلہ کر کے حالات کو

اپنے بس میں کیا جا سکتا ہے کیونکہ ہمت اور حوصلے سے ظلم کی ان زنجیروں کو توڑا جا سکتا ہے پھر خود آپ کو روپوں میں تولنے اور بیچنے والے بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔

''چل چلی'' اشفاق احمد ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کرتے ہیں جو اپنی تہذیب اور مٹی سے رشتہ توڑ چکی ہے۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ہے لیکن اندر سب کچھ بدل چکا ہے۔ ماں سے ملتی ہے تو ماں خاموش ہے۔ مثلاً:

''میری ماں کوٹھے کی کاندھ نال لگی میرے اور ویکھی جاتی تھی اور بالکل چپ تھی''۔

''ابا کا رویہ بھی بالکل بدل ہوا ہے جو پہلے دیکھتے ہی ''بلے بلے'' کے نقارے بولتا ہے۔ آج کمزور آواز میں بات کر رہا۔

''نہ میرے نزدیک آیا نہ پیار دتا۔ نہ کوئی ہور گل کیتی حالانکہ میں پورے چار مہینے بعد گھر آئی تھی''۔ (۱۳۲)

بھائی جو پہلے کالج بابت، ٹریننگ اور امتحان کے بارے میں پوچھتا اور خوش ہوا کرتا تھا اور اس کے واسطے شہر سے چیزیں لاتی ہیں تو وہ جا رہا ہوتا ہے۔

''میرے ویر کو ان شیوں کا بڑا شوق تھا پر جد میں ایہہ دوئیں شئیاں سوٹ کیس وچوں کڈھ کے باہر آئی تے اوہ ڈیوڑھی وچ جا رہیا تھا''۔ (۱۳۳)

پرانی سہیلی ملتی ہے تو گھبرا کر پریشان ہو جاتی ہے۔

اسی طرح نوراں کا بھائی بھی مل کر پرے ہو جاتا ہے۔

اور ان تمام اجنبی رویوں سے تنگ آ کر صفیہ کو شہر کی یاد ستانے لگتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''کل رات جب میں لہور میں تھی تو کیا اچھا وقت گزر رہا تھا۔ لوہے کے بیوپاری کا لڑکا جو اپنے ابا جی سے تھوڑا ای چھوٹا تھا ہم دونوں سہیلیوں کو کھانا کھلانے چینی ہوٹل لے گیا تھا...... اس کو کتنے اچھے اچھے لطیفے یاد تھے اور وہ ہر بات پر شرارتی ہاتھ بڑھاتا اور میں اور رشیدہ کیسے باری باری اس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے تھے پھر وہی ہمارا سامان ہوٹل سے لے کر ہمیں اسٹیشن چھوڑ کر گیا اور اس کی میزبانی سے ہم اپنے اپنے گاؤں پہنچی''۔ (۱۳۴)

جب اپنی جڑوں سے رشتہ کٹ جاتا ہے تو اپنوں کی خاموشی سے پریشان ہونے کے بجائے غیروں کے التفات نظر آنے لگتے ہیں اور اپنوں کے آنسو نظر آنا بند ہو جاتے ہیں۔ احساس کا رشتہ ختم ہونے لگتا ہے۔ اور خود بینی کے بجائے اپنے غلط اور غیر درست نظر آتے ہیں اور وہی خمار ذہن پر چھایا رہتا ہے جس سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ صفیہ کو سب کی خاموشی ناگوار گزرتی ہے لیکن یہ سوچنے یا سمجھنے کے لیے تیار نہیں کہ اتنے سارے رشتوں میں تبدیلی کی وجہ خود اس کی تبدیلی ہے اور یہ بات کسی حد تک وہ جانتی بھی ہے لیکن اس سے نظریں چرا جاتی ہے اور دوسروں کو ہی قصور وار سمجھتی ہے۔ صفیہ میں یہ سوچنے کی صلاحیت ہی ابھی پیدا نہیں ہوتی کہ وہ اچھے برے کی پہچان یا انتخاب کر سکے، مصنف کا احساس ڈوبا افسانہ پڑھنے والے ہر شخص کو خود سوچنے کی دعوت دیتا ہے وہ چاہتا ہے کہ قاری کو خود احساس ہو کہ کیا چیز بہتر ہے؟ وہ خود انتخاب کرے، اپنی تہذیب سے رشتہ توڑنے والوں کے لیے بھی واضح قیمت رکھ دی گئی ہے کہ اسی کی قیمت اپنوں سے دوری ہے۔ جو چاہو کر لو، اور یہ بھی تنبیہہ ہے کہ یہ بھول جاؤ کہ جب اندر سے بدلو گے تو اپنوں کو پتہ بھی نہ چلے گا بلکہ تمہاری خوشبو تک بدل جائے گی۔ سنگی ساتھی یار پرانے سب دور ہو جائیں گے۔ ماں باپ بہن بھائی فوراً جان جائیں گے۔ ماں باپ کے لیے یہ پیغام ہے کہ اپنی اولاد کو اس قدر بے لگام اور آزادانہ چھوڑو کہ کل کو ان کو تمہارے درد، تمہارے آنسو ہی نظر آنے بند ہو جائیں اور وہ اپنی ماں کی گود کو بھول کر شہر کے گور میں دفن ہو جائیں جہاں ان کا نام و نشان نہ ان کو مل سکے نہ تم ہی ان کو ڈھونڈ سکو، اشفاق احمد نے ہر بات اپنے جزیات کے ساتھ قارئین کے سامنے رکھ دی ہے کہ اب خود ہی فیصلہ کر لو کہ اندھیروں میں کھونا ہے کہ روشنی کا سفیر بننا ہے۔ اپنوں کو کھونا ہی یا غیروں کے ہاتھوں کھلونا بننا ہے۔

اشفاق احمد نے ''ڈھیچک چال'' میں انفرادی اخلاقیات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض اوقات ہم اپنی طاقت اور جوانی کے زور میں کمزوری اور بڑھاپے کا مذاق اڑاتے ہیں، چڑاتے ہیں اور تضحیک کرنے سے اجتناب نہیں کرتے لیکن کبھی کبھی حالات خود ہمیں ہماری جوانی کے ایام میں ہی ایسے دوراہے پر لاکھڑا کرتے ہیں کہ ہم دوسروں کی نظر میں بے کار اور ڈھیچک مال بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ کہانی گاؤں کے تین چوروں گاڑی، پھلا اور بمبو سے شروع ہوتی ہے، جو چوریاں کرتے ہیں اور حصہ جاگیردار کو دیتے ہیں کبھی کبھی وہ حصہ مار بھی لیتے ہیں جاگیردار کو اس بدمعاشی کا پتہ ہے لیکن وہ نظر انداز کر دیتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ اب جگہ جگہ مدرسے کھل گئے ہیں اور چور ڈھونڈنے سے نہیں ملتے، یہاں ہمیں مصنف کی یہ امید بھی نظر آتی ہے کہ شاید مدرسے کھلنے سے اب اخلاقیات کا معیار بلند ہو جائے اور تعلیم، ادب کے ساتھ ساتھ اخلاق کے دروازے

بھی کھل جائیں۔

گاگوان سب سے چھوٹا تھا لیکن ہاتھ میں بڑی صفائی رکھتا تھا، جاگیردار اور تینوں چور اس کی ہاتھ کی صفائی کو مانتے تھے، اسی گاؤں میں سرداروں کی ایک بچھیری تھی، جس کی بڑی دھوم تھی، گاگو کی بھی اسی پر نظر تھی کیونکہ گاگو نے کم لیکن ہمیشہ اچھا مال چرایا تھا، اور کمزور مال کو وہ ڈھیچک مال بلاتا تھا اور اس سے جان چھڑاتا تھا۔ یہی گاگو جب بچھیری کو چرانے جاتا ہے، گازی، بمبو اور پھلا اجڑے اسٹیشن کی کوٹھڑی میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ آگے جاتا ہے، اور وہاں ایک عورت بچھیری کی رکھوالی پر ہوتی ہے، اور خوب کشتی کے بعد اس کے ہاتھ موٹا سریا آتا ہے اور وہ گاگو کے سر پر مارتی ہے۔ خون نکلتا ہے، اور جب ہوش آتا ہے تو اپنے آپ کو وہیں پر پاتا ہے۔

''جب اسے ہوش آیا تو اس کے ماتھے پر ایک پٹی کس کے بندھی تھی اور اس کا سر بوسکی کے تھان پر پڑا تھا۔
بلونگڑے نے چمکار کر آکھیا ''اٹھ چناں! نہیں تو کوئی آجائے گا''۔
گاگو من من کر کے بولیا ''مجھے پہلے ہی بخار تھا اس پر تو نے ماتھا پھوڑ دیا۔
باہر نکل کر اکیلا کیسے چلوں گا کسی آسرے کے بغیر
''میں جو تیرے ساتھ چلتی ہوں۔ اس نے ہولے سے کہا ''باہر نکل''
ہرے ہرے کھیتوں میں چلتے ہوئے جب وہ گاگو سے دو قدم
آگے نکل جاتی تو پلٹ کر کہتی ''تو آدمی ہے کہ ڈھیچک مال؟
............جلدی جلدی قدم اٹھا چناں! راہ کھوٹی ہوتی ہے''
وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا رہا اور گازی پھلا اور بمبوا جڑے اسٹیشن کے ٹوٹے کھوٹھے میں اس کا انتظار کرتے رہے''۔ (۱۳۵)

اور اس طرح افسانے کے آخر میں خود پر مان کرنے والا جس پر سارے رشک کرتے ہیں۔ خود وقت کے ہاتھوں ڈھیچک مال بن کر رہ جاتا ہے۔ اور جانوروں کو ڈھیچک مال کہتے ہوئے خود آدمی ہوتے ہوئے بھی ڈھیچک مال کہلاتا ہے۔

اشفاق احمد ''ضابطے کی کارروائی'' میں بیان کرتے ہیں کہ اخلاقی بوجھ اور غیر اخلاقی رویوں سے انسانی زندگیاں اندھیروں کا شکار ہو جاتی ہیں اور بوجھ تلے دب جاتی ہیں۔ مصنف نے اس افسانے میں اور بھی چھوٹی چھوٹی اخلاقی جزیات

کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً سپاہی کی خواہش کا دل میں دم توڑ دینا اور ضابطے خان کی خاموشی کو گھر والوں کا غرور سمجھنا یعنی مصنف یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ جب ہم عہدہ اور ترقی حاصل کریں اور اپنے اردگرد اور گھر والوں کو اور زیادہ خوش اخلاقی اور عاجزی سے ملنا چاہیے نہ کہ وہ یہ سمجھنے لگ جائیں کہ یہ ہم ان سے برتر ہے اگرچہ ضابطے خان کی خاموشی کی وجہ غرور یا تکبر نہیں بلکہ اس کی اپنی پریشانی تھی۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانے ''رشوت'' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ناجائز تعلقات میں خسارہ ہی خسارہ ہے جہاں مذہب اس بات کی تنبیہہ کرتا ہے کہ شادی شدہ عورتوں سے تعلقات پالنا گناہ کبیرہ میں ہے۔ وہاں دنیاوی طور پر بھی ناپسندیدہ ہے اس لیے جاگیردار یہ دیکھ کر اپنے بیٹے شدین کا بیاہ کر دیتا ہے، لیکن یہاں شدین دوستوں کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے، جہاں اس کے دوست اس کو اور ہی سیکھ دیتے ہیں اور رہی سہی کسر یہاں پر نکل جاتی ہے اور شدین ہمیشہ کے اخلاقی پستی میں گر جاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے شدین کے ذہن و دل پر اس کی بیوی کا تصور ہی چھایا ہوا تھا اور وہ اپنے دوستوں سے کہتا ہے کہ اب میں اس کا اور وہ میری ہے۔ میرا انتظار نہ کرے گی تو اپنے بابل کا کرے گی۔

لیکن دوستوں کے سکھانے سمجھانے کے بعد اس کی سوچ بدل کر رہ جاتی ہے۔ اس سے پہلے شدین کے کردار میں بہتری کے اثرات نظر آئیں جو رات کے اولین حصے میں ہی خراب صحبت کی نذر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ فرمائیں: ''چدی نے کہا ''خیر جاگیردار تیری خوشی ہے۔ چاہے جو میں آئے سمجھ پر بھابی تیری انتظاری میں نہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بھابی ہوئے گی اور لو بھی نائین جاگے گی''۔

''شدین نے کہا ''یار وکھل کر بات کرو''۔

گھنیے نے کہا ''بے صبرا آگے بھی تو سن''۔

ادو نے کہا ''دس پانچ اس کے ہاتھ پر رکھو......سب ٹھیک ہو جاتا ہے''۔

شدین کے یار اس کو احساس دلاتے ہیں کہ یہ کوئی گناہ نہیں بلکہ

''سردار سوہنیا پانچ لے کر تو مصنف خون معاف کر دیتا ہے۔ یہ تو نہ کوئی جرم ہے نہ تقصیر''۔(۱۳۶)

اس کے بعد شدین جب گھر جاتا ہے تو باہر بیٹھی نائین کی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے اور جب وہ بار بار کہتی ہے کہ بنی اندر ہے تو شدین کہتا ہے کہ

''اسے سونے دے۔ دفع کرو''۔(۱۳۷)

اور یہاں پر افسانہ ختم ہو جاتا ہے لیکن درحقیقت یہاں سے شدین کی اس زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے جو سراسر گندگی اور غلاظت کے اندھیروں میں ڈوب جائے گی۔ اشفاق احمد برائی کے سدباب کی جانب راغب نظر آتے ہیں تا کہ اس ناسور کو معاشرے میں سے ختم کیا جا سکے۔

اشفاق احمد کے افسانے ''ننگ ناموس'' میں بیو دارے کو یقین دلا دیتی ہے کہ اس کی بیوی اور ملک کا یارانہ ہے۔ پھر شام کو دھاموں کے آنے پر دارا ڈانگوں سے اس کا سر نیلوں سے بھر دیتا ہے۔ دھاموں اسی وقت ملک کے گھر روتی چیختی پہنچ جاتی ہے۔ ملک غصے سے بھر جاتا ہے اور حیدر میراثی کو دارے کو لینے کے لیے بھیج دیتا ہے اور دارا جسے دیسی پستول بنانے کے خیال سے بھی نفرت کی تھی آج خود اپنے ہاتھوں سے پستول بنا رہا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

''رات چھا رہی تھی۔ بھٹی کے لال لال کوئلے کوٹھے میں چانن کر رہے تھے اور آج دارا کسی کے کہے بنے دیسی پستول بنا رہا تھا''۔(۱۳۸)

یہ پستول بنانے والا شخص معاشرے کا وہی شریف آدمی ہے، جو بھوک، افلاس، غربت کا مقابلہ تو اپنی ایمانداری اور سچائی سے کر سکتا ہے مگر غیرت کے لیے جان بھی دینے سے دریغ نہیں کرتا۔ یہ وہی دارا ہے جو بلم برچھے بنانا تک پسند نہیں کرتا، ہتھیاروں کی طرف منہ نہیں کرتا، بدمعاشوں سے نہیں ڈرتا، کسی کے سامنے نہیں جھکتا مگر آج ملک کی موت کا سامان اپنے ہاتھوں سے تیار کر رہا ہے۔ یہ لوہار ملک کی طاقت سے نہیں ڈرتا، جان لینے اور دینے سے نہیں ڈرتا لیکن اپنا بدلہ اتارنا چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اس کرب سے ملک بھی گزرے جس سے وہ خود گزر رہا ہے۔ وہ سبق سکھانا چاہتا ہے۔

''دارا نشے میں سوچ رہا تھا پستول چلے گا تو دونوں مر جائیں گے...... دونوں ختم ہو جائیں گے پر ملک کی عزت میں فرق نہ آئے گا ملک زندہ بھی ملک تھا اور مر کر بھی ملک رہے گا''۔(۱۳۹)

یہ خیال آتے ہی دارے کے ذہن میں شام کا واقعہ آ جاتا ہے۔

''مزارع ڈھاڑیں مار رہا تھا اور ملک کہہ رہا تھا یہ کتی نہیں میری دھی ہے۔ میری ننگ ناموس ہے''۔(۱۴۰)

اور یہاں پر دارا ملک سے ایسا بدلہ لیتا ہے جو قاری کو نہ صرف چونکا دیتا ہے بلکہ اس کا دل بے اختیار دارے کی اس

عقل مندی کو داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن اس سے یہ سوچ بھی جنم لیتی ہے کہ کس طرح دارے جیسا سیدھا سچا آدمی اس سطح پر اتر آیا۔ معاشرے کے منفی کردار اس قدر طاقت ور ہے کہ اچھائی پر غالب آ سکتے ہیں دوسری طرف یہ بھی نقطہ ہے کہ ایک غریب وفادار، بے بس شخص بھی طاقت ور اور جابر شخص کو مزا چکھا سکتا ہے اور اپنی ہمت سے برائی کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ کہانی کے آخر میں بھی دارا ملک کی جان کا دشمن نہیں ہے بلکہ اس بے حسی کا دشمن ہے جو ملک کے مزاج کا خاصہ ہے۔

افسانے ''بچھیری'' میں مصنف افسانے کے پہلے کا حصے میں چوہدری تغیرے کی جانب ذات پات کی تقسیم کو واضح کرتے ہیں کہ اعلیٰ ذات اور ادنی ذات کی تخصیص سے معاشرے میں طبقاتی تقسیم جنم لیتی ہے۔ جب چوہدری تغیرا شوقاں (ولائیتی گھوڑی) کو لانے کے لیے اپنے بیٹے سے کہتا ہے تو گلو جولاہا کہتا ہے کہ میں لے آؤں تو چوہدری تغیرا فوراً جھڑک دیتا ہے۔ افسانے میں کچھ یوں مرقوم ہے کہ:

''چوہدری نے اکڑ کر کہا ''بیٹھ اوئے کم ذات! دھیوں جیسی بچھیری کی راس بیٹے کے ہاتھ میں ہی سجتی ہے۔ تو ذات کا جولاہا، کھیس میں پھل چڑیاں ڈالنے والا! تجھے کیا پتہ گھوڑا کیا ہوتا ہے۔ اوئے میں تو تجھے اپنی شوقاں کے اگاڑی پچھاڑی بھی نہ باندھنے دوں، تو اسے واپس لانے کو کہہ رہا ہے'' ۔(۱۴۱)

اشفاق احمد اپنے اس افسانے کے ذریعے سے یہ بات بالکل واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ اعلیٰ ذات، اونچے شملے والوں کے کام بھی اعلیٰ ہوں اور وہ معاشرے میں اچھائی کے علمبردار ہوں کیونکہ یہی اعلیٰ ذات، حسب نسب والا جب شٹالے سے شوقاں کو لانے کے لیے نیول کھولنے والا ہوتا ہے تو نوری کاٹو کے آ جانے پر سب بھول کر اخلاقی تنزلی کا شکار ہو جاتا ہے اور افسانے کے اس حصے میں واضح ہوتا ہے کہ حیدری کے تعلقات صرف نوری کاٹو کے ساتھ ہی نہیں ہیں بلکہ گاؤں کی اور عورتوں کو بہلا پھسلا کر بداخلاقی کا مرتکب ہوتا رہتا ہے مثلاً:

''ادھر چل سامنے بیلے میں''

''رہنے دے مجھے پتہ ہے سونہہ قرآن کی تو بڑا خراب ہے''

''احمق بھلے کا سماں نہیں کھیت میں کسی نے دیکھ لیا تو دونوں مارے جائیں گے''

''نہ میں نہیں جاتی''

''تیری مرضی پر بات بڑی مزے دار ہے تیری سننے والی''۔

پر تیری کوئی گھوڑی لے گیا پھر؟'' کوئی نہیں لے جاتا۔ نیول ڈالا ہوا ہے''

''اچھا چل۔ پر دیکھ لے، مجھ جلدی ڈیرے تے اپڑنا ہے''

''ایک منٹ میں سب کھول دوں گا تیرے سامنے'' (۱۴۲)

اس افسانے میں اشفاق احمد ایک اور بات کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں جس کا تعلق دین سے بھی ہے اور وہ مکافات عمل ہے۔ حیدری کے یہ بدافعال کا ذمہ دار وہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کا باپ بھی انہی بداخلاقیوں کا مرتکب ہے۔ مثلاً:

''شاباش تیرے'' ریباں نے شرم دلاتے ہوئے چوہدری کی آستین کھینچی اور کہا ''پھر کس کا ڈر ہے تیری بچھیری چوہدری! کسی کی ہمت ہے جو ہاتھ لگا لے......چل''

اور وہ دونوں کنوئیں سے پرے بکائیں کے ذخیرے میں جا بیٹھے''۔ (۱۴۳)

موجودہ افسانے میں بھی اشفاق احمد یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اچھائی، برائی کا تعلق ذات پات کا طبقاتی تقسیم سے نہیں ہے، سب انسان برابر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ عاجزی کو پسند کرتا ہے اور بڑے بول بولنے والے کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ وہ ہے جس کے افعال اور اعمال بہتر ہے۔ چوہدری، گاموکو تو ولایتی گھوڑی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتا لیکن اس کا اپنا بیٹا، اس کی گھوڑی کی حفاظت نہیں کر پاتا اور تیسری بات مصنف یہ واضح کرتے ہیں جس گناہ اور بے حیائی سے تم اپنی اولاد کو روکتے ہو، پہلے تمہیں خود اس سے اپنا ہاتھ روکنا ہوگا۔ چوہدری کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ جس بے حیائی کا وہ مرتکب ہوا ہے اس کا ارتکاب اس کے بیٹے نے بھی کیا ہے۔ اور یہی چوہدری جو افسانے کے آغاز میں بہت غرور اور تکبر سے اکڑ کر گاموکو ولایتی گھوڑی کو ہاتھ بھی لگانے سے روکتا ہے۔ وہ اور اس کا بیٹا اس کی حفاظت نہیں کر پاتے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ باپ بیٹا تو رنگ رلیوں من مانیوں میں مصروف رہیں تو بچھیری کی حفاظت خدا کرے، مصنف یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر گناہ میں مصروف رہو گے تو اپنی قیمتی چیزوں کو کھو دو گے اور پھر اپنوں کو اور اپنے آپ کو کوسنے کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔

اشفاق احمد نے پھمن کہانی'' میں ایک غریب کی زندگی کی پیش کش کے ساتھ ساتھ معاشرتی تعصب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جب پھمن چوہڑوں کی بستی سے نیتی چوہڑی کے بیاہ پر، کھبو چوہڑے سے روٹ لے کر کھاتا ہے تو اسے بڑا مزا

آتا ہے جب یہ سارا قصہ اپنی ماں سے کہتا ہے تو ماں کہتی ہے کہ کسی اور سے نہ کہنا، حالانکہ خود اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ملاحظہ فرمائیے:

''اس میں گڑ بھی تھا اور سونف بھی! کچا آٹا بہت میٹھا تھا پر ٹکڑا جلدی ختم ہو گیا۔ گھر آ کر جب میں نے اپنی ماں کو سارا قصہ سنایا تو اس نے پہلے میرے سر پر دھپا مار کے مجھے کرلیاں کرائیں پھیر آکھن لگی ''کسی ہور تے گل ناں کریں کہ میں ٹکڑا کھایا ہیگا۔ اپنے تک رکھیں۔ لوک تینوں اس گام تے کڈھ دیں گے۔

''میں بڑا ہریان ہوئیا کہ روٹی کھان نال گاؤں تے کیوں نکال دیں گے!'' (۱۴۴)

پھمن کے منہ سے یہ مکالمہ ادا کروا کے اشفاق احمد دراصل اس تعصب کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو صرف معاشرتی دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے اور بعض اوقات انسان بغیر وجہ کے اس بنے بنائے راستے پر چلتا چلا جاتا ہے۔ اس افسانے میں اشفاق احمد طبقاتی تقسیم کے ساتھ ساتھ روپے پیسے کی تقسیم کی بھی بات کرتے نظر آتے ہیں جس میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

''میرا ابا میری کوں آکھیا کرتا پٹواری وڈی لیتا ہے اس کر کے اس پاس بڑا نانواں۔ میں اپنی نانی تے پچھیا میرا ابا وڈی کیوں نئیں لیتا۔ با وڈی لووے تو ہم بھی امیر ہو سکدے تھے پر میری نانی کیا وڈی لینا غریباں کے اختیار وچ نئیں۔ وڈی وڈھے لوک ای لے سکدے ایں۔'' (۱۴۵)

اشفاق احمد نے اس افسانے میں غریب کی زندگی کی محرومیوں کے بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان محرومیوں، بے بسی، ظلم و تشدد غریب کے ذہن پر کیا اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اور لاشعور میں پلنے والی یہ محرومیاں خوابوں کی صورت ازالہ کرتی دکھائی دیتی ہے پھمن کے ذہن پر اس کے باپ کی مار پیٹ کے اثرات ہوتے ہیں اور وہ خواب دیکھتا ہے کہ:

''اک دن میں سفنا ڈٹھا بئی اسیں امیر ہو گئے ایں تے ہمارے گھر پنج، گھوڑے تے اک بگھی اے، میرا ابا چھمکاں نال لوکاں کوں مار رئیا تھا تے لوکی روئی جاتے تھے بہت ساریاں تئیاں ہتھ جوڑ کے کھڑیاں تھیں اور میرے ابے کے واسطے حلوہ پکا کے لیایاں تھیں''۔ (۱۴۶)

پھمن کے خواب اس کی محرومیوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ بچپن کی محرومیاں اور باپ کی شفقت سے محرومی پھمن کو سرکس والوں سے وابستہ کر دیتی ہے۔ اشفاق احمد کے نزدیک باپ کی محبت سے محرومی کا دکھ یا زخم ایسا زخم ہے جو ناسور بن کر

تمام عمر رستا رہتا ہے۔ پھمن کو سرکس میں ٹکاں دین والا گھبرو اپنا بیٹا لگتا تھا اور وہ سرکس میں کام زیادہ اور معاوضہ کم ہونے کے باوجود کام کرتا رہتا ہے کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی محبت میں مبتلا ہے۔ یہ بھی اس کی شخصیت کا وہ خلاء ہے جو باپ کی توجہ سے اور شفقت کی محرومی سے اس کے اندر گھر کر گیا ہے۔

''پر میں اس کو پتہ نہیں لگنے دیا کہ اوہ میرا بیٹا اے جیسی محبت میرے دل وچ اس کے واسطے تھی ایسی میرے ابے کی میرے واسطہ نئیں تھی۔ پتہ نئیں کیا وجہ تھی کہ میرا ابا مجھے دل تے پسند نہیں کرتا تھا حالانکہ میں اپنے بیٹے خاطر سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ میرے اور میرے ابے وچ بڑا فرق تھا''۔ (۱۴۷)

پھمن سرکس کی گندی بولی اور اشارے دیکھ کر یہاں سے بھی بھاگ اٹھتا ہے اور کسی مسجد میں جا کر بیٹھ جاتا ہے، جہاں مولوی اس کا سہارا بھی بن سکتا تھا اسے صحیح راستے پر بھی ڈال سکتا تھا لیکن وہ اسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''اک دن سویرے سویرے میں سرکس چھڈ کے نس گیا۔ نال ای مینہ برسن لگ گیا تے میں اک مسیت وچ ٹر گیا۔ میرے بیٹھن نال صف بھج گئی تے مولوی نے میرا کن پکڑ کے مینوں باہر نکال دیا۔ باہر نکل کے میں ہوروی بھج گیا تے مینوں سیت چڑھ گئی''۔ (۱۴۸)

اشفاق احمد نے بغیر کسی لگی لپٹی کے زندگی کے تلخ حقائق کو، کرداروں کی اصلی شکل وصورت کے ساتھ بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ وہ پہلو ہیں جو ہمارے اردگرد قدم قدم پر موجود ہیں۔ لیکن ہم ان سے قطع نظر کر لیتے ہیں یا آنکھیں موند لیتے ہیں۔ مصنف کے نہایت حقیقت پسندی سے ان حقائق کو بیان کیا ہے اور اس میں بالکل بھی بناوٹ سے کام نہیں لیا۔ اس افسانے میں معاشرتی برائیوں اور بداخلاقیوں کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ مصنف نے قارئین کے سوچ کے نئے در کیے ہیں۔ کبھی سوالات کے ذریعے کہیں احساسات کے ذریعے کہیں روکر، کہیں ہنس کر، کہ ہم ان بداخلاقیوں کو کیسے ختم کر کے معاشرے میں توازن قائم کر سکتے ہیں۔

و۔ صحافے افسانے

اشفاق احمد کا افسانہ ''سردار بیگم'' افسانہ کم اور ان کی ماں کا خاکہ زیادہ ہے اس میں وہ اپنی ماں کی جتنی بھی باتوں کا ذکر کرتے ہیں وہ اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہوتیں ہیں۔ مثلاً اپنے بچوں میں جب بھی غرور اور تکبر کو وہ دیکھتیں تو

انھیں عاجزی کا درس دیتی تھیں کیونکہ غرور اور گھمنڈ وہ اخلاقی تنزل ہے جہاں سے انسان، آدمیت کے درجے سے گر جاتا ہے۔اور یہ اخلاقی برائیاں اس کے اور دوسروں کے لیے تباہی کا باعث بنتی ہیں۔اشفاق احمد یوں لکھتے ہیں کہ:

''جب کسی وجہ سے انھیں یہ احساس ہوتا کہ ہم میں تکبر، رعونت یا گھمنڈ کا کوئی شائبہ پیدا ہو گیا ہے تو وہ اکثر لکھا کرتیں:

کبیرا ایسے ہو رہو جیسے نربل بیر پیچھے پیچھے ہر پھرے کہت کبیر! کبیر!!'' (۱۴۹)

اور یہ سبق نہ صرف ان کا اپنے بچوں کے لیے ہے بلکہ تمام انسانوں کے مجموعی رویے کے لیے بھی ہے کہ عاجزی اور منکسر المزاجی کو اپنا لینے والوں کو کسی بھی طرح کی محتاجی پیش نہیں آتی بلکہ سب اسی کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔اور اسی کا نام لیتے ہیں۔عاجز انسان بہتے خاموش سمندر کی طرح ہوتا ہے جو سب کے لیے فائدہ مندہ ہوتا ہے۔اور ندی، نالوں، دریاؤں، چشموں سے آنے والے پانی اسی میں گرتا ہے۔اماں سردار بیگم کی یہی تعلیم اپنے بچوں کے لیے تھی کہ بے نام، بےضرر، بے لوث ہونے میں جو انعام واکرام اور عزت ومنزلت ہے وہ گھمنڈ اور تکبر میں نہیں ہے۔

فی زمانہ ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو ہمیں غریب اور نادار لوگوں کی حالت پر ترس کھانے والے تو بہت سے لوگ مل جائیں گے لیکن ان کی مدد کے لیے آگے بڑھنے والے لوگ بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ایسے ہی لوگوں کے لیے اشفاق احمد کی اماں جی کے پاس ایک اخلاقی درس موجود تھا۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''اماں ہلکے سے خوف، ذرا سی ہچکچاہٹ کے ساتھ دبی ہوئی آواز میں کہتیں ''ہمیں اپنے غریب بہن بھائیوں کی حالت زار دیکھ کر اور ان کی بے سروسامانی اور بے آبروئی پر ترس کھا کر ان کی مدد نہیں کرنی چاہیے بلکہ اللہ رسول کے حکم کی وجہ سے ان کی دستگیری کرنی چاہئے۔ترس کھانے اور آنسو بہانے کے مقابلے میں اللہ اور اللہ کے رسول کا حکم زیادہ زور آور اور زیادہ ڈاڈھا ہے۔ہم کو حکم ماننا ہے، ترس نہیں کھانا۔'' (۱۵۰)

کیونکہ جب ہم کسی کی مدد اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں اس پر ترس آ رہا ہوتا ہے تو یہ ہمدردی، دیا، ترس ہماری اپنی ذات کی خوشی کا باعث بنتا ہے اور آہستہ آہستہ ہم میں گھمنڈ اور تکبر آنے لگ جاتا ہے لیکن یہی کام جب ہم اللہ کی مرضی کو پورا کرنے کے لیے کرتے ہیں تو ہم میں اطاعت اور فرمانبرداری کا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہمارا

اولین فرض بن جاتا ہے۔ اور جس کے دل میں اللہ کا خوف پیدا ہو جائے وہ پھر کسی کے لیے بھی نقصان کا باعث نہیں بن سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے ایسے احکام وفرائض ہیں جن پر سوال کرنا منع ہے۔ اس لیے اس کی رضا کے لیے اس کو سمجھنے کے لیے اس کو ماننا ہی کافی ہے اور یہی عقیدہ اماں جی کا بھی تھا۔

اشفاق احمد نے اسی طرح اپنے افسانے ''خود بدولت'' میں جابجا گھمنڈ، تکبر اور غرور کی نفی ہے۔ کیونکہ خرابی شروع ہی یہاں سے ہوتی ہے۔ اور تکبر اللہ تعالیٰ کی نظر میں نہایت ناپسندیدہ خیال، فعل اور عادت ہے۔ اور اگر یہ اخلاق و خصائل میں شامل ہو جائے تو پھر انسان اپنے اشرف المخلوقات ہونے کے مقام سے نیچے گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ اس موجودہ افسانے میں بھی لکھتے ہیں۔ جب قارون، بابے گاموں پر اپنی برتری جتاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ:

''مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے قارون کہ تو کون ہے، لیکن اپنے آپ اور اپنی ذات پر اتنا گھمنڈ نہ کر کیونکہ خدا گھمنڈ کرنے والے متکبر آدمیوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (۱۵۱)

اسی طرح اشفاق احمد اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ اگر تم کسی بھی معاملے میں دوسروں سے آگے ہو تو ہمیشہ اللہ سے ڈر کر رہو اور دوسروں پر احسان کرنے کی کوشش کرو، کیونکہ یہ سب تم پر اللہ کی عنایت ہے نہ کہ تمہارے اپنے افعال و اعمال کا نتیجہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''پھر بابے گاموں نے اونچی آواز میں کہا، میری بات کان کھول کر سن لے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے۔ تو بھی بندوں کے ساتھ احسان کر اور اس دنیا میں اپنی دولت کے زور پر فساد نہ پھیلا۔ میرا سوہنا اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (۱۵۲)

کیونکہ جب اللہ ہم پر رحم و کرم اور لطف و عنایت کی بارش کرتا ہے تو بحیثیت انسان ہم پر فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ان عنایات کو بانٹیں تا کہ زیادہ سے زیادہ بھلائی کی صورتیں سامنے آ سکیں۔ اشفاق احمد مذہبی اعتبار سے اپنے قارئین کو اخلاقی درس دیتے ہیں کہ ہم پر بحیثیت مسلمان اور انسان بھی کچھ باتیں فرض ہیں جن میں دوسروں پر احسان کرنا اور ان کے لیے بھلائی کے اسباب پیدا کرنا لازمی ہے۔ اسی میں انسان کی فلاح ہے۔

اشفاق احمد نے ''آڑھت منڈی'' میں اس طبقے کی نقاب کشائی کی ہے جو غریب عوام کی غریبی کا نقشہ کھینچ کر، نظمیں اور مضامین لکھ کر دولت کماتے ہیں، نمازیں پڑھ کر جام نوش فرماتے ہیں۔ اور عوام کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے

ہیں۔ جیسے کہ حامد صاحب جن کا تعلق باہر کے ممالک سے زیادہ ہیں جہاں دو مختلف مضامین یا تصویر لکھ کر بھیجتے ہیں اور فنڈز اکٹھا کیا کرتے ہیں ان کے گھر ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو ادبی مجلس کا بھی اہتمام ہوتا ہے جس میں دولت مندوں اور سرمایہ داروں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے مختلف لوگ نظمیں پڑھتے ہیں ان میں رومی ٹوپی والے ایک بزرگ بھی ہیں جو حکومت وقت کے خلاف نظمیں لکھ کر لاتے ہیں اور للکارتے ہوئے یوں پڑھتے ہیں جیسے غریب عوام کا سارا درد انہی کے سینے میں موجزن ہے اور پھر جام نوش فرماتے ہیں مثلاً:

> ''مجلس کے خاتمے پر جب سب لوگ برف کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں چاندی کے چمٹوں میں پکڑ کر اپنے اپنے گلاسوں میں ڈالتے تو یہ رومی ٹوپی والے ساتھ کے کمرے میں شام کی نماز ادا کرنے چلے جاتے۔ بڑی دیر تک اونچی آواز میں منت و مناجات کرنے کے بعد واپس آتے تو ان کی خالی کرسی کے سامنے چوکور تپائی پر ایک بڑا سا گلاس لبالب بھرا رکھا ہوتا۔ وہ ہمیشہ آواز دے کر کہتے ''بہت زیادڈال دی آپ نے حامد صاحب'' اور حامد صاحب ہر مرتبہ دھیمی آواز میں ایک ہی جواب دیتے کہ جھاگ ہی جھاگ ہے میر صاحب، ابھی بیٹھ جائے گی تو گلاس آدھے سے بھی کم رہ جائے گا۔'' (۱۵۳)

اس طرح کی دوہری شخصیات کے حضرات ہمارے ہاں عام نظر آتے ہیں۔ مصنف کا مقصد ان ہی کرداروں کو سامنے لانا ہے جو لوگوں کی موجودگی میں تو مصلح قوم اور مولانا بن جاتے ہیں اور بعد میں اپنی شخصی کمزوریوں کے ساتھ زندگی گزارتے نظر آتے ہیں اسی طرح بہت سے سرمایہ دار حامد صاحب کے انداز سے زندگی گزارتے ہیں جو بظاہر مذہبی شخصیات کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور ان کو خوش رکھنے کے لیے ان کی نفسانی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور محافل میں ان سے نظمیں اور دعائیں پڑھوا کر عوام کے دل جیتنے کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔ اسی طرح یہ اپنے پورے پورے گھرانوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔ اس افسانے میں اشفاق احمد نے خواب و خیال کی بات نہیں کی نہ ہی تخیلاتی افسانوی انداز برتا ہے کہ حامد صاحب کی بیٹی کو ایک ایسا کردار بنا کر پیش کریں جو اپنے باپ سے غریبوں کے حقوق کے لیے لڑتی ہے بلکہ نہایت حقیقت پسندی سے اشفاق احمد نے یہ دکھایا ہے کہ ایسے گھرانوں کے بچے دھوکہ دہی اور فراڈ میں اپنے باپ سے بھی دو ہاتھ آگے ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً حامد صاحب جب اپنے مضمون، جس میں انھوں نے چوری چھپے ہیروئن فروخت کرنے والوں کا ذکر کیا ہے، کے لیے بارش کی وجہ سے تصویریں کھینچنے میں ناکام رہتے ہیں تو ان کی بیٹی آسیہ گھر کے ملازم شرفو کو ہی میک اپ، ہیئر سپرے

اور نقلی مونچھیں لگا کر ہیروئن فروش بنا کر تصویریں کھنچوا دیتی ہے ملاحظہ فرمائیے:

''فوٹو گرافر نے کیمرہ فوکس کیا تو شرفو نے دونوں آنکھوں میں ایسا بھینگ ڈالا اور اپنی ناک کا بانسہ ایسے مروڑا کہ اصل کی شکل دیکھتے دیکھتے ڈاکٹر جیکل سے مسٹر ہائیڈ میں تبدیل ہو گئی۔ ڈاڑھی میں پانی کے قطروں نے گھونسلہ بنا کر اسے چھدرا ہونے سے بچا لیا اور شرفو کی مڑی ہوئی گردن نے اسے نان پروفیشنل سے پروفیشنل داڑھی بنا دیا۔ ایک دو، تین فلیش چلے اور حامد صاحب نے آگے بڑھ شرفو کو اپنی بانھوں میں لے لیا۔ آسیہ نے اپنی جینز سے چمٹے بارش کے قطروں کو جھاڑ کر کہا ''آپ ایسے ہی نہ پریشان ہو جایا کریں ڈیڈی جب ہم ہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے' پھر وہ اندر چلی گئی اور فوٹو گرافر جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگا۔'' (۱۵۴)

اور یہ وہی مضمون تھا جس میں منشیات فروشوں کا بھی ذکر تھا۔ انہی مضامین کے ذریعے سے نام اور پیسہ کمایا جاتا ہے۔ اور انہی غریبوں کے دم سے امیروں کی دوکانداری چل رہی ہے۔ اور آج کل تو یہ سب سے بڑا کاروبار بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے جب شرفو واپس اپنے گاؤں پہنچتا ہے تو اپنے کام کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ ایسے صاحب کے پاس کام کرتا ہے جو غریبی بیچتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا کاروبار ہے جو دنیا کا سب سے بڑا کاروبار ہے۔ اور اسی کے زور پر حکومتیں چل رہی ہیں اور امیروں کی شان وشوکت قائم و دائم ہے۔ حکمران اسی وقت حکمرانی کر سکتا ہے جب تک کہ غربت بیچتا رہے اور یہی اس کی حکومت کی مضبوطی کی بنیاد ہے۔ شرفو چاچا نمبردار سے کہتا ہے کہ

''میرا صاحب غریبی بیچتا ہے اور مہنگے بھاؤ بیچتا ہے یہاں بھی بکتی ہے اور ولایت میں بھی۔ ادھر بھی اس کے آرڈر بک ہوتے ہیں اور دساور بھی یہ مال جاتا ہے''۔

نمبردار حسنے تیلی کی اٹھ کر گیا نہیں پر خاموش ہو گیا۔ شرفو نے کہا ''چاچا لاری کس کے زور پر چلتی ہے؟''

پٹرول کے زور پر۔ یاسین چوکیدار بولا۔

اسی طرح حکومت غریبی کے پٹرول سے چلتی ہے۔'' شرفو نے کہا ''اور موگھا کس کے زور پر چلتا ہے؟''

''پانی کے زور پر'' نورا کھنکار کر بولا۔

''اسی طرح بادشاہی غریبی کے بیان کی شہ پر چلتی ہے۔ غریبی کی پھوک نہ بھرو تو حکمرانی کا پہیہ ٹائٹ ہی

نہیں ہوتا''۔(۱۵۵)

اور یوں درج بالا پیراگراف میں مصنف صاف صاف اس بات کو عیاں کر دیتے ہیں کہ غریب سے ہمدردی کے بیانات کے زور پر ہی امیروں کی دوکانیں چلا کرتی ہیں، مقصد یہی ہے کہ سادہ لوح عوام کو وعدوں اور بیانات کے سحر سے آزاد کروا کر حقیقت کی دنیا میں لایا جائے اور اس بات پر ابھارا جائے کہ ان کی طاقت پر ہی حکومتیں قائم یا ختم ہو سکتی ہو سکتیں ہیں۔ تاکہ اپنی اہمیت کو سمجھیں اور خود کو کمزور سمجھنا چھوڑ دیں۔

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں زندگی کی ہر چھوٹی بڑی عادت اور اس کی تربیت کی بات کرتے ہیں اور اس کے اتھ ساتھ ان کے فائدے اور نقصانات سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ اشفاق احمد ''بٹیر باز'' میں نظم و ضبط اور اس کے فوائد بیان کرتے ہیں کہ یہ پسندیدہ ہے کہ اسلام کے بنیادی ارا کین پر عمل کرو اس سے تمہارے لیے زندگی میں بہتری کے اسباب تو بنتے ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ اگر کوئی کمی بیشی رہ جاتی ہے تو جس مقصد کے لیے وہ ارا کین یا احکامات ہیں ان کو اپنی زندگی میں عادتوں کا حصہ بنا لیا جائے تو اس صورت میں بھی تمہاری زندگی میں وہ رکن پورا ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''نماز دراصل ایک ڈسپلن ہے اور ڈسپلن سے ہی سارا کاروبار چلتا ہے۔ جس دفتر میں ڈسپلن نہ ہو، اس میں رشوت اور سفارش عام ہو جاتی ہے اور لوگوں کے کام بند ہو جاتے ہیں۔ نوکری کے زمانے میں آدمی باقاعدگی سے نماز تو نہیں پڑھ سکتا البتہ اگر وہ ڈسپلن پر قائم رہے تو ایک طرح سے اس کی نماز ادا ہوتی رہتی ہے''۔(۱۵۶)

گویا نماز جس وجہ سے فرض کی گئی ہے اگر اس وجہ کو اپنا لیا جائے تو مقصد پورا ہو جاتا ہے اور اس کا فائدہ ہماری روزمرہ زندگی میں ہمیں ملنے لگ جاتا ہے۔ اشفاق احمد ہمیں زندگی کی چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی ناکامیوں اور پریشانیوں سے بچانے کے لیے یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ہمارے اندر جو بھی کمی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور اللہ کی مصلحت ادراک سے پرے ہے اس لیے انسان کو اس کی رضا میں ہی راضی برضا رہنا چاہیے۔

اشفاق احمد نے اس افسانے میں یہ نکتہ بھی واضح کیا ہے محفلوں کی جان بن جانے والے لوگوں کے نظریات ضروری نہیں ہے کہ اصلی ہوں اور ان کے اپنے ہوں بلکہ یہاں سب ہی ایک دوسرے کے نظریات خرید کر اپنا کام چلاتے ہیں اور ان کی خرید و فروخت عام نظر آتی ہے۔ مثلاً جب بابو لطیف نظریات خریدنے کے لیے بازار میں جاتا ہے تو اسے بازار میں ہر

طرح کے نظریات بکنے کے لیے پڑے ملتے ہیں۔ مثلاً

''لطیف نے دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر رکھ کر پوچھا ''آپ کے پاس کچھ اچھے اچھے نظریات ہوں گے؟''

کلرک نے سر اٹھائے بغیر کہا ''ہمارے پاس سرکاری نظریات ہیں اور کافی اچھی حالت میں ہیں۔ اگر آپ وہ لینا چاہیں تو کٹ پرائس پر دے سکتے ہیں............

اگر آپ کو مضبوط، پائیدار، ہیڈن سار نظریات کی ضرورت ہو تو انھیں جنک شاپ پر تلاش کریں۔ پھر اس نے لطیف کے سپاٹ چہرے کو غور سے دیکھ کر کہا ''ایسی دوکانوں پر تلاش کریں جو ولائتیوں کے گھروں کا اور سفارت خانوں کی نیلامیوں کا سامان فروخت کرتی ہیں''۔ (۱۵۷)

یعنی مصنف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اول تو نظریات اپنے نہیں بلکہ خریدے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوسرے سیکنڈ ہینڈ مال والی دکان سے ملتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ زیادہ تر مانگ اور کوالٹی غیر ملکی نظریات ہی کی ہوتی ہے اور یہی زیادہ دیر تک کارآمد رہتے ہیں۔ اشفاق احمد نے اس افسانے میں کھوکھلے نظریات کے اشتہار لگانے والوں کی اصلیت کو بیان کیا ہے کہ اس کا مقصد خود نمائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اشفاق احمد ''ماسٹر روشی'' میں جہاں معاشرے میں فن اور فنکار کی عزت کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ وہ محبت جیسے نرم و نازک جذبے کی استقامت اور پائیداری کی بات بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ اگر انسان کے پاس علم و دانائی، حکمت و دانش مندی ہو دولت ہو، حشمت اور عزت ہو اور وہ محبت نہ رکھے تو یہ ساری چیزیں بے کار ہیں کیونکہ محبت ان سب سے افضل اور بلند ترین ہے۔ اور اسی سے نظام کائنات رواں دواں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں نے کہا ''ماسٹر صاحب! انجیل میں لکھا ہے کہ اگر میں سارے جہان کی بولیاں بولوں اور تمام دنیا کے علم حاصل کرلوں لیکن محبت نہ کروں تو میں ٹھنٹھناتا ہوا پیتل اور جھنجھناتی ہوئی جھانجھ ہوں''۔ (۱۵۸)

یعنی محبت ہی انسان میں تمام خصوصیات آتیں ہیں۔ اور اگر وہ محبت نہیں رکھتا تو ہر شے بے کار اور بے معنی ہے۔ اشفاق احمد نے اس افسانے میں بنیادی موضوع فن اور فنکار کو بنایا ہے کہ ایک فنکار کے لیے اس کا فن ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس کا ہونا اس کے لیے اطمینان کے باعث ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی سے اس کو خوشی ملتی ہے اور اس کو ترقی دے کر اس

کے فن کی تسکین ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''خواتین وحضرات! یہ ایک فن کار کی غیرت اور انا کا سوال ہے۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن فن کو بیچتا نہیں۔فن ایک ایسی چیز ہے جو نہ بیچی جاتی ہے نہ خریدی جا سکتی ہے۔فن تو فن ہی ہوتا ہے''۔(۱۵۹)

اور فن کار کے لیے اس کی عزت افزائی کے لیے یہ بہت ہوتا ہے کہ اس کے فن کو سراہا جائے اس سے عزت سے پیش آیا جائے اور اس کا فن اس کی پہچان بنے۔ اس کی قوم اس کی قدر دانی کرے۔لیکن افسوس ہمارے ہاں اس سے الٹ صورت حال ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے نامور ہیرے موتیوں جیسے فن کار مٹی میں رل گئے۔ ایک عمر جنھوں نے اپنی قوم کی خدمت میں گزار دی بڑھاپے میں انھیں کسمپرسی میں عمر کے ایام پورے کرنے پڑے۔ جنھوں نے تمام عمر سب کو تفریح مہیا کرنے کے لیے اپنے رات دن وقف کیے وہ دلوں سے اتر گئے اور گمنامی میں دم توڑ گئے اور اس کی وجہ ہمارا طبقاتی نظام ہے جہاں فرد کو روپوں اور سونے چاندی کے سکوں سے ناپا اور تولا جاتا ہے۔ اور جہاں فن اور فنکار مٹ جاتے ہیں، دفن ہو جاتے ہیں، خاک میں مل جاتے ہیں لیکن کوئی پلٹ کر آواز نہیں دیتا اور نہ ہی کوئی سنتا ہے اشفاق احمد بھی اس درد کو اس لیے محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ خود آرٹسٹ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اگر میں خود آرٹسٹ نہ ہوتا اور مجھے اپنے انجام اور ماسٹر روشی کی موجودہ حالت کے درمیان کاربن پیپر کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا تو میں کبھی اس کے گھر نہ جاتا، کبھی اس کی دراز قد سانولی لڑکی کے ہاتھوں سے چائے نہ پیتا اور کبھی اس پر ایسا مضمون نہ لکھتا جس کی تیسری اور آخری قسط چھپ چکنے کے بعد بھی قارئین کی زوردار فرمائش رہتی کہ یہ سلسلہ چلتے رہنا چاہیئے''۔(۱۶۰)

اشفاق احمد اس کرب کو شدت سے محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ خود بھی فنکار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فن کار اپنی قوم کی بہت بڑی خدمت اپنے فن کے ذریعے کر رہا ہوتا ہے اس لیے قوم کو اس کا احسان مند ہونا چاہیے وہ لکھتے ہیں کہ

''میں نے کہا ''بزرگو! وہ فنکار ہے، آرٹسٹ ہے، صداکار ہے۔ اس کے قوم پر بڑے بڑے احسانات ہیں......'' (۱۶۱)

اس لیے قوم کا بھی فرض ہے کہ تاحیات اس کی قدردانی کریں اور اس کی عزت وتکریم میں کوئی کمی نہ چھوڑے۔ جب تک فنکار زندہ رہے باعزت طریقے سے زندگی گزارے اور شان سے جیئے جیسے ہیرو کی شان ہوتی ہے۔

معاشرے کی ایک اور دردناک تصویر ہمیں ''خانگی سیاست'' میں نظر آتی ہے۔ یہ کہانی دو بہنوں کی ہے۔ جو سارا وقت اکٹھا رہتیں، ایک ہی بستر پر سوتیں، لیکن ایک دوسرے کی تعریف برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں میں جب کسی ایک کو بھی تکلیف کا سامنا ہوتا تو دوسری اس کی تکلیف میں اس کی خدمت بھی کرتی لیکن ساتھ ساتھ خوش بھی ہوتی لیکن تعریف پر جل بھی جاتی۔ اشفاق احمد اس نفرت سے پیدا ہونے والی انفرادی اور اجتماعی مسائل کا ذکر بھی کرتے ہیں اور اس کی وجوہات بھی بیان کرتے کہ کیوں یہ بہنیں ایک دوسرے کے لیے نفرت اور حقارت کے احساسات رکھتی تھیں۔ اور وہ کون سی شے تھی جس نے دو اچھے بھلے انسانوں کو کرب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ان کا ایک لمحہ بھی سکون سے نہیں گزرتا تھا۔ دونوں بہنیں ایک دوسرے کی تعریف سے جلتی تھیں اور حسد کی وجہ سے انھیں خود اپنی ذات میں موجود خوبیاں نظر نہیں آتیں۔ ان کی نظر بلکہ اپنی خامیوں پر نظر رہتی ہے۔ مثلاً:

> ''اندر آ کر اس نے اپنی قمیض اتار دی اور پاؤڈر کا ڈبہ لے کر سنورائی ہوئی جلد پر پل پڑی۔ دن رات یہی ایک خیال تھا جو اسے گھن کی طرح کھائے جاتا تھا کہ ''انجمن سفید ہے، گوری ہے، دودھ کی طرح چٹی ہے''۔ کبھی بھی اس کا ذہن اس بات کو نہ سوچ سکا کہ انجمن کی ناک مانو پلی کی سی ہے۔ اس کے کان لمبے لمبے اور ہموار ہیں، چہرے کے مسام سیاہی چوس کی طرح اپنے دہن کھولے رہتے ہیں اور چنیاں سی آنکھیں ہر دم جھپکتی رہتی ہیں۔ سفید تھی تو کیا ہوا، قبر کے سرہانے صلیب بھی تو سفید ہی ہوتی ہے''۔(۱۶۲)

اور یہ ہی رویہ دونوں کے رشتے میں دراڑ پیدا کرتا ہے۔ اور پورا گھر اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''گھر کی فضا پہلے مٹیالی سی ہو گئی اور پھر سیاہ! اُمڈ گھمڈ کر بادل آئے اور تل دھار بارش ہونے لگے''۔(۱۶۳)

اشفاق احمد ایک سچے ادیب کی طرح ان اخلاقی رویوں کو کمزوریوں کے ساتھ ان کے اسباب اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کا ذکر کرتے ہیں کہ تاکہ ان سے پیچھا چھڑا کر مثبت شخصیت کے مالک بن سکیں اور ان اخلاقی برائیوں کو تمام معاشرے سے نکال کر صحت مند معاشرے کے صحت مند شہری بن سکیں، کیونکہ برائی سب سے پہلے خود اپنے اندر جنم لیتی ہے۔ پھر سارے معاشرے کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

اشفاق احمد نے افسانہ ''مسرور مرثیہ'' ہنر مندوں کاریگروں اور محنتی لوگوں کی شان میں لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ موجودہ دور میں اہل ہنر، بے ہنروں کے سامنے کس طرح سے ذلیل وخوار اور رسوا ہوتے ہیں۔ جبکہ ایسا پہلے ہرگز نہیں تھا۔ بلکہ ہنر مندوں کو عزت دی جاتی تھی اور ان کے ہنر کی قدر کی جاتی تھی وہ لکھتے ہیں کہ:

''اصل میں اس زمانے کا یہی دستور تھا کہ انسانوں کے گروہ کو جس چیز کی اشد ضرورت ہوتی اور جس کے بغیر ان کی زندگی کے لالے پڑے ہوتے، اگر وہ چیز کوئی شخص بنا کر یا دریافت کر کے یا اختراع کر کے ان کو فراہم کر دیتا تو وہ اس کو اپنا پیشوا مان کر اسے اپنا بادشاہ بنا لیتے تھے اور زندگی بھر اس کی اطاعت سے سر نہ پھیرتے تھے''۔(۱۶۴)

یعنی بادشاہت اسی شخص کو ملتی جو اس کے قابل ہوتا تھا اور سب اس کو سراہتے تھے اور اس کو خوشی سے قبول کرتے تھے۔ مثلاً:

''اکثر آبادیوں کے بادشاہ جولاہے تھے، بہت سے گروہوں پر پتھر جوڑ کر گھر بنانے والوں کی حکمرانی تھی۔ کچھ لوگ جنھوں نے کھودا کھودی کے پترے اور سوئے بنا کر دکھا دیے تھے ان کو سب نے خوش ہو کر اپنا بادشاہ مان لیا تھا۔(۱۶۵)

درج بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے اشفاق احمد ہنر مندوں اور محنت کشوں کے لیے ایسے ہی اخلاق بلندی اور اعلیٰ ظرفی کا رویہ چاہتے ہیں کہ جو ہاتھ مخلوق خدا کی خدمت کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ جو آنکھیں رات رات بھر جاگ کر قوم کی فلاح کے لیے رات کے اندھیروں کو اجالوں میں ڈھالتی ہیں۔ ان ہاتھوں اور آنکھوں کو اسی طرح محبت اور عزت سے نوازا جانا چاہیے جیسا کہ ان کا حق بنتا ہے اور یہی محنت کرنے والے جب چرب زبانی کا شکار ہوتے ہیں تو ان کو خود اپنے بھی نشان نہیں ملتے جیسے ان محنت کشوں کی بستی میں جب پردیسی ککے کیری آتا ہے تو اس کی عادتیں ان سے قطعی مختلف ہوتی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

''ککا کیرا ایک ایسی آسمانی مخلوق تھا جس کو کچھ بھی کرنا نہیں آتا تھا اور سارے کرنے والوں پر اس کی حکمرانی تھی۔ وہ محنت سے شدید نفرت کرتا تھا اور سارے محنت کرنے والے ایک ایک کر کے اس کی محبت کے تالاب میں ڈوبتے جا رہے تھے''۔(۱۶۶)

اور یہی باتوں کا دھنی آہستہ آہستہ سارے بستی والوں کے دلوں پر راج کرنے لگتا ہے۔ یہاں اشفاق احمد، الرٹ کرتے ہیں کہ باتوں کرنے والوں اور محنت کرنے والوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہوتا اور اگر ان چرب زبانوں اور بھاشن دینے والوں کو اگر اپنی محفلوں میں جگہ دیتے ہو تو کل کو یہ اپنی بری سہل پسند عادتوں کو پھیلا دیں گے اور کئی اور لوگوں کو اپنی باتوں میں لگا کر شر پھیلانے کا موجب بنیں گے کیونکہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے اور اس سے برے منصوبے ہی جنم لیتے ہیں۔ اشفاق احمد بیان کرتے ہیں کہ:

''کا کیرا سفید دودھیا چاندنی میں دونوں ہاتھ پھیلا کر ٹیلے پر مقدس کلر متے کی طرح کھڑا ہو گیا اور اس نے علم کی برتری اور ہاتھ کی کارکردگی، ہنر دستی، کار جسمانی اور صنائع دستی کی بے وقعتی پر بھاشن دینا شروع کر دیا............ جب چاندنی میں کھڑے انسانوں کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ سخن سازیے، گل باتیے، بیان بازیے اور لفظ انڈیلیے دیوتاؤں کی اولاد ہیں اور ہاتھ بدن سے کام کرنے والے ملیچھوں اور راکشسوں کے پھوسڑے ہوتے ہیں تو وہ انقلاب کے نام پر اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے سرکنڈوں کی مشعلیں جلا کر اپنے جولاہے بادشاہ راڑا اور اپنے ڈور بیٹا وزیر دڑوَ کے خلاف بغاوت کر دی''۔(۱۶۷)

اور اس طرح سے ایک گل باتیے، بیان بازیے کی حکومت اس بستی پر ہو گئی اور یوں ہمیشہ کے لیے حکمرانی، بادشاہت بھاشن دینے والوں کے حصے میں ہو گئی اور ہنرمندوں اور محنت کشوں کے حصے میں کچھ بھی نہ آیا، سوائے اس کے کہ ان کا ذکر کتابوں میں، افسانوں میں، شاعری اور تقریروں میں کیا جائے اور ان کی قدر بھی صرف کتابوں کی دنیا تک محدود ہو کر دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وزیر دڑوَ بادشاہ داڑا سے پوچھتا ہے کہ اب دوبارہ ہماری حکومت کب آئے گی تو وہ نفی میں جواب دیتا ہے اور تخصیص بیان کرتا ہے کہ:

''راج پاٹھ بول بھاشن والوں کے لیے ہو گا اور گیت سلامیاں راج مستری کے لیے ہوں گی۔ تخت اور تاج علم والوں کے پاس رہے گا جبکہ شاعری شاباشی ہنرمندوں، محنت کشوں کے لیے ہو گی۔ بادشاہی اور حکمرانی بے ہنر، بے محنت، بے تعلق، بے اعتبار گفتگو بازوں اور پھوکے اپدیشکوں کے پاس رہے گی جبکہ تھاپی تھاپڑا کا سان کاشت کاروں کے لیے ہو گا۔ رائل فیملی ذکراذکار اور باتیں کرنے والوں کی ہو

گی اور پچکار چمکار کی رائلٹی ہنر مندوں کو ملے گی''۔(۱۶۸)

اشفاق احمد اس افسانے کے ذریعے یہی ہوش دلانا چاہتے ہیں کہ محنت کشوں اور اہل ہنر لوگوں کو ہی حکومت میں ہونا چاہیے جو مخلوق خدا کی فلاح کے لیے کچھ کرنا جانتے ہوں نہ کہ وعدوں پر عوام کی زندگی داؤ پر لگانے والے حکمران ہوں اور دوم یہ بات بھی واضح کرتے ہیں کہ اگر ہم اپنے اندر سے کھرے کھوٹے کی پہچان ختم کر لیں گے تو انھیں بھاشنوں کی نذر ہو جائیں گے اور سکے کیرے جیسے افراد ہمارے درمیان آتے رہیں ہیں جو محنت سے سخت نفرت کرتے ہیں اور وہ یہ بیج ہمارے اندر بھی بو دیتے ہیں کہ ہم اپنے محسنوں کو بھول کر انہی چرب زبانوں کو تخت و تاج عطا کر دیتے ہیں۔ اس لیے ایسے افراد کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے اپنے اندر اخلاقی مضبوطی لا کر، احسن طریقے سے منفی شعاعوں کو مثبت میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتے ہوں۔ اشفاق احمد عام لوگوں کی فلاح کی بات کرتے ہوئے نہایت حقیقت پسندی سے باتوں میں باتوں میں وضاحت کر دیتے ہیں کہ محنت کش اور اہل ہنر آج کہاں پر کھڑے ہیں۔ اور بول بچن والوں کو شہنشاہت اور بادشاہت دے دی جاتی ہیں اور دینے والے بھی ہم خود ہی ہیں۔

اشفاق احمد نے افسانے ''شازیہ کی رخصتی'' میں اپنے سمیت بہت سے ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جن میں پاکستان، بھارت اور بنگال کے نامور ادیب اور شاعر شامل ہیں۔ کشمیر کی وادی سے شازیہ جو ریپ ہو چکی ہے۔ ریپ ہونے سے پہلے اور بعد میں ان کے پاس جاتی ہے۔ لیکن کوئی بھی کشمیریوں کے حق کے لیے آواز بلند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ سب سے پہلے مصنف اسے بھارت کے ادیبوں کے پاس جانے کا مشورہ دیتے ہیں اور اپنی جان چھڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ

> ''دیکھو بی بی! اگر تم اپنا کشمیر آزاد کرانا چاہتی ہو تو بھارت کے ادیبوں اور دانشوروں سے بات کرو، ان کے ضمیر کو جگاؤ اور ان کی اخلاقی اقدار کو جھنجھوڑو شاید ان میں کوئی رائٹر تم کو ایسا مل جائے جو تمہارا ساتھ دے''۔(۱۶۹)

اور شازیہ کو افسانہ نگار رام لال کے پاس جانے کا مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ایک نرم دل، انسان دوست بہت ہی ہمدرد اور پیارا دوست ہے وہ ضرور تمہاری سنے گا تو شازیہ جواب میں کہتی ہے کہ وہ ان کی کہانیاں پڑھ کر ان سے ملنے کے لیے گئی تھی لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''شازیہ نے کہا''میں نے ان کی انسان دوستی اور فضائل آزادی کی کہانیوں کا حوالہ دے کر ان کی منت کی کہ وہ صرف قلم سے ہمارا ساتھ دیں اور اپنی حکومت کو اس کا وعدہ یاد دلائیں لیکن وہ مانے نہیں اور کہنے لگے۔

............بی بی میں ان جھگڑوں میں پڑتا میری لائن انسان دوستی ہے۔سیاست نہیں''۔(۱۷۰)

اسی طرح گوپی چند نارنگ سے بھی شازیہ دومرتبہ ملتی ہے۔کیونکہ نہ صرف سرکار بلکہ ہر طبقے کے لوگ ان کو بلند مقام دیتے ہیں۔ بلکہ ایک ملاقات کے بعد تو شازیہ دوسری مرتبہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی رہی۔انھوں نے شازیہ کی منت سماجت کا جواب کچھ اس طرح سے دیا کہ:

''شازیہ میں اس معاملے میں تمہاری، تمہارے گھر والوں کی یا تمہارے کشمیر کی کچھ مدد نہیں کرسکتا۔ یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔ میں گرائمر''عروض اور ساختیات کا سٹوڈنٹ ہوں۔اس سلسلے میں اگر تم کچھ پوچھنا چاہو تو میں حاضر ہوں۔اس کے علاوہ اور کسی بات کو میں نہیں مانتا......''(۱۷۱)

اسی طرح جب بنگال کے دانشوروں اور سماج سیوک لوگوں سے شازیہ ملی تو انھوں نے بھی اس کو کچھ اس طرح سے ہی جواب دیا......اشفاق احمد کچھ اس طرح اس کو بیان کرتے ہیں کہ

''شازیہ نے کہا''ہم شام بنیے گل سے بھی ملے تھے، میں اور عمران......اور سیتہ جیت رے سے بھی۔ لیکن انھوں نے بھی معذرت کر لی کہ چونکہ وہ نادرن انڈیا کے معاملات کو اچھی طرح سے نہیں سمجھتے اس لیے معذور ہیں۔ وہ بنگال کی حد تک لوگوں کے دکھ درد اور ان کی درگھٹنا سے واقف ہیں، اس سے باہر کچھ نہیں جانتے''۔(۱۷۲)

ایک ادیب یا فنکار قید و بند سے آزاد ہوتا ہے۔اسے بانٹا نہیں جا سکتا ہے یا اگر کوئی سماج سیوک ہے یا عوام کی بھلائی یا فلاح کے لیے کام کرتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ محدود پیمانے پر یا نپے تلے انداز سے محبت اور خدمت کو بانٹے۔کچھ لوگوں کا درد محسوس کریں اور کچھ کا نہ کریں۔اسی طرح کا جواب گلزاری بھی دیتا ہے۔اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ

''انھوں نے کہا، ہم تمہارے کشمیر میں آ کر فلم کی شوٹنگ تو کر سکتے ہیں۔اس شوٹنگ سے تم کو مالی فائدہ تو پہنچا سکتے ہیں لیکن تمہاری آزادی کے لیے کچھ نہیں کر سکتے کہ یہ ہماری پالیسی نہیں ہے، ہم جمہوریت پسند

لوگ ہیں اور کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتے''۔(۱۷۳)

اور یوں شازیہ کو سبھی نامور ادیب، دانشور، شاعر لوگ انکار کر دیتے ہیں کہ وہ آزادی کے علاوہ ہر معاملے میں اس کی مدد کر سکتے ہیں لیکن اس کے حق کے لیے آواز نہیں بلند کر سکتے۔ وہ روٹی، کمبل، دوائیاں دے سکتے ہیں۔ عروض اور گرائمر کی غلطیاں درست کر سکتے ہیں۔ وہ مالی فائدہ پہنچا سکتے ہیں لیکن وہ ایک نظم ایک افسانہ، ایک مضمون، ایک آواز شازیہ کے لیے اور اس جیسے کئی انسانوں کے لیے بلند نہیں کر سکتے ہیں۔ مصنف خود بھی اپنے طرف سے جواز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

> ''میں نے کہا ''تمہارے لیے میں ہر طرح سے حاضر ہوں تم کو دوائیاں اور کمبل بھجوا سکتا ہوں۔ بے گھروں اور لاوارثوں کے لیے ٹینٹ اور پلاسٹک کے Containers......''
>
> شازیہ نے کہا ''ہمیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں آپ کے تحریری آشیرواد کی ضرورت ہے''۔(۱۷۴)

کیونکہ شازیہ کو ایک سچے افسانے اور ایک اچھے ڈرامے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ مصنف اس افسانے کے ذریعے ادیبوں اور دانشوروں کی روح اور ضمیر کو جگانا چاہتے ہیں۔ اشفاق احمد خود تو مصلح قوم کے انداز میں یہ فریضہ ادا کرتے ہیں لیکن دوسروں کو بھی ابھارتے ہیں کہ چاہے میری بات کا برا مان کر ہی سہی کوئی آئے تو سہی اپنے حصے کی شمع جلانے کو، یہی ایک ادیب کا اخلاقی فرض ہے۔ کیونکہ یہ تبدیلی کسی ایک شخص کے آواز بلند کرنے سے نہیں آئے گی بلکہ اس کے لیے تمام لوگوں کو اپنی اپنی سطح پر اس کے لیے کوشش کرنی ہوگی اور اشفاق احمد یہ ذمہ داری ادیبوں کے کندھوں پر ڈالتے ہیں اور اس میں ان کا ادیب برادری پر اعتماد بھی نظر آتا ہے کہ پروفیسر ادیب، دانشور، شاعر ہی یہ تبدیلی لا سکتے ہیں۔

اسی معاشرتی زوال کے اسباب پر بات کرتے ہوئے اشفاق احمد نے اپنے ''بے غیرت مدت خان'' میں کمال جرأت، باریک بینی اور دور اندیشی سے انھوں نے مسلمانوں کی تنزلی، اس کے اسباب اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا بیان کیا ہے۔ مسلمانوں کے زوال کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''تم کو معلوم نہیں اے باجا بیگم! اور اس راز کو میرے جیسی گہرائی سے اور کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اسباب زوال امت بس ایک ہے اور وہ ہے علم سے دوری، علم سے بیگانگی، علم سے نفرت۔ جس قوم نے علم سے محبت کرنا چھوڑا باجا بیگم...... وہ غرق ہو گیا، تباہ ہو گیا۔ اس کا پھرڑ کا بھی نہ رہا اس دنیا میں۔ مسلمانوں کی تباہی کا راز ہی اس حقیقت میں چھپا ہوا ہے کہ مسلمان نے شروع دن سے علم سے محبت نہیں کیا اور

اس کو غیر ضروری سمجھا اور اس کو حاصل کرنے کے واسطے کوئی کوشش نہیں کی۔ نہ آج نہ کل نہ ہی آگے اس کے واسطے کوئی کوشش کا خیال ہے۔ اور یہ ہمارے پاکستان میں ہی نہیں باجا بیگم، کل مسلمان ملکوں میں اس کا یہی حال ہے۔ علم کا داخلہ ہر جگہ بند ہے۔ علم کے اوپر ہر مسلمان گھر میں ٹیکس لگا ہوا ہے''۔(۱۷۵)

درج بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا بھر میں مسلمان قوم کوئی رسوا ہے اور ذلالت کے مراحل طے کر رہی ہے اور مستقبل قریب میں بھی اس کی بحالی کے امکانات نظر نہیں آتے کیونکہ اسے نہ صرف علم سے نفرت ہے بلکہ اس کے حصول کی بھی کوئی کاوش دور دور تک نظر نہیں آتی بلکہ جہاں تک ممکن ہو اس سے دور رہنے کے لیے کوشش ہوتی رہتی ہے اور یہی مسلمان روپے پیسے کے حصول کے لیے اپنی جان بھی دینے سے دریغ نہیں کرتے علم سے محبت نہیں لیکن روپے پیسے کا لالچ ان کی طبیعت میں خون کی طرح رچ بس گیا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''مشرقی ممالک میں چونکہ تعلیم عام نہیں اور علم سے محبت نہیں اس لیے برق انداز اس مرتبہ بھی اس عشق کو ادھورا چھوڑ آئے گا۔ ہم نے روپے کا لالچ بڑھا دیا ہے اور معرکہ مارنے کی فیس دوگنی کر دی ہے۔ امید ہے کہ اب وہ روپے کے لالچ میں آ کر ضرور ہمارا ساتھ دیں گے''۔(۱۷۶)

اس لیے غیر اقوام ان عادتوں کو ہماری کمزوری بنا کر استعمال کرتی ہیں، اور یہی ہماری شہرت ہے وہ مزید اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جب مشن پورا ہو جائے گا تو وہ یقیناً سودے بازی کرے گا مشرق کے لوگ علم کے شائق نہیں، سودے بازی کے رسیا ہیں۔ پچاس روپے کے عوض اپنی قیمتی متاع فروخت کر دیتے ہیں''۔(۱۷۷)

اسی لیے دنیا کے بازار میں ہماری بولی لگائی جاتی ہے کیونکہ ہم بکتے ہیں۔ ہمارا ایمان اور عقیدہ روپے پیسے سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد نے بہت ہی باریک بینی سے پاکستان، اس کی عوام اور اس کی حکومت کی کارگزاریوں کا نقشہ کھینچا ہے اور اس میں اس قدر صفائی اور وضاحت ہے کہ ابہام کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ ہمارے ملک میں دشمن کچھ بھی کر جائے ہم بے خبر اور بے نیاز ہی رہتے ہیں چاہے ہمارا ملک تباہ ہو جائے، قوم کا سرمایہ خاک میں مل جائے ہم پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اسی حالت کو اشفاق احمد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''پاکستان اور پاکستان کے لوگ اور پاکستانی حکومت ہماری کارروائیوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ ہم کو

گھومنے پھرنے، یاری دوستی لگانے اور کارروائیاں کرنے کی پوری پوری آزادی ہے''۔(۱۷۸)

درج بالا اقتباس دراصل ایک آئینہ ہے جس میں یہ عکس صاف عیاں ہے کہ ہم اپنے ماحول سے کس قدر بے خبر رہتے ہیں۔ اور یہ ایک الرٹ بھی ہے کہ ہمیں اس طرح سے نہیں رہنا چاہیئے۔ پاکستان کے زیادہ تر لوگوں کی اپنی کوئی رائے، پسند یا ناپسند نہیں ہے۔ بنی بنائی باتوں پر عمل کرنا ان کی عادت ہے۔ ہر کسی کو صرف ایک ہی دلچسپی ہے کہ وہ اپنا پیٹ کیسے بھرے، اور اگر اس کا پیٹ بھر جائے تو نظر نہیں بھرتی اور وہ کل، پرسوں بلکہ آئندہ کئی ایام کے لیے ذخیرہ اندوزی کرنے پر مجبور ہوتا ہے کیونکہ پاکستان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ عوام کی کمی ہے۔ اور جو طبقہ تعلیم یافتہ ہے اس کی حالت بیان کرتے ہوئے اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ

''پاکستان کا اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ طبقہ جو مشکل سے دو یا سوا دو یا حد ڈھائی فیصد تک ہے، بالکل ہماری طرح کی سوچ رکھتا ہے اور ہماری طرز زندگی کو اپنائے ہوئے ہے۔ یہی اس ملک کا رائے گر طبقہ ہے اور اسی کی یہاں پر حکمرانی ہے اور یہی طبقہ Trend Sctter ہے اور ہر جگہ اس کا سکہ چلتا ہے گویا اس عہد کی ایسٹ انڈیا کمپنی یہی ہے۔ باقی سارے لوگ عہد مغلیہ کے آخری شہزادے ہیں۔ ذہنی طور پر بودے، جسمانی طور پر تودے اور ہر ایک کے لیے بکاؤ سوذ''۔(۱۷۹)

درج بالا اقتباس ایک غیر ملکی کی رپورٹ کا حصہ ہے جس میں وہ اپنے مشن کے تکمیل کی رپورٹ دے رہا ہے اور یہ بات صاف بتا رہا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہماری طرح، ہمارے طرز زندگی کو اپنائے ہوئے ہے اور وہ ہمارے راستے میں کسی طرح رکاوٹ نہیں بنتا ہے۔ جب باجا بیگم اپنے شوہر سے پوچھتی ہے کہ گوروں کو ان کتابوں، مسودوں اور مخطوطوں سے کیا ملتا ہے تو جلال خان اسے جواب میں کہتا ہے کہ گورا علم کا قدردان ہے اور یہ علم وہ اپنی عزت کو چار چاند لگانے کے لیے لے کر جاتا ہے اور اس کے لیے وہ کوئی بھی قدر اٹھانے سے دریغ نہیں کرتا۔ اشفاق احمد یوں بیان کرتے ہیں کہ

''ان میں علم ہوتا ہے......علم......تاریخی علم، زمینی علم، آسمانی علم! لاکھوں کروڑوں ڈالر کا ہوتا ہے ایک ایک مسودہ، لاکھوں پاؤنڈوں کا ہم لوگ ان کی قدر نہیں جانتے۔ گورا جانتا ہے، گورا۔ ان کو علم سے محبت ہے۔ علم کی قدر شناسی ہے۔ وہ ایک کتاب کے بدلے پورے ملک کو تباہ کر سکتا ہے۔ پوری بستی کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔ وہ قدردان اے......قدر شناس اے''......۔(۱۸۰)

اور یہی علم حاصل کر کے وہ قوموں پر برتری حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ جس پلڑے سے علم جاتا ہے وہ ہلکا اور جس میں جاتا ہے وہ بھاری ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ ہماری کتابوں میں کوئی لعل جڑے ہیں، کوئی خزانہ چھپا ہے اس لیے گورا یہ سب کرتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ ہماری نسلیں تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ گورے علم کے ذریعے خود کو طاقت ور بنا کر دوسری اقوام پر حکومت کرتے ہیں۔ ذہنی سطح پر ان کو مغلوب کر کے انھیں اپنی نظر میں ہی بے معنی کر دیتا ہے۔ وہ یوں لڑائیاں لڑتا ہے۔ قوت سے نہیں بلکہ ذہانت سے۔ اشفاق احمد گورے کی اس چال کو یوں بے نقاب کرتے ہیں کہ:

''گورا اب لڑ نہیں سکتا باچا بیگم! اس میں اب پہلے والی قوت اور طاقت باقی نہیں رہی ہے۔ اب وہ ساری دنیا کی بے گوری قوموں کو ذلیل و خوار کر کے اور شرمندہ کر کے اور ان کو علم سے بے بہرہ قرار دے کر ہی حکمرانی کر سکتا ہے ان کو احساس کمتری میں مبتلا کر کے ہی ان کے جسموں اور روحوں پر قبضہ قائم رکھ سکتا ہے''۔ (۱۸۱)

اسی لیے گورا ہر صورت علم کے ان خزینوں کو اپنے ملک میں لے کر جانا چاہتا ہے کیونکہ وہ ان کی اہمیت سے واقف ہے۔ اس لیے اس سے محبت بھی کرتا ہے اور عزت بھی اشفاق احمد مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''لیکن علم سے محبت صرف گورے کو ہے۔ اس وقت چودہ ملکوں کے بائیس گماشتے افغانستان کے اندر اور باہر گھوم کر قیمتی مسودے اور مخطوطے اپنے اپنے ملک لے جا رہے ہیں اور ایک ایک مسودے کی خاطر چاہے انھیں سو سو لوگوں کو بھی ختم کرنا پڑے، وہ گریز نہیں کرتے۔ وہ مرد لوگ ہیں باچا بیگم! علم دوست لوگ ہیں''۔ (۱۸۲)

تبھی تو گورے کا شمار ترقی یافتہ اقوام میں ہوتا ہے اور آج وہ سب پر حکمران ہے۔ اشفاق احمد حقیقت کی ان سچی تصویروں کو پیش کر کے علم دوستی کا بیج قارئین کے دل میں بونا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ افسانے کے آخر میں وہ علم سے روشنی نہ رکھنے والے شخص اپنے اکلوتے بیٹے کو بے غیرت کہہ دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''بابا جلال خان نے کھلے دروازے میں سے اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھا جس کے پاس سوائے محبت، مشقت، جواں مردی، مسکراہٹ اور غریب پروری کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے بغیر آواز نکالے اپنے جبڑے بھینچ کر دل ہی دل میں کہا ''اوے بدبختا! تیرے پاس کلاشنکوف ہے۔ کیا تو بھی گورے کی طرح

کوئی مسودہ مخطوطہ اٹھا کر نہیں لا سکتا؟ لیکن تو علم سے محبت نہیں کرتا ناں بے غیرتا، اس لیے بدنصیب ہے'' جب اس نے دل ہی دل میں اپنے بیٹے کو بے غیرت کیا تو بابا جلال خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے انھیں چھپانے کی غرض سے منہ اوپر اٹھا کر اونچی آواز میں کہا ''ڈرائنگ روم میں سفیدی ہونی چاہیے باچا بیگم! سارا چھت سے پپڑی اتر گیا ہے''۔ (۱۸۳)

کیونکہ ایٹل برک نے دو مسودے لینے کے لیے تین جانیں خرچ کی تھیں اور یہی گورے کی عادت بھی ہے جیسا کہ بیان بھی کیا گیا ہے کہ وہ علم کے حصول کے لیے جان لینے اور دینے سے دریغ نہیں کرتا جب ایٹل برک نے جلال خان کو آ کر بتایا کہ اس نے دو مسودے حاصل کر لیے اور اس میں بہت روپیہ خرچ ہو گیا اور تین جانیں بھی گئیں تو جلال خان نے جواب میں کہا کہ:

''خیر اے یارا، علم حاصل کرنے میں اگر زندگی بھی خرچ گیا''۔ (۱۸۴)

اس افسانے کے ذریعے اشفاق احمد نے اس Trend Setter طبقے کی بھی کھچائی کی ہے کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی بننے کے بجائے قوم کی بحالی کا سبب بنیں اور علم دوستی کی ترغیب دے اور علم دوست لوگ غیر کی تہذیب اپنانے کے بجائے اپنی تہذیبی ورثے اور اخلاقی اقدار کی بحالی کے لیے کوشش کرے۔ انھیں چاہیے کہ وہ علم کو عام کریں۔ علم سے محبت کے جذبات پھیلائے۔ علم کی شمع جلائیں۔ اور اس کی روشنی ہر گھر میں اتارنے کی کوشش کریں۔ لالچ، بغض، ریاکاری، سودے بازی جیسے لیبل اپنی قوم سے اتارنے کے لیے میدان عمل میں کود پڑیں اور اپنی صلاحیتوں سے ان داغوں کو اتار پھینکیں۔ اپنے علمی ورثے کی حفاظت چابکدستی اور ہوشیاری سے کریں تا کہ آنے والی نسلوں کا اپنے بڑوں سے رشتہ برقرار رہ سکے اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ عزت اور محبت سے زندگی بسر کریں اور نسل در نسل اسے منتقل کریں۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانے ''بندر لوگ'' میں دراصل بندروں کی نہیں بلکہ انسانوں کی خصلتوں کو اور مختلف طبقات اور پیشوں کے حساب سے ان کی اخلاقی حالت کو بیان کیا ہے کہ عالمی سیاست دان کس طرح ایک دوسرے پر غراتے رہتے ہیں اور بھبھکیاں دے کر اپنی طاقت کا اظہار کر کے دوسروں کو اپنے دباؤ میں لانا چاہتے ہیں تا کہ باقی لوگ ان سے ڈر کر رہیں اسی طرح مقامی سیاست دان، فلاح اور بھلائی کے کام کرنے کی نسبت تمام وقت دوسروں کو نیچا دکھانے میں گزار دیتے ہیں۔ بیوروکریٹ اپنے مرتبے اور عہدے کی طاقت کا اظہار دوسروں کے کام میں رکاوٹ ڈال کر کرتے ہیں۔ کلرکوں یا کمزور

عہدوں پر بیٹھے غریب طبقے کا زیادہ وقت مالکوں اور افسروں کو خوش کرنے میں گزر جاتا ہے۔ امیر کو امیر بنانے میں کئی ہاتھ مدد کر رہے ہوتے ہیں اس میں غریب اور پسماندہ طبقے کا بھی ہاتھ شامل ہوتا ہے اور غریب کے پاس سے رہا سہا مال و متاع بھی چھین لیا جاتا ہے۔ انسان اور جانور جاتی میں فرق صرف اتنا ہی باقی ہے کہ ہم عموماً چلتے ہیں اور جانور کبھی کبھی ایسا کرتے ہیں۔ گویا انسان کی یہ خصلت جانور اپنا لیتا ہے لیکن انسان جس وجہ سے انسان کہلاتا ہے وہ فراموش کر چکا ہے۔

اشفاق احمد جنسی حوالے سے نر بندر اور مادہ بندر کی نفسیات کو بیان کرتے ہیں ان کے اختلاط کے مختلف شیڈز، جن کو پڑھ کر یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ بندریا کے بارے میں لکھا گیا ہے یا یہ نظارے ہمارے اردگرد کے ہیں اور ہم بندروں کے کسی گروہ کے رکن ہیں یا انسان ہیں۔ بندریا کی جنسی رعنائیاں ان کا استعمال اور نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''میرے علاقے کے اس گروہ کی بندریاں اپنی جنسی رعنائی کو نر بندروں کی جنسی آسودگی کے لیے بھی استعمال میں لاتی تھیں اور اپنی ترغیب جنسی یا سکیس اپیل سے دوسرے کام بھی نکلواتی تھیں۔ بہار پر آئی ہوئی ایک بندریا نر بندروں میں بڑی مقبول ہوتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ اٹھکھیلیاں بھی کرتی تھی، جفتی بھی کرتی تھی اور ان سے اپنے بدن کی ''جوئیں'' بھی نکلواتی تھی۔ ان دنوں اس کا سوشل سٹیٹس بہت بڑھ جاتا تھا۔ وہ ہر دوسری بندریا کو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ اس کے دو ہتڑ مارتی، پر چنڈوں سے ان کی تھوتھنیاں نوچتی اور اگر وہ گروہ کے بڑے بڈھے باندر یعنی لیڈر کے ساتھ ہم صحبتی کرتی تو پھر جوان اور لونڈے قسم کے نر بندروں کو سزا بھی دلواتی''۔ (۱۸۵)

درج بالا پیراگراف اشفاق احمد کی باریک بینی پر دال ہے کہ وہ بحیثیت انسان بے حد گہرائی سے اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیتے ہیں۔ اور اخلاق سے گرے ہوئے خصائل کا شمار کس گروہ میں کرتے ہیں گویا جب انسان میں یہ خصائل موجود ہوں تو وہ جانوروں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور یہ رویہ اور اخلاقی بدحالی ہمارے اردگرد عام نظر آتی ہے۔ کہ کس طرح عورت نے جنس کا بازار گرم کر رکھا ہے چاہے اس کی سطح کوئی بھی ہو۔ یہ کام کی نوعیت اور نر کی ڈیمانڈ پر ہے کہ وہ اسے کس طرح سے اور کتنا استعمال کرتا ہے۔ اشفاق احمد کا کام حقائق سے پردہ اٹھانا ہے جو نہایت حقیقت پسندی سے انھوں نے بے نقاب کر دیا اب قارئین، نقادوں اور محققین پر منحصر ہے کہ وہ انھیں معاشرے کی بہتری کے لیے کیسے استعمال میں لاتے

ہیں، کیونکہ کسی بھی بیماری کے علاج کے لیے سب سے پہلے اس بیماری کی تشخیص ہونا ضروری ہے۔ سو وہ اشفاق احمد نے کر دی ہے۔ نر بندر کے بھی کردار کے مختلف پہلو اشفاق احمد سامنے لے کر آئے ہیں جو کمزور اور کم ہمت لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے کہ قاہروں اب تو جاگ جاؤ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں نے دیکھا صرف مادہ ہی ایسا نہیں کرتی بلکہ کمزور نر بھی اپنی جان بچانے کو اور حملہ آور سے مخلصی پانے کو اپنا پیچھا اٹھا کر اس کے سامنے پیش کر دیتے اور اپنی جان بچاتے ہیں''۔(۱۸۶)

ملکی اور قومی سطح پر خود کو مضبوط، آزاد اور خود مختار مملکت ثابت کرنے اور اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ زندگی گزارنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ ہم کھرے کھوٹے میں امتیاز کرنا جانیں، دشمن کی چالوں کو سمجھیں اور اس سے نمٹنے کے لیے تدبر سے کام لیں۔ نہ کہ ظالم کی سرپرستی میں چلتے چلے جائیں۔ کیونکہ اگر ہم محافظ اور لٹیرے کا فرق نہیں سمجھیں گے تو نہ جانے کتنے ٹکڑوں میں بٹیں گے اور کتنی بار ذلالت کے مراحل سے گزریں گے۔ اشفاق احمد یہی قومی، ملی اور انسانی شعور بیدار کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں اس میں تلخ ہونے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ شاید کڑوی دوائی سے ہی آرام آ جائے اور صورت حال بہتر ہو جائے۔

اشفاق احمد اپنے افسانے ''ڈھور ڈنگر کی واپسی'' میں ان مسائل کا حل بیان کرتے ہیں کہ انسان کی ساری طاقت، دم خم صرف اس باری تعالیٰ کی اطاعت میں ہے اور اس کے وجود سے انکاری لوگ ہمیشہ غیر محظوظ اور ڈرے ہوئے ہوتے ہیں چاہے وہ بظاہر کتنے ہی دلیر نظر آتیں اور یہی بات ہمیں نائیلہ میں بھی نظر آتی ہے۔ ربِ حقیقی کی طرف واپسی کے در کھلتے رہتے ہیں اور اس کی ذات کا عرفان ان لوگوں کو بہرصورت حاصل ہوتا ہے جو پاک نفس کے مالک ہوتے ہیں جیسا کہ اشفاق احمد نائیلہ کے تمام ماڈرنزم کے باوجود جب اس کی شخصیت اور کردار کی بات کرتے ہیں تو یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''نائلہ اس قدر پاک صاف، دھلی دھلائی، پاک بدن اور پاک نفس لڑکی تھی کہ اس کو کسی سے محبت تھی اور نہ وہ کسی اور کی محبت کی طلب گار تھی''۔(۱۸۷)

یعنی نائیلہ اپنی ذات میں ایک مکمل لڑکی تھی۔ وہ بے باکی سے ایسی بات کہہ جاتی جس کو کہنے کے لیے دوسرے افراد کو صدیوں ہمت نہ ہوتی تھی خوف اور تعصب اس میں ذرا برابر نہ تھا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''اپنے گھر والوں کے مقابل اپنے گھرانے کے مخالفوں کو اچھا سمجھتی تھی آزاد خیال تھی اور اپنی آزاد خیالی

کے اظہار کے لیے اسے بہ امر مجبوری اپنے اور اپنے پن کے خلاف جھکنا پڑتا تھا۔ زیادہ نہیں جھکتی تھی اور بار بار نہیں جھکتی تھی، بس جھکی ہی رہتی تھی''۔(۱۸۸)

اور یہی جھکاؤ اور عاجزی شاید اس خالق کو جس کے وجود سے منکر تھی اس کو اس قدر بھاتی کہ نائیلہ کا وجود اندر، باہر دونوں طرف سے بدل جاتا ہے۔ جب سندر کی بچھیا اور تائی خورشید کے لیلے کی واپسی کا منظر دیکھتی ہے تو یہی لمحات اس کی دنیا بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ اور وہ راستہ تلاش کرتی ہے کہ کس طرح اس ذات الٰہی کا عرفان حاصل کرے، اس کی قربت کو محسوس کرے اور جلد از جلد اس تک پہنچے۔ اس کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''نائیلہ نے سوچا۔ کیا میں سلیمان سے جا کر یہ نہ کہوں کہ میں بھی تائی خورشید کا بھٹکا ہوا لیلا ہوں اور مجھے بھی اپنے باڑے تک پہنچنا ہے اور مجھ سے بھی میرا راستہ گم ہو گیا ہے۔ کیا تم مجھے سندر کی بچھیا بن کر بغیر سینگ مارے باڑے تک پہنچا دو گے۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ سلیمان ایسا نہیں کر سکے گا''۔(۱۸۹)

اور جب کوئی راستہ سجائی نہیں دیتا تو نائیلہ براہ راست اللہ سے مخاطب ہوتی ہے۔ اس کے در پر جھک جاتی ہے اور راہنمائی طلب کرتی ہے اور یوں جز اپنے کل کی جانب لوٹتا ہے۔ اور جانوریت سے انسانیت کے دائرے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''پھر وہ حویلی کی لپی ہوئی چھت پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور منہ اوپر اٹھا کر بولی ''میں تو جوتھی سوتھی، تو نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اس میں کتنی رکاتیں ہوتی ہیں اور کس میں کیا پڑھتے ہیں...... پر اب میں نے بھی تیرا پیچھا نہیں چھوڑنا''۔(۱۹۰)

اور یوں نائیلہ اپنے باڑے تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اس راستے پر قدم رکھ دیتی ہے جہاں سے ذات الٰہی کی حقیقت کی جانب سفر شروع ہوتا ہے۔ ڈھور ڈنگر کی واپسی نائیلہ کی واپسی ہے۔ نائیلہ کی واپسی انسان کی واپسی ہے۔ جس نے خود کو خواہ مخواہ کے مباحث میں الجھا رکھا ہے۔ اشفاق احمد اس افسانے میں قارئین کی توجہ اس جانب بھی دلاتے ہیں کہ انسان اپنے وجود سے منکر ہو سکتا ہے لیکن اس ذات الٰہی کے وجود سے منکر نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی ذات کا ادراک خود بخشتا ہے۔ اس کی پہچان کی طرف انسان لوٹتا ہے اور یہی انسان کا منصب بھی ہے۔ انسان کا اپنے حقوق کے لیے لڑنا اور دوسروں کو اس کا احساس دلانا لازمی ہے۔ جیسا کہ نائیلہ نے کہا اور یہ سب کرنے کے پیچھے اس کا ایک مقصد تھا۔ جو اشفاق احمد یوں بیان

کرتے ہیں کہ:

''دراصل وہ گاؤں کی عورتوں کے ذہن سے صدیوں پرانی گھٹن دور کر کے انھیں پاک صاف کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان کے ذہن میں وہ جالے دور کرنا چاہتی تھی جو فیوڈل نظام اور ملا کے کلام نے متفقہ سازش کے ذریعے ان کے ذہنوں میں تانے تھے''۔(۱۹۱)

یعنی ایسا معاشرہ جس میں فرد کی اپنی سوچ ہو اور وہ اپنے فکر و تدبر میں آزاد ہو۔ نہ کہ ساری زندگی تڑپ تڑپ کر زندگی گزار دے اور الجھی ہوئی ڈور کے تاگوں میں لپٹا رہے یہاں تک کہ گھٹ گھٹ کر دم توڑ دے۔ اشفاق احمد ایک ایسے اخلاقی رویے کی بارآوری چاہتے ہیں۔ جس میں صحت مند سوچ آزادانہ طور پر پنپ سکے۔

اشفاق احمد اپنے افسانے ''رازداں'' میں اندھے اعتماد سے اجتناب کا درس اور ہر رشتے میں آنکھیں کھول کر رکھنے کے لیے کہتے ہیں اور مردوں کو اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ بروقت رشتوں کا، احساس کا دیا ہے چیزوں کا جائزہ لے کر حق دار کو اس کا حق دیں۔ اور اپنی زندگی میں خواہ مخواہ کسی کو بھی جگہ نہ دیں۔ نہ کسی پر اعتبار کریں۔ نہ ہی اپنی زندگی سے جڑے لوگوں کی ضروریات اور جذبات و احساسات کو نظر انداز کریں۔ ہر رشتے کو اپنے طور پر نبھائیں نہ کہ کسی کی باتوں میں آ کر اپنے عزیزوں کو کھو دیں، معاشرتی اخلاقی اصطلاح اس افسانے کا بنیادی مقصد ہے۔ اور اشفاق احمد اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

اشفاق احمد نے ''پل صراط اور پاسپورٹ'' میں بتایا ہے کہ انسان کو زندگی گزارنے کے لیے جس شے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ ایمان ہے جس کی مدد سے انسان دین و دنیا میں سرخرو ہو سکتا ہے اس افسانے میں چوری ہونے کی انوکھی واردات کی بات کرتے ہیں، صدیق کا ایمان چوری ہو جاتا ہے جب اس کی نوکری کا پہلا دن ہوتا ہے اور وہ دفتر سے واپس آ رہا ہوتا ہے اور نوکری کے پہلے دن ہی صدیق ہمیشہ کے لیے اپنا ایمان کھو دیتا ہے اور پھر باہر کے ملک چلا جاتا ہے۔ لوٹتا ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ اس نے یہیں پر آج سے تیس برس پہلے اپنا ایمان کھو دیا تھا۔ خاص طور پر جب زبیر خان اپنے ایمان کی بات کرتا ہے تو صدیق کی روح جھنجھا جاتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''زبیر خان نے پورے یقین کے ساتھ کہا ''جاتے ہوئے اور تو کسی چیز نے ساتھ جانا نہیں، بس ایک ایمان ہی ہوگا وہ بھی اگر ہوا تو! اسی ایمان نے بابے بڈھے کی انگلی پکڑ کر پل صراط سے گزارنا ہے، لیکن

اگر ساتھ ہوا تو!'' (۱۹۲)

یہ سن کر صدیق کا پسینے میں نہا جانا اور اندر کسی چیز کا ٹوٹ جانا اس بات کا غماز ہے کہ ایمان کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور کس قدر خوفناک ہے۔ صدیق صبح اٹھ کر جب تھانے کی جگہ مسجد دیکھتا ہے تو مولوی صاحب سے ملنے اندر جاتا ہے اور اپنی حالت بتاتا ہے کہ:

''آج سے تیس برس پہلے اسی جگہ پر، چوک قرطبہ سے ذرا پرے، کسی نے میری جیب کاٹ کر میرا ایمان چرا لیا تھا اور اس وقت سے اب تک میں ایسے ہی زندگی گزار رہا ہوں خالی خالی، بہکی بہکی، اجڑی اجڑی۔ میرے اندر کا اور میرے اردگرد کا خلا بڑھتا جا رہا ہے اور اب میں زیادہ ہی پریشان رہنے لگا ہوں''۔ (۱۹۳)

یہ حالت اس شخص کی ہے جس کے پاس دنیا کی ہر آسائش ہے لیکن ایمان نہیں ہے۔ ایمان کے بغیر زندگی خشک جھاڑیوں سے بھی زیادہ ویران اور اجڑی ہوئی رہتی ہے۔ اشفاق احمد قارئین پر یہی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے اردگرد کی دنیا میں 'ایمان' یا تو صندوقوں میں بند ہے یا بینک کے لاکروں میں جبکہ زندگی کے ہر قدم کے ہر سانس پر اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ وقتی خواہشات کی تکمیل اور عارضی زندگی کی آسائشوں کے لیے ہم اسے گنوا تو بیٹھتے ہیں لیکن پھر خود کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتے ہیں اور پھر بعض اوقات ہمیں کوئی راہنما بھی نہیں ملتا جو اس دلدل سے نکال سکے مثلاً صدیق جب مولوی صاحب سے اپنے دل کا حال بیان کرتا ہے تو وہ جواب میں یوں کہتے بقول اشفاق احمد:

''مولوی صاحب نے تشفی آمیز لہجے میں پوچھا'' آپ کے پاس شناختی کارڈ ہے؟''

''جی ہے! صدیق نے وثوق کے ساتھ کہا''

''پاسپورٹ ہے؟'' مولوی صاحب نے کہا۔

''وہ بھی ہے!''

''گرین کارڈ ہے؟''

''وہ بھی ہے''

تو پھر اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے''۔ مولوی صاحب نے صدیق کے کندھے پر محبت بھرا دھپا مار کر کہا

''ان تینوں چیزوں کی موجودگی میں ایمان کی خاص ضرورت نہیں رہ جاتی، سب خیر ہے''۔(۱۹۴)

یہ مذہبی راہنما کی راہنمائی ہے۔اشفاق احمد کا یہ طنز ان تمام افراد کے لیے ہے جو ان تینوں مذکورہ بالا چیزوں کے حصول کو اپنا ایمان سمجھ کر ہر شے کی بازی لگانے کو تیار ہیں۔جبکہ آخرت میں جس پاسپورٹ کی ضرورت ہے وہ ایمان ہے جس کے بغیر، پل صراط کو پار نہیں کیا جا سکتا۔دنیا اور آخرت دونوں کی آزمائشیں، مشکلیں اور رکاوٹیں ایمان کے سر پر کاٹے جا سکتے ہیں۔صراط مستقیم پر چلنے کے لیے ہر وقت 'ہر جا' ایمان کو اپنے ساتھ بحفاظت رکھنا ضروری ہے تبھی سرخروئی مل سکتی ہے۔ اور یہی دین و دنیا کامیابی کا پاسپورٹ بھی ہے۔

اشفاق احمد کے افسانے ''وکھو وکھ'' کا مرکزی کردار جو ایک شاعر اور ادیب ہے بار بار اپنی محبوبہ کو خوشحال دیکھ کر اللہ کا شکر کر رہا ہے کہ وہ اس کی قربت سے محفوظ رہی ورنہ حالات کی بھٹی میں جل جاتی کیونکہ وہ بطور شاعر و ادیب اپنے اردگرد کے دوستوں کو ہمعصر ساتھیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اخلاقی برائیوں کا شکار ہو کر خود تباہ ہو چکے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اللہ کے کرم اور اس کی مہربانیوں کے انداز نرالے ہیں۔وہ جس کو انا اور خود پسندی، خودغرضی اور خود فروشی اور خود رائی کے چکر سے بچانا چاہے، صاف بچا کر لے جاتا ہے۔ایسے لوگ باغ ہستی میں پھول کی طرح کھلتے ہیں۔دائیں بائیں جھولتے جھومتے ہر ایک کو ''ہیلو ہیلو'' کہتے کہتے ایک دن خوشبو کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں''۔(۱۹۵)

درج بالا اقتباس میں اشفاق احمد ان تمام برائیوں کا ذکر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی ناپسندیدہ ہیں اجتماعی ماحول کے لیے بھی خطرناک ہے اور انفرادی طور پر بھی نقصان دہ ہے۔اشفاق احمد شاعر اور ادیب لوگوں کی برائیوں کو یا بری عادتوں کو بیان کر کے یہ واضح کرتے ہیں کہ ان خامیوں کو دور کر دیا جائے تو انسانیت کے یہی نام لیوا ادیب اصل میں اس کے خدمت گار بن جائیں گے۔کیونکہ اشفاق احمد نے ادیب برادری کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی خامیاں بھی بتائیں ہیں اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ فکر کی بلندیوں کو چھونا اور آگاہی کے عذاب کو جھیلنا آسان نہیں ہے اس کے لیے خون جگر دینا پڑتا ہے اور اگر محض کچھ خرابیوں کو دور کر لیا جائے تو شاید ان کے چہروں پر بھی نور برسنے لگے باقی اللہ تعالیٰ کے اختیار کی بات بھی کرتے ہیں وہ جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے۔اشفاق احمد یہ چاہتے ہیں کہ درد دل کی بات ہی نہ کی جائے بلکہ اس کو محسوس کر کے عملی اظہار بھی کیا جائے ''انسان'' کے لفظ سے بے پناہ الفت دکھانے کے ساتھ ساتھ پاس گزرتے آدمی کو بھی

’انسان‘ ہی سمجھا جائے، سچ مچ کے، گوشت پوست کے آدمی سے محبت کی جائے نہ کہ گندا اچھالا جائے۔ حکمت کے ساتھ ساتھ محبت سے بھی انسانوں سے برتاو کیا جائے۔ تا کہ ہر طرف پھول ہی پھول کھلیں اور خوشبو فضا میں تحلیل ہوتی رہے۔ ہنسی خوشی سب مل جل کر رہیں۔ جھومتے جھامتے، گاتے بجاتے زندگی کے ایام گزاریں اور گزارنے دیں۔

اشفاق احمد نے ’’قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا‘‘ میں انسانی آزادی کی بات کی ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور اپنا حق آزادی استعمال کرنے کے لیے اسے مکمل اختیار ہونا چاہیے اور بہادر شخص وہی ہوتا ہے جو اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ کے اپنا، اپنی رائے، سوچ اور خیال کو آزادی سے استعمال کرتا ہے۔ جیسا کہ موجودہ افسانے میں ماسٹر صاحب کا کردار ہے جس کو مار، ٹھڈے، مکے، ہورے ٹھاپیں پڑ رہی ہیں لیکن وہ اپنی آزادیء رائے سے منہ نہیں موڑتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ’’ماسٹر صاحب نے بلبلا کر کہا ’’اپنے حق کے معاملے میں میں پورا آزاد ہوں۔ میں چاہوں تو اپنا حق لوں، چاہوں تو چھوڑ دوں۔ کوئی مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔ میں ایک آزاد انسان ہوں۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ میں صاحب اختیار ہوں۔ تم مجھے مجبور کرنے والے کون ہو!‘‘ (۱۹۶)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے صاحب اختیار بنا کر بھیجا ہے۔ اسے آزادی دی ہے۔ اور جو شخص دنیاوی جاہ وجلال کا تمنائی نہیں ہوتا ہے یا اپنی خواہشات کا غلام نہیں ہوتا وہ ہی آزادی کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ وہ مجبور اور بے بس نہیں ہوتا لیکن جو لوگ اپنی خواہشات کے غلام ہوتے ہیں وہ ان خواہشات کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماسٹر عبدالودود مخالفین کے سامنے ہمت نہیں ہارتا، نہ ہی موت سے خوفزدہ نہ مار سے پریشان ہوتا ہے بلکہ کہتا ہے کہ

> ’’میں بہت ہی طاقت ور انسان ہوں جو اپنے حق کو اپنی مرضی سے استعمال کر رہا ہوں، لوگوں کے کہنے یا مجبور کرنے کے مطابق نہیں‘‘۔ (۱۹۷)

یہ ایک آزاد اور بااختیار انسان کامل کے رہنے کا طریقہ ہے جو اپنے ہر عمل میں آزاد اور جواب دہ ہے۔ جسے اللہ نے اپنا نائب بنا کر بھیجا اور زمینوں آسمانوں اور پانیوں کو فتح کرنے کا اختیار بھیجا۔ اسی لیے آزادی رائے کا عملی اظہار ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اشفاق احمد مزید بیان کرتے ہیں کہ

> ’’ماسٹر عبدالودود نے کہا ’’دلبر شاہ صاحب! مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ بے شک رائٹس مانگنے کے

لیے ہوتے ہیں اور ہر شخص کو رائٹس مانگنے کا پورا پورا حق ہے لیکن اگر کوئی اپنا حق چھوڑنا چاہے تو اس کو اتنی آزادی تو ہونی چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ سکے اور بلا جبر واکراہ چھوڑ سکے۔ اس پر یہ پابندی تو نہیں ہونی چاہیئے''۔(۱۹۸)

اشفاق احمد اس افسانے میں حقوق مانگنے اور موروثی حقوق چھوڑنے کی بات نہیں کرتے بلکہ ان کا بنیادی مقصد آزادی فکر کے عملی اظہار کی نشوونما ہے۔ جو شخص آزادی کی بات کرتے ہیں کہ ہر انسان کو مکمل حق ہے کہ وہ اپنی مرضی سے رہ سکے اور کچھ کر سکے۔ اور اس کے اس آزادی فکر کے عملی اظہار کو قبول اور تسلیم کرنا ہم سب کا اخلاقی فرض ہے۔

اشفاق احمد ''مہمان عزیز'' میں بیان کرتے ہیں کہ جب ہم غلطیوں اور گناہوں کو محض اس لیے نظر انداز کر دیتے یا ان کے ساتھ مصالحت کر لیتے ہیں کہ ایسا ہی ہوتا ہے تو پھر گناہ بڑھتا چلا جاتا ہے، بہتری اور اصلاح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''جوں جوں عمر بڑھ رہی تھی شفقت صاحب کے مزاج میں حرص، غصہ، خست، بداعمالی، منافقت اور اخلاقی کج روی میں اضافہ ہو رہا تھا...... ان کے اندر سے ہوس کے چشمے پھوٹنے لگے تھے...... ایسی صورت میں اور اس عمر میں مرد کا جبڑا ڈھیلا ہو جاتا ہے اور اس سے جنس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ شفقت صاحب گو ہر وقت منہ کے آگے رومال رکھتے تھے مگر تھوڑی دیر میں وہ رومال چپچی رال سے لتھڑ جاتا تھا''۔(۱۹۹)

یوں شفقیت چاہ کر بھی خود ان برائیوں سے الگ نہیں ہوسکتا۔ گھر کی نوکرانی ماریا کے ساتھ دیکھ کر اس کی بیوی رضیہ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے لیکن شفقت بے بس ہے۔ اشفاق احمد بیان کرتے ہیں کہ:

''میں ہر روز اسے فون کرتا ہوں، واسطے دیتا ہوں لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے۔ میں نے اس کو لاکھ سمجھایا ہے کہ اس میں میرا اپنا قصور نہیں، سب میرے ابا جی کا کیا دھرا ہے جو اس منحوس کو میرے گلے کا ہار بنا گئے ہیں۔ لیکن وہ میری ایک نہیں سنتی میری کوئی دلیل نہیں مانتی۔ لیکن میں بھی کیا کروں اور کس دیوار سے ٹکر ماروں کہ شفقت میرا اپنا تخلص ہے''۔(۱۰۰)

باپ کی ورثے میں دی ہوئی بری عادتیں، بیوی کا انھیں نظر انداز کر دینا۔ شفقت اور اس کی بیوی کو اذیت ناک حالت میں

مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس لیے اشفاق احمد والدین، شریک حیات اور خود اس شخص تینوں کو سرگرم عمل رہنے اور کوئی بھی شے سوچ سمجھ کر اپنانے کا درس دیتے ہیں۔ بعض اوقات بڑوں کی غلط باتوں اور فیصلوں پر سر جھکانا ہماری شخصیت کو توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح بطور شریک حیات، اپنے شوہر اور بیوی کو بدی سے چھڑانے کی کوشش کرنی چاہیے تا کہ گناہ اور سزا دونوں سے بچایا جا سکے اور بعض اوقات چھوٹا گناہ، بڑے گناہوں کا پیش خیمہ بنتا ہے اس لیے سرزنش نہیں جہاد ہونا چاہیے تا کہ بری عادات پنپنے سے پہلے ہی ان کا قلع قمع کیا جا سکے اور اسی طرح تندہی سے اپنی ذات کی حفاظت بھی لازمی ہے تبھی ہم دین و آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مالک بن سکتے ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانے ''بیک گراؤنڈ'' کا موضوع 'سوزن' یا وہ طوائف ہے جس کو اس کے ''بیک گراؤنڈ'' کی وجہ سے تعلیمی اداروں میں جگہ نہ مل سکی، سوسائٹی میں شرفا کے درمیان رہائش نہ مل سکی، ٹیوشن میں بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں برتا گیا تو اس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کی سوچ کس حد تک مثبت ہو گی۔ اشفاق احمد معاشرتی طور پر شرفاء کے ان رویوں کو جو اخلاقاً، مذہباً اور شرعاً سراسر انسانیت کے خلاف جاتے ہیں ان کو موضوع بناتے ہیں۔ شرفاء کی لڑکیوں کا اخلاق تباہ ہوتا ہے اس لیے سوزن کو کالج سے نکال دیا جاتا، کیا ایک انسان کو علم کے حصول سے روک دینا کوئی چھوٹی بات ہے ایسے حالات کے شکار انسان کی عزت نفس تو قدرتی طور پر اُسی وقت تباہ ہو جائے گی۔ سوزن طوائف ہے۔ کم پڑھی لکھی ہے، شاہی محلے میں رہتی ہے اور انگریزی لب و لہجے سے محروم ہے تو اس میں قصور اس کا نہیں بلکہ ان عناصر کا ہے جو چاہتے ہیں کہ وہ پاکیزہ زندگی کی طرف نہ بڑھے، اس میں تقدس کا احساس بیدار نہ ہو پائے اور اس کی وضاحت افسانے کے آخر میں کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ جب اس گندگی سے نکلنے کی آخری صورت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جب اشفاق احمد اس سے شادی کے بارے میں پوچھتے ہیں کیونکہ شادی، سوزن کی زندگی کو ایک نئے راستے پر لیجا سکتی تھی لیکن یہ بھی نہ ہو پاتا اشفاق احمد بیان کرتے ہیں کہ:

> ''میں نے کہا'' تو میرا مطلب نہیں سمجھی۔ میرا مطلب ہے
> شادی کے لیے کوئی عقل کا اندھا پکڑا کہ نہیں؟''
> وہ بڑی سنجیدگی سے بولی ''ایک پکڑا تھا انکل لیکن وہ قابو نہیں...... ہاتھ سے نکل گیا''۔
> ''کیسا تھا؟''

''بہت اچھا انکل، بلکہ بہت ہی اچھا......تربیلا میں انجینئر تھا اور ہر ہفتے مجھے ملنے آتا تھا''۔

''پھر؟''

''پھر کیا............نہیں مانا''

''تمہارے جیسی خوبصورت لڑکی کے لیے بھی نہیں مانا؟'' (۲۰۰)

اور اس اچھے شریف اور باکردار انجینئر کی شادی نہ کرنے کی وجہ جو سوزن بتاتی ہے۔ وہ ہمارے معاشرے شریف نوجوانوں کی اخلاقیات کی بھرپور عکاسی ہے۔ نہایت حقیقت پسندی سے اشفاق احمد ان کی سوچ بے نقاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''دل سے تو مانتا تھا لیکن ڈرتا بہت تھا...... کہتا تھا تم جیسی طوائف زادیاں شادی کے بعد اتنی شریف اور گھریلو قسم کی بن جاتی ہو کہ زندگی کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔ تم ویسی ہوٹ اور......نہیں رہتی ہو، ڈپٹی نذیر احمد کی بی بیاں بن جاتی ہو......''۔ (۲۰۱)

یہ طوائف زادیاں کوٹھوں کے شریف تماش بینوں کی اولادیں ہی ہوا کرتی ہیں نہ یہ کوٹھوں پر جائیں نہ گھنگھروؤں کی صدائیں گونجیں اور نہ ہی ان طوائفوں کی اولادیں ہوں، یہ شرفا رنگ و سرود کی محفلیں تو سجا سکتے ہیں اور خوشی خوشی اس کا حصہ تو بن سکتے ہیں لیکن اس کو دن کے اجالوں میں تسلیم کرنے سے گھبراتے ہیں اور شریف کہلاتے ہیں۔ حالانکہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ طوائف جس کے ساتھ ہم اپنے شب خانے سجاتے اس کے اندر بھی عام، گھریلو عورت سا دل دھڑکتا ہے۔ یہ بھی آنگن کی ترستی چڑیا ہے۔ یہ بھی عذاب سے بچنا چاہتی ہے لیکن وہ الزام کبھی اپنی کم ہمتی اور بزدلی پر اور کبھی معاشرے اور خاندان پر رکھ کر نبرد الزام ہو جاتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ان کے اندر کا شیطان چاہتا ہی نہیں کہ وہ طوائف کی لذت سے نکلے۔ گھریلو عورت ان کو بودی معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی جنسی تسکین کے لیے ان بالا خانوں پر جاتا ہے اور یہ سہہ نہیں سکتا ہے کہ وہ طوائف جو اس کی جنسی تسکین کا باعث ہے یہ چلن چھوڑ کر شرافت کی زندگی بسر کرے۔ اشفاق احمد ان حقائق اور اخلاقی بدحالی کو سامنے لا کر دراصل ان مسائل پر سوچنے، بات کرنے اور ان کے خلاف مشن جاری کرنے کی پکار کرتے ہیں کیونکہ حضرت انسان کا یہ منصب نہیں ہے۔ توبہ کے دروازے ہر ایک کے لیے ہر وقت کھلے رہتے ہیں، اس میں کوئی تعصب، کوئی تخصیص اور کسی بیک گراؤنڈ کی قید ہرگز نہیں ہے۔

اشفاق احمد کا افسانہ ''زرناب گل'' دو محبت کرنے والوں کی کہانی ہے جس میں سے ایک وفادار اور دوسرا بے وفا ہو گیا۔ سب سے پہلے کہانی کے ہیرو کا وہ وعدہ ہے جو اس نے نجمہ سے کیا اور اس کی آنکھوں میں خواب بھرے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''میں نے نجمہ کو بتایا تھا کہ جب ہماری شادی ہو جائے گی اور ہمارا بیٹا پیدا ہو گا تو ہم اس کا نام زرناب گل رکھیں گے اور اس کو تیر اندازی کا فن سکھائیں گے''۔ (۲۰۲)

اور یہ وعدہ اس کو سالوں بعد یاد آتا ہے جب وہ اپنے بیٹے کی منگیتر، اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ہیڈ بلو کی پک نک منانے کی غرض سے جاتا ہے تو اسے راستے میں ایک کریہہ منظر نظر آتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

''اس جیپ کے پیچھے ایک موٹے سے رسے کے ساتھ براؤن رنگ کا کتا بندھا تھا جو پچاس پچپن کی سپیڈ پر تیز دوڑتی کار کے پیچھے بڑے عبرت ناک انداز میں گھسٹ رہا تھا............ہم جیپ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھے اور میرا بیٹا آگے بڑھ کر رائفل بردار سرداروں کو روکنا چاہتا تھا لیکن ہم سب اس کو منع کر رہے تھے۔ میری بیوی اور ہونے والی بہو اپنی آنکھوں کے گرد دوپٹے لپیٹ کر کافی اونچی آواز میں رو رہی تھیں اور ہم پتھر کے بت بنے اس خونی ناچ کو دیکھ رہے تھے''۔ (۲۰۳)

اس خونی ناچ کو دیکھ کر اس کو روکنے یا رکوانے کی ہمت اور جرأت کسی میں نہیں تھی کیونکہ اس کتے کی جگہ خود ان کا وجود بھی ہو سکتا تھا اور یہی ہم لوگوں کا عام طرز زندگی ہے ہم برائی کو ہوتا دیکھ کر زار وقطار رو تو سکتے ہیں، آنکھوں پر ہاتھ رکھ سکتے ہیں۔ اس منظر سے آنکھیں پھیر سکتے ہیں لیکن اس سے منع کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اجتماعی سے زیادہ ہمیں انفرادی بقائے حیات کی فکر رہتی ہے۔ اس کے بعد شعلوں سے بھڑکتی آگ میں گٹاری کے دو بچے جھلس کر رہ جاتے ہیں اور نجمہ کہتی ہے کہ:

''ایک لڑکی نے روتے ہوئے کہا ''مس دونوں بچے جل کر راکھ ہو گئے'' مس نے بڑے تحمل کے ساتھ بڑی ملائم آواز میں کہا ''ہاں کلثوم، دونوں زرناب گل ہو گئے............ میں نے اپنی بیوی سے کہا ''ان سے ملو یہ نجمہ ہیں'' وہ میری بیوی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی ''میں رادھا رام سکول میں ہیڈ مسٹریس ہوں اور یہ میری ملازمت کا آخری سال ہے۔ پھر اس نے زور زور کی تالی بجا کر کہا ''بچیو! واپس واپس

واپس!!! لڑکیاں بس کی طرف لپکیں اور نجمہ ہم سے خدا حافظ کہے بغیر انھیں لے کر بس میں سوار ہو گئی۔
گٹاری اب بھی اسی طرح جھلسی ہوئی فضاؤں میں چیخ رہی تھی حالانکہ اب چیخنے والی کوئی بات ہی نہ رہی تھی''۔(۲۰۴)

جس طرح گٹاری کے بچے، آگ کے شعلوں کی لپکوں میں جھلس کر رہ گئے اسی طرح نجمہ کے خواب بھی راکھ ہو گئے۔شادی، بیٹا، بیٹے کا نام ''زرناب گل'' سب آگ کے بے سرے ڈھولوں اور ٹوٹی ہوئی نوبتوں میں چیخ چیخ کر ابھرتے، گرتے، بکھرتے جھلستے خاک ہو گئے ناک کا گلابی لہسن سیاہی میں تبدیل ہو گیا۔ جن پانیوں سے وہ کبھی ایک ساتھ گزرے تھے نجمہ عمر بھر کے لیے ان میں ابھرتی ڈوبتی رہی جبکہ ان پانیوں کو برسانے والا کب سے کنارے پر اتر گیا اور سوچ رہا ہے گٹاری کے چیخنے کا اب کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وقت گزر چکا ہے۔

اشفاق احمد کے افسانے ''دم بخوذ'' میں دعا اور دعا مانگنے والے کے تیقّن کی بات ہے کہ شفا جب اللہ کی طرف سے آتی ہے تو اس میں مانگنے والے کی ریاضت شامل ہوتی ہے۔اور دعا ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے اللہ کے ارادوں کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ گائتری ہر روز مسجد کے باہر شیشی لے کر کھڑی ہو جاتی تا کہ نمازیوں سے دم کروائے۔ یہ ایک ہندو لڑکی کا الحمد شریف پر یقین تھا۔جس کی وجہ سے اس کا بھائی شفایاب ہو سکا۔اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''بات یہ ہے'' ماتھر جی نے ہماری قبولی میں کھچی پھیرتے ہوئے کہا''

یہ سب بھگوان کے بھید میں اور اصل علم اس کے پاس ہے۔ پر جب کوئی اس کی چوکھٹ پر گھٹنے ٹیک کے اور سیس نوا کے اپنا آپ...... پورے کا پورا......اس کے حوالے کر دیتا ہے تو وہ اپنی مرضی بھی تبدیل کر لیتا ہے۔ہم سے تو یہ کام نہ ہو سکا۔ نہ مجھ سے نہ اس کی ماں سے، پر گائتری نے بینتی کر کے بھگوان کی اچھیا بدلوالی''۔(۲۰۵)

گائتری کا رب کائنات پر یقین اور التجا کی مورت بن کر نمازیوں کے سامنے کھڑے ہو جانا۔اللہ کے ہاں بھی مقبول ٹھہرا اور اس کے بھائی کو نئی زندگی مل گئی۔ اشفاق احمد دعا کی طاقت اور اعتقاد کی بات کرتے ہیں کہ اگر یہ دونوں ہوں تو دنیا کا کوئی بھی کام یا آپ کی اپنی مرضی کی کوئی بات رب سے منوانا آسان ہو جاتا ہے اور یہی اعتقاد جب کئی برس بعد مرکزی کردار کو یاد آتا ہے اور وہ اپنی پوتی کے بیمار ہو جانے پر پڑھا ہوا پانی اپنی بہو کو دیتا ہے تو اس کا جواب اشفاق احمد یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''واپسی پر جب میں نے پڑھا ہوا پانی اپنی بہو کو دیا تو اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور بڑی محبت سے کہا ''ابو وائرس اور جراثیم پر یہ پانی کس طرح سے اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس میں تو اپنے بہت سے جراثیم ہوں۔ میں نیتا کو ابلا ہوا پانی دیتی ہوں، وہ بھی نکال دیتی ہے۔ یہ پانی تو اس کے لیے بہت ہی خطرناک ہوگا''۔(۲۰۶)

بات دراصل اعتقاد کی ہے کہ اب ہم نے اللہ پر بھروسے کے بجائے ڈاکٹروں پر کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گائتری کے بھائی کو جس پانی نے زندگی دی وہ محض نمازیوں کی پھونکیں اور دم شدہ نہیں تھا بلکہ گائتری کا یقین اور ریاضت تھی۔ جو رنگ لائی اور مادھو کو جیون ملا جبکہ اِس اعتقاد اور اللہ پر بھروسے کے راز سے اس کی بہو واقف ہی نہ تھی۔ اشفاق احمد ہر مشکل کا حل، اللہ پر یقین ہی کو بتاتے ہیں اور یہ بات بھی ان کے افسانوں میں واضح ہے۔ اللہ صرف مسلمانوں کا رب ہے بلکہ بلاتعصب اور بلاتخصیص مذہب وملت وہ ہر کسی کو اس کی نیت اور عمل کے مطابق اجر دے دیتا ہے۔ گائتری ہندو ہونے کے باوجود مسجد کے دروازے کے باہر شیشی لیے کھڑی ہے۔ نہ اس کے دل میں نفرت نہ تعصب ہے اس کا یہ اعتقاد اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے جبکہ مرکزی کردار کی بہو، پڑھی لکھی، مذہب کی سوجھ بوجھ رکھنے والی لیکن اللہ کے بجائے وائرس اور جراثیموں سے خوفزدہ ہے اب فیصلہ قارئین کے ہاتھ میں ہے کہ وہ کس پر یقین رکھتے ہیں الحمد شریف پر یا وائرس پر۔ اشفاق احمد نے اپنا اخلاقی فرض ادا کر دیا ہے۔

اشفاق احمد اپنے افسانے ''بدلی سے بدلی تک'' میں عاشق شوہروں کے سامنے اس بات کو زیر بحث لاتے ہیں کہ شادی بعد اپنی بیویوں کے ساتھ محبت کے ساتھ پیش آنا چاہیے اور ان پر توجہ دینی چاہیے تا کہ وہ بری باتوں کی طرف مائل نہ ہو سکیں اگر ماضی کا کوئی قصہ ہو بھی تو اس کی یاد شوہر کی محبت سے معدوم پڑ جائے نہ کہ بار بار ماضی کی یاد ستائے اور انسان کے دل میں نہ چاہتے ہوئے بھی برے خیال اور ارادے پیدا ہوں۔ اس افسانے میں محبوب ہی شوہر بن جاتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''مگر وہ کہاں جاتی اور کس کے ساتھ بھاگتی! ناصر تو اس کی ساتھ والی چارپائی پر چادر لپیٹ کے سو رہا تھا اور نیند میں مچاکے مار رہا تھا''۔(۲۰۷)

اشفاق احمد کے مطابق عاشق کو شوہر بننے کے بعد اپنے پیار کی شدت کو قائم رکھنا چاہیے نہ کہ وہ بیوی کو یہ سوچنے پر

مجبور کر دیں کہ ''عاشق'' کوئی اور ہوتا ہے اور شوہر کوئی اور ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں ایک شاد آباد گھرانے کی بنیاد ہل سکتی ہے بیوی محبوب کی یادوں میں کھو کر شوہر کو فراموش کر دے گی یا اس عاشق کو تلاشنے میں خود کو وقف کر دے گی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ برائی کے راستے پر چل پڑے کیونکہ انسان کی فطرت ہے وہ جتنا پیار چاہتا ہے اگر اس سے کم ملے یا جتنی محبت اسے ملتی رہے اس سے کم ملے تو اس کی ذات میں ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے وہ کسی بھی صورت میں بھرنا چاہتا ہے۔ چاہے اسے کوئی بھی راستہ اختیار کرنا پڑے اور اشفاق احمد ایسی ہی صورتحال سے اپنے قارئین کو بچانا چاہتے ہیں۔

''سہیل کی سالگرہ'' افسانے میں اشفاق احمد ایک غریب مزدور یوسف کے بیٹے کی سالگرہ کا حال بتاتے ہیں کہ کس طرح ابرار یوسف کو کار میں بٹھا کر اپنے گھر لے جاتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ

> ''سر جی جب اس کو اپنی کار میں سوار کرانے لگے تو یوسف کا کلیجہ کانپ گیا...... گاڑی سٹارٹ کر کے جب ابرار صاحب نے بٹن دبا کر شیشے اوپر چڑھائے تو انھوں نے مسکرا کر پوچھا ''پہلے کبھی اتنی بڑی گاڑی میں بیٹھے ہو؟'' یوسف نے کہا ''نہیں سر جی'' اور پھر شرمندہ سا ہو گیا''۔ (۲۰۸)

اشفاق احمد یہاں پر ایک امیر آدمی کا انداز تفاخر دکھاتے ہیں جو اپنے ہی کام کے لیے ایک غریب آدمی کو گاڑی میں بٹھا کر گویا احسان کر رہا ہو اور غریب کی شرمندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہونے پر شرمندہ ہے، یوسف کو جو بتایا گیا تھا کام اس سے زیادہ تھا لیکن اس نے چوں نہیں کی اور بڑی مہارت سے کمرہ تیار کیا۔ لیکن اس کے برعکس جب یوسف اپنے بیٹے کی سالگرہ کی وجہ سے ابرار صاحب کو گھر چھوڑنے کا کہتا ہے تو وہ...... ماتھے پر آنکھیں رکھ لیتا ہے۔ اور طے شدہ معاوضے ہی کی بات کرتا ہے۔ مثلاً:

> ''بیگم ابرار نے پھر انگریزی میں کہا کہ ''ابرار! واپس چھوڑ کے آنا تو ہماری ذمہ داری نہیں ہے ناں'' تو ابرار نے جواباً کہا ''سویٹ ہارٹ! دراصل ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے اس کو ہینڈسم معاوضہ ادا کر دیا گیا ہے پسینہ سوکھنے سے پہلے''۔ (۲۰۹)

حالانکہ یوسف کو بھی کمرا بڑا ہونے اور گراؤنڈ تیار نہ ہونے پر اپنا معاوضہ بڑھانا چاہیے تھا لیکن اس نے پوری ایمانداری سے کام کیا لیکن اس کا صلہ اس کو بے حسی کے سوا کچھ نہ ملا یوسف جب گھر پہنچتا ہے تو اس کا بیٹا سو چکا ہوتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''رضیہ نے کہا ''اب کیک کس کام کا، سہیل بے چارے کی جو بے عزتی ہونی تھی، وہ تو ہوگئی............
جب سارے لڑکے تپائی کے گرد کھڑے ہو گئے تو اللہ نے میرے دماغ میں اپنے فضل سے ایک بات
ڈال دی میں کے دوکانداروں کی دکان سے ایک ڈبل رٹی ادھار لے آئی۔ چھری تو سہیل صبح سے دھو
کے، صاف کر کے، چمکا کے بیٹھا تھا...... یہ تو بھاگ کر اندر گھس گیا کوٹھڑی میں۔ اور اندر سے دروازہ بند
کرلیا...... سچی بڑا رویا ساری شام''(۲۱۰)

اور یوں یوسف جو سارا دن مزدوری کرتا رہا کہ شام کو اپنے بیٹے کی خوشی پوری کرے گا۔ اس کی ساری خوشی کافور جاتی ہے۔ اگر ابرار صاحب اسے گاڑی پر اس کے گھر تک چھوڑ جاتے تو یقیناً یہ صورتحال نہ ہوتی اور ایک بچہ اپنے ماں باپ اور دوستوں کے ساتھ اپنی سالگرہ کا دن اچھی طرح سے منا لیتا، لیکن ہمدردی کے یہ جذبات آخر کہاں دفن ہو جاتے ہیں کہ جب ہم اپنی اولاد کی خوشیوں کے لیے ہر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تو غریب کا بچہ بھی اس کی زندگی میں اتنی اہمیت ہی رکھتا ہے۔ اور اب اسی یوسف کا رویہ، ابرابر صاحب جیسے لوگوں کے ساتھ کیسا ہوگا اس کی سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''یوسف اسی طرح منہ تھتھائے دروازہ کھول کر چپ چاپ باہر گلی میں نکل گیا اور تین سوے ہوے کتوں
کے آگے کیک رکھ کر بولا ''لو کتو کھاؤ۔ موج اڑاؤ''۔
پھر اس نے ہر کتے کی طرف اشارہ کر کے تین مرتبہ زور زور سے کہا ''کتا! کتا! کتا!!!''
اور صبح پھر کام پر جانے کے لیے گھر واپس آ کر سو گیا''۔(۲۱۱)

یہ ''کتا! کتا! کتا!!!'' یوسف نے کس کو کہا یہ سارے قارئین بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ ہر ابرار جیسے آدمی کو یہ گالی دی گئی ہے جس نے یوسف جیسے محنتی ہنر مند مزدور کی مجبوری کو اہمیت نہیں دی اور یہی رویہ ان جانوروں جیسے مزاج کے حامل لوگوں کے ساتھ اب یوسف کا ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ اشفاق احمد کے مطابق اسی طرح معاشرے میں بری عادات و خصائل پیدا ہوتی اور بڑھتی پھولتی ہیں۔ اگر انسانی اخلاقی تقاضوں کا خیال رکھا جائے تو یہ نوبت ہی نہیں آتی کہ انسان کو کتا کہہ کر پکارا جائے۔ روپے پیسے مال اسباب کے علاوہ بھی انسانی ضروریات معنی رکھتی ہیں، جو نظر انداز ہو جائیں تو معاشرہ اخلاقی بدحالی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور انسان انسانیت کے معیار سے نیچے گر کر جانوروں کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور ان ہی سے

بچانا اشفاق احمد اپنی ذمہ داری سمجھ کر بناتے ہیں۔

ز۔ طلسم ہوش افزاء

اشفاق احمد ''ملک مروت'' میں زندگی اور موت کی اٹل حقیقتوں اور مشیت ایزدی کے اٹل ہونے کی یاد آوری کرواتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کا اپنے مقررہ وقت پر ہونا ہی طے ہو چکا ہے اور کوئی بھی کام مقررہ طے شدہ وقت سے پہلے نہ بعد ہی ہوتا ہے۔ اور سبھی مخلوقات اللہ تعالیٰ کے بنائے قوانین کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہیں۔ خواہ وہ انسان ہو یا فرشتے سب کو اپنے اپنے کام کرنے سے سروکار ہونا چاہئے۔ مثلاً ملک الموت دانیال سے کہتے ہیں کہ:

''لیکن یہ سب زبان کی املائی ساختیات کے روپ ہیں اور اس وقت جو ہم اپنی اپنی اہم ڈیوٹی پر مامور ہیں، ہمیں املا سے اور قواعد سے کیا لینا ہے۔ ہمیں تو اپنا اپنا فرض نبھانا ہے''۔ (۲۱۲)

اس لیے بحیثیت انسان ہم سب کو اپنے فرائض پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ کیونکہ ہم ہماری بقاء اسی اطاعت میں ہے کہ ہم قدرت کے قوانین کے سامنے اپنے سر جھکائیں۔ جس معاشرے میں قانون سے خواہ وہ قانون قدرت ہو خواہ انسانوں کا ترتیب دیا ہوا انحراف ہو تو غیر متوازن حالات اور ماحول جنم لیتے ہیں۔ 'ملک الموت' افسانے میں اشفاق احمد نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور قدرت کو بھی بیان کیا ہے۔ اور نظام کائنات کے منظّم ہونے کی دلیل کا بھی خوبصورت طریقے سے اظہار کیا ہے۔

اشفاق احمد نے ''سونی'' میں ہمارے معاشرے کے اس المیہ کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں محبت سے زیادہ دولت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جہاں ہم خیال ہونے کی نسبت ہم حال ہونا زیادہ ضروری ہوتا ہے کیونکہ اسی صورت میں زیادہ اچھی انڈرسٹینڈنگ ہو سکتی ہے۔ اور اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ دونوں میں محبت موجود ہو وہ لکھتے ہیں کہ:

''تو جناب بختیار اور خجستہ کے درمیان محبت اور لذت تو ختم ہو گئی لیکن ان کے درمیان انڈرسٹیڈنگ بہت بڑھ گئی...... ان کی زندگی یو این جیسی خلیق، ملنسار، مہذب اور شائستہ ہو گئی اور انڈرسٹیڈنگ کی چاشنی میں اس طرح رچ گئے کہ اٹھتے بیٹھتے ان کے منہ سے بار بار تھینک یو، ڈیئر، ہنی، سویٹ اور کیوٹ نکلنے لگا''۔ (۲۱۳)

بختیار اور خجستہ کی انڈرسٹیڈنگ کی وجہ مادی اشیاء تھیں۔ دونوں کے پاس اپنی اپنی بے شمار چیزیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان چیزوں کی بات آتی ہے تو دونوں کے بیچ میں پہلا جھگڑا ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

''جس دن بختیار سفر پر جانے لگا اس روز اس کے اور خجستہ کے درمیان تھوڑا سا جھگڑا ہو گیا۔ خجستہ نے کہا ''بختیار تم اپنا ایک وی سی آر مجھے دیتے جاؤ تاکہ اگر خدانخواستہ میرا خراب ہو جائے تو میں اور میری فرینڈز فلمیں دیکھنے سے محروم نہ رہ جائیں''، بختیار نے کہا ''تم اپنے لیے ایک اور خرید لو لیکن میرا گیجٹ مجھ سے نہ مانگو۔ میں ان سے وابستہ ہو جاتا ہوں تو ان کو اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔ ان میں میری جان ہے''۔(۲۱۴)

اس دن خجستہ کو پہلی بار صدمہ لگتا ہے کہ بختیار اس کے علاوہ بھی کسی کو جان کہہ سکتا ہے۔ اشفاق احمد اس افسانے میں یہ نکتہ سمجھانا چاہتے کہ ان مادی اشیاء کی بنیاد پر تعمیر ہونے والی عمارت جلد ہی زمین بوس ہو جاتی ہے۔ جب بختیار چار مہینے بائیس دن کے بعد واپس لوٹتا ہے تو سونی کو گرد سے لپٹا دیکھتا ہے۔ اب بھی بختیار کا دھیان ان اشیاء کی طرف ہی ہے۔ خجستہ اس کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے گیٹ ٹو گیدر کے لیے بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ اس تہذیب، کی عکاسی کے بعد جب اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے تو محبت کی اہمیت اور مادیت پرستی کا نقصان بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

اشفاق احمد ''چھ چھیکا بتیس'' میں احمد یہ بیان کرتے ہیں کہ شخصی آزادی اور رائے کا احترام کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ حکومتیں عوام کی آزادی کا تحفظ کرتی ہیں اور اگر کوئی شخص طے شدہ فارمولے سے انحراف کرتا ہے تو اس کی وجہ تلاش کرتی ہیں۔ ترقی یافتہ اقوام، کائنات کا تغیر، اقوام کی ترقی طے شدہ فارمولوں سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں ایسے فرد کی ترقی کو روک لیا جاتا ہے، یا ''سائیں'' کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا پھر غیر ملکیوں کے ہاتھوں بیچ دیا جاتا ہے۔ کیونکہ غیر ملکی اس سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ مثلاً بنک کے امریکی نمائندے کے خیالات اشفاق احمد یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''ہم ایسی کج رویوں سے اور اس قسم کے ذہنی فتور سے بہت ڈرتے ہیں کہ ہمارے کندھوں پر امن عالم برقرار رکھنے کی ذمہ داری ہے ہم نے انسانیت کے سمندر میں سمود سیلنگ کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے اور ہم کام میں طے شدہ اقدار کے حامل ہیں''۔ چھ چھیکا بتیس۔(۲۱۵)

اسی طرح بلجیئن کے نمائندے کے خیالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''پروفیسر ساعتی جیسا شخص جو دنیا کے طے شدہ قاعدے سے ایک مقام پر انحراف کرتا ہے، وہ کسی اور طے شدہ اور مستقل قاعدے سے اس سے بھی بڑھ کر انحراف کر سکتا ہے''۔(۲۱۶)

اسی طرح انگلستان کا نمائندہ امریکہ اور بلجیئن کے نمائندوں کے خیالات اور بیانات سن کر غصے سے ہانپنے لگا اس کے غصے کی کیفیت کو اشفاق احمد یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> ''لیکن اس کی بات کو انگلستانی نمائندے کی گرج دار اور گستاخ "No" نے بیچ ہی میں کاٹ دیا۔ وہ ایک تھکے ہوئے خوبصورت کتے کی طرح ہانپتے ہوا بولا ''ایسی خوف ناک اور منحوس بات مثال کے طور پر بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے سارے نظام کائنات کے درہم برہم ہونے کا اندیشہ ہے''۔ (۲۱۷)

اشفاق احمد نے اس افسانے میں ایسی اقوام کی اخلاقی معیار کا تذکرہ کیا ہے جو اخلاقیات کے علمبردار ہیں لیکن درحقیقت اپنی رائے سے انحراف بھی ان کی برداشت سے باہر ہے اور اس جرم کی پاداش میں وہ کڑی سے کڑی سزا دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

اشفاق احمد ''سعید جونیئر'' میں بیان کرتے ہیں کہ سعید احمد نے اپنی آرزو کے حصول کے لیے نماز، اذکار اور وظائف شروع کر لئے۔ پھر جن انعامی بانڈوں اور لاٹری کی ٹکٹوں کے لیے یہ سب شروع کیا تھا ان کو تو بھول گیا لیکن ذکر، وظائف جاری رہے۔ لیکن جب تک روح شامل نہیں تھی یہ ذکر اللہ تعالیٰ کی نظر کرم حاصل کرنے میں مدد نہ کر سکے۔ سعید احمد میں کوئی بھی تبدیلی نہ لا سکے۔ اس صورتحال کو افسانے میں اشفاق احمد یوں بیان کرتے ہیں کہ:

> ''ورد، وظیفے، نماز، ریاض اور عبادات روح کو بالیدہ کر دیتے ہیں لیکن بدی برائی، بدچلنی کو رندہ نہیں لگتا...... اسے دشت سے کوئی لکڑہارا ہی نکال سکتا ہے یہاں کوئی مرجینا ہی ہاتھ پکڑ کر علی بابا کے دروازے پر لے جا سکتی ہے۔ خود نہیں جایا جاتا''۔ (۲۱۸)

اللہ تعالیٰ کے قرب کو پانا اتنا مشکل بھی نہیں ہے لیکن اس کے لیے وہ جنوں بھی تو ہو جو اخلاق کو محض اس لیے درست رکھتا ہے کہ وہ اللہ کا دوست ہونا چاہتا ہے نہ کہ وہ بطور رشوت اس کا استعمال کرتا ہے۔ مثلاً اسی افسانے میں آگے چل کر سعید جونیئر، سعید احمد سے کہتا ہے کہ

> ''دیکھو سعید بھائی'' سعید جونیئر نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا ''اس کائنات کے جتنے بھی عبادت گزار اور شب زندہ دار انسان ہیں...... اگر وہ اپنے اخلاق، افعال اور کردار میں تبدیلی نہ کریں تو وہ کسی مقام پر بھی نہیں پہنچ سکتے لیکن اللہ چونکہ کسی کے اعمال ضائع نہیں کرتا اس لیے ان کے درود و وظائف اور

ذکراذکار اللہ کے حضور میں ضرور پہنچ جاتے ہیں''۔(۲۱۹)

اوراس طرح سے انسان اپنا اخلاق اور اعمال بہتر بنا کر اللہ کو خوش کر سکتا ہے اور پا سکتا ہے جو بھی اس کی چاہت ہوتی ہے۔

اشفاق احمد ''آخری حملہ'' میں جراثیموں کی رجمنٹ کی کہانی بیان کرتے ہیں لیکن درحقیقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ انسانوں کی رجمنٹ ہو کیونکہ بیان شدہ مسائل اوران کا حل اسی دنیا سے جڑے نظر آتے ہیں۔ ہر کام کی اپنی نوعیت اور ہر شعبے کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں۔ کام کرتے وقت جن کو ملحوظ خاطر رکھنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ کام کا نتیجہ نہیں نکلتا جس کے اہم امیدوار ہوتے ہیں۔ اس میں کسی بھی ادارے کا ماحول اور مالک کا ماتحتوں کے ساتھ رویہ خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ اشفاق احمد اس نکتے کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ:

> ''جب باس کو، جنرل کو، صاحب خانہ کو یا بادشاہ وقت کو غصہ چڑھا ہو تو ماتحتوں کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے وہ زندہ تو رہتے ہیں اور اپنے فرائض منصبی بھی ٹھیک ٹھیک سرانجام دیتے ہیں لیکن ان کے دل اندر سے بجھ جاتے ہیں اور ان میں کام کرنے کی وہ صلاحیت باقی نہیں رہتی جو آگے بڑھ کر ...... پر حملہ آور ہوتی ہے اور دشمن کے چھکے چھڑا دیتی ہے''۔(۲۲۰)

اس لیے کسی بھی شعبے میں زیادہ بہتر کام کرنے اور کروانے کے لیے ماحول اور رویوں کا بہتر بنانا بہت ضروری ہے اور یہ ہر شعبے کی اخلاقیات میں شامل ہیں۔ جو لوگ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ خود اپنا اور ادارے کا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔

اشفاق احمد ''کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ'' میں معاشرتی اخلاقیات، رسم ورواج، روایات، رہن سہن کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں روزمرہ کی زندگی کو خاص سمت میں لے کر جاتی ہیں۔ اوراس کا اثر انسان کی فطرت پر ہوتا ہے۔ رشتوں کی پاسداری، انسانیت کا احترام پر باتیں ہماری تہذیب اور کلچر کا حصہ ہیں اور یہ ہماری شخصیت کا حصہ بنتی ہیں۔ اشفاق احمد ''کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ'' میں بتاتے ہیں کہ:

> ''مجھے چونکہ رفاہ عامہ کے کاموں سے گہری دلچسپی ہے اور میں پردیسیوں کی مدد کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں''۔(۱۲۲۱)

اشفاق احمد کے مطابق پردیسوں کی مدد کرنا، ان کی جان اور مال کی حفاظت کرنا ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے۔

''پوری جان کاری'' اشفاق احمد کا ایسا افسانہ ہے جس میں وہ انسان کو تمام تر ساہنی ترقی، خوش حالی، صحت مندی، آ گہی اور خوبصورتی کے باوجود آپس میں مل جل کر رہتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ ان میں اونچ نیچ کا تصور نظر نہیں ہے۔ ہر علم کی تشریح معلوم ہونے کے باوجود کوئی تجسس، حیرت نہیں ہے۔ طبقاتی تقسیم نہیں ہے۔ اور کوئی مسٹری نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> ''ہر ایک کو ہر ایک کی ڈیوٹی کا پتہ ہوتا تھا، کسی کا کسی سے کوئی رگڑا جھگڑا نہ تھا۔ ہر کام گھڑی کی سوئیوں کی طرح چلتا تھا اور ہر شے علم و ابلاغ کی ڈوری سے بندھی تھی۔ ہر ایک کو اپنے محبوب کی موجودگی کا، اس کے موڈ کا، اس کے ٹمپریچر اور بلڈ پریشر کا علم ہوتا تھا''۔ (۲۲۲)

ماہڑہ کی تحقیق کے دوران میں سنگ یشب کی تختیوں پر تین نظمیں، پانچ لوک کہانیاں اور ایک بیاں ایسی لوک دانش کا بھی ملتا ہے جس پر اقوال زریں، کہاوتیں، محاورے وغیرہ درج ہوتے ہیں جس کی بناء پر جوزف اور اس کی بیوی کیرولین کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ یہاں پر پانچ آدمی ایسے بھی تھے جو نظمیں اور کہانیاں لکھتے تھے۔ افسانے میں کچھ اس طرح سے مرقوم ہے کہ

> ''ان دونوں میاں بیوی کا یہ کلیم تھا کہ ساہنی علوم سے سو فیصدی جان کاری کے باوصف ماہڑہ کے پانچ آدمی اب بھی تحیر اور تجسس میں مبتلا تھے اور وہی لوگ نظمیں اور کہانیاں لکھا کرتے تھے''۔ (۲۲۳)

اور اسی علم و دانش کی بلندیوں کو چھوتی بستی میں عشق و محبت جیسے جذبات پنپتے ہیں۔ وفا کا بول بالا ہوتا ہے، احساس کی ندی بہتی ہے۔ مثلاً:

> ''ان میں سے ایک ہی نوجوان بیٹی بھی تھی جو شہزادہ جاہریا کے عشق میں مبتلا تھی''۔ (۲۲۴)

اشفاق احمد محبت کے احساس کو ہر رشتے کی زینت بنانا چاہتے ہیں۔ اس لیے اپنے افسانے کا اختتام بھی اس بات پر کرتے ہیں۔ جب جوزف کی بیوی کیرولین بے وفائی کر جاتی ہے تو جوزف یہ تحقیق کرنے لگ جاتا ہے کہ ساہنی ترقی کے ساتھ وفا شناسی کیسے برقرار رہی جاہڑہ کی بستی میں اور اب ایسا کیسے ڈھونڈا اور قائم رکھا جا سکتا ہے۔

اخلاقی برائیاں جو کسی بھی انسان کی فطرت کا حصہ بن جاتی ہے۔ نہ صرف خود اس کے لیے بلکہ اردگرد کے ماحول پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی بھی اخلاق سے گری ہوئی بات یا جز کو فوری طور پر جڑ سے ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ اس سے اور اور برائیاں جنم لیتی ہیں۔ اور اس کی ابتداء بے جا خواہشات ہوتی ہے۔ اشفاق احمد اپنے افسانے ''قلارے'' میں اسی بات کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جب کسی ایک خواہش کی ڈبیا کھلتی ہے تو اس کے ساتھ دوسری خواہشات کی ڈبیاں بھی آپ سے آپ کھل جاتی ہیں...... جونہی شیطان کے لائٹر کا کوندا ایک خواہش کو اگنائٹ کرتا ہے تو دوسری ساری ڈبیاں بھی ایک ساتھ بھڑک اٹھتی ہیں: کام، کرودھ، غصہ، شہوت، لالچ، موہ، جاہ، تکبر، اہنکار سب بھڑ بھڑ کر کے ایک ساتھ جلنے لگتے ہیں''۔(۲۲۵)

اشفاق احمد جہاں ان اخلاقی برائیوں اوران کی وجوہات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ وہاں ان کے ممکنہ حل کی جانب بھی توجہ مبذول کرواتے ہیں۔مثلاً غرور اور تکبر ہمیشہ سے انسان کی تباہی کا باعث رہے ہیں اور انسان ہمیشہ ان کا شکار ہو کر انفرادی اور اجتماعی تباہی کا شکار ہوتا رہا ہے۔اس افسانے میں اشفاق احمد یہ بتاتے ہیں کہ ان برائیوں سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور شیطان جو روز اول سے ہی انسان کا دشمن اور اس پر حکمرانی کرتا رہا ہے۔اس کے اثر سے کیسے نکلا جا سکتا ہے۔''قلارے'' میں اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ

''اور جس مقام پر تکبر اور گھمنڈ نہ ہو، وہاں شیطان کا حکم نہیں چلتا...... وجہ یہ ہے کہ شیطان کا وجود کبر سے تخلیق کیا گیا ہے۔اب جس خطے یا منطقے میں غرور، تکبر، گھمنڈ یا ابھیمان نہیں ہوگا وہاں شیطان داخل ہو ہی نہیں سکے گا''۔(۲۲۶)

یعنی اگر ہم غرور، تکبر، ابھیمان کو ترک کر دیں تو شیطان کے اثر سے نکل سکیں گے۔ اور شیطان ہمیں ہماری اپنی خواہشات میں پھنسا کر، شکار کر لیتا ہے۔اس کے پاس صرف یہ ہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ انسان کو اپنے جال میں پھانس لیتا ہے اور یوں شیطان، انسان کو اپنے بس میں کر کے اس کے اخلاق کو تباہ کر ڈالتا ہے۔اشفاق احمد ان ہی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے بھر پور کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

اشفاق احمد نے ''بدنی ضرورت'' میں اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ دو میاں بیوی کے درمیان روپے، پیسے ہی صرف رشتہ بنائے رکھنے کے لیے کافی نہیں ہوتے بلکہ محبت ہو تو روپے پیسے کی بھی قدر ہوتی ہے۔اور نہ صرف اس رشتے میں بلکہ ساری دنیا میں روپیہ پیسہ اہم ضرور ہے لیکن صرف اس کے بل پر رشتے قائم نہیں رہ سکتے، یا تمام ضروریات روپے پیسے سے پوری نہیں ہوتیں بلکہ محبت ہی وہ واحد شے ہے جس پر دنیا قائم ہے۔موجودہ افسانے میں جب رضیہ اور صدیق میں دوری آئی تو صدیق نے روپے پیسے کی کوئی کمی نہ آنے دی تھی اس کے باوجود رضیہ کو غصہ تھا کیونکہ محبت کی کمی تھی جو رضیہ کو کھل رہی

تھی اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ

''وہ اسی طرح سے آتا رہا، جاتا رہا اور باقاعدگی سے رضیہ کو پیسے دیتا رہا۔لیکن اس دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا......عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے کھانا پینا بھی تو ہوتا ہے۔ اکٹھے مل بیٹھنا بھی تو ہوتا ہے۔ بااعتباری بھی تو ایک چیز ہے۔صبح کے بھولے کا شام کو گھر آ جانا بھی تو خوشی عطا کرتا ہے''۔(۲۲۷)

یہی وجہ ہے کہ جب محبت کا رشتہ قائم نہ رہا تو کوئی بھی قدر مشترک نہیں رہی اور دلوں سے عزت، محبت، خلوص، قدر، وفا سب کچھ ختم ہوا اور انجام موت ہوا، جب رضیہ اور صدیق کا آپسی ملاپ ختم ہو گیا، مل بیٹھنے کا سلسلہ رک گیا، ساتھ کھانے پینا نہ رہا تو کچھ بھی نہ رہا اس بارے میں اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''اب رضیہ اور صدیق کے بدنوں کے درمیان وہ پہلے والی گہما گہمیاں، آوا جادیاں، ہنگامہ خیزیاں اور ریشہ دوانیاں باقی نہیں رہی تھیں۔ بیمار محبت کے مریض کچے دھاگوں کو پہاڑوں، دریاؤں، چشموں اور ندی نالوں کی صحت افزا ہواؤں نے کاٹ کے رکھ دیا تھا اور دو محبت کرنے والے بدنوں کے درمیان قدر مشترک کا ایک بھی رشتہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس ظلم، بے وفائی، ناقدری، حق تلفی اور ناانصافی کے خلاف تین فائر ہوئے اور بے بس اور بے اختیار رضیہ کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا''۔(۲۲۸)

اور یوں زندگی موت کا شکار ہو گئی محبت مٹ گئی، جزا سزا بن گئی کیونکہ رابطہ کم ہونے کی وجہ سے خلوص ختم ہو گیا اور رشتوں کا احترام بھی باقی نہ رہ سکا۔

''بولتا بندر'' میں اشفاق احمد اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ معاشرے میں جب کوئی برائی پہلی بار نہیں روکی جاتی تو وہ برائی پھر معاشرے میں ناسور کی طرح پھیل جاتی ہے اور اس کا سد باب کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔مثلاً رشوت کی طرح مری میں کیسے پڑی اس کے بارے میں یوں لکھتے ہیں کہ:

''لیڈی مارک نے کہا ''تم اوپر نیچے، دائیں بائیں ہوا میں گولیاں چلاتے رہا کرو اور اونچے اونچے للکارتے رہا کرو، تمہارا ایمونیشن ختم ہوتا رہے گا۔ پھر میں کیپٹن کو بھی بنگلے پر بلوا کر صاحب سے حکم کروا دوں گی، وہ تم کو نہیں پوچھے گا'' یہ کہہ کر لیڈی صاحبہ نے ہر سپاہی کو چاندی کے دو، دو روپے نذرانے کے طور پر دیے اور یوں مری کے علاقے میں پہلی مرتبہ رشوت کی بنیاد پڑی''۔(۲۲۹)

درج بالا پیرا گراف میں رشوت اور سفارش دونوں موجود ہیں اور ان کے اثرات بھی آج معاشرے میں واضح ہیں۔ گو کہ افسانے میں آگے چل کر لیڈی مارک نے تدبر سے کام لیا اور گیدڑوں کی نسل بندی کے ذریعے ان کا خاتمہ کر کے انسانوں کو نجات دلائی لیکن مری میں رشوت اور سفارش جیسی بدترین اخلاقی برائیوں کی بنیاد تو پڑ گئی اس لیے برائی کو فوراً ہی ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ایسی کوئی بری بات کرنے سے پہلے اس کے دور رس نتائج کی طرف توجہ ضرور کرنی چاہئے۔

اشفاق احمد ''کوٹ ودو پاور ہاؤس'' میں انسان کی مثبت سوچ، فکر اور رویے کی طاقت کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں۔ یہ مثبت رویے نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی توانائی کا باعث بنتے ہیں اور اگر یہ مزاج مسلسل رہے تو انسان ہر کام کر سکتا ہے اور کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور توانائی کے سوتے اندر اور باہر ہر جگہ سے پھوٹ سکتے ہیں اور اس سے فائدہ ہی فائدہ ہوسکتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''ہر انسان کی اپنی ایک میگنیٹک فیلڈ ہوتی ہے جو اس کے وجود کے گرد کافی دور تک پھیلی رہتی ہے۔ اس فیلڈ میں اس کی سوچ، خوراک، صحت، عبادت، جنس، محبت، خلت، معاملہ فہمی اور معاملہ بندی اپنے اپنے الیکٹرونوں کی بندش کے مطابق اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ جب کسی زندہ گروہ میں یکساں مزاج، یکساں عمل اور کردار کا مظاہرہ ہوگا اور تسلسل کے ساتھ ہوگا تو اس کے اندر توانائی کے چھوٹے چھوٹے سوتے نمودار ہونے لگیں گے''۔ (۲۳۰)

ان ہی توانائی کے سوتوں سے فائدہ اٹھا کر رضوان انجینئر کوٹ ودو میں ایک بڑا بجلی گھر بنا لیتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں محبت ایسی بڑی طاقت ہے کہ اس سے ہر طرح کی توانائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ مثلاً:

> ''انجینئر رضوان نے کوٹ ودو کی ہوا، فضا، شفا، مزاج اور طبیعت اور گاؤں والوں کی اجتماعی سرشت اور کوٹ ودو کے جغرافیائی سبھاؤ سے فائدہ اٹھا کر وہاں ایک اتھیریئل پاور ہاؤس قائم کر دیا جو لوگوں کی آپسی محبت کے جنریٹ ہونے سے بجلی پیدا کرتا تھا''۔ (۲۳۱)

یہی وجہ ہے کہ جب محبت، اتفاق اور خلوص کی بنیاد پر رشتے قائم ہوں تو منفی رویے اور اقدار اپنے آپ بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اور منفی عادتوں پر مثبت عادتیں غالب آجاتی ہیں۔ جیسے کہ کوٹ ودو کی مثبت اور محبت بھری فضا میں بیاہ پر آنے والی لڑکی کی تمکنت، غصہ، تکبر، انا خود بخود گھل کر مٹی ہو جاتی ہے۔ اور وہ ویسی ہی محبت کرنے والی لڑکی بن جاتی ہے جیسی اس

قصبے کی دوسری لڑکیاں ہیں۔اشفاق احمد کے نزدیک ہم اپنی بہت سی چھوٹی چھوٹی عادتوں کوتبدیل کر کے بڑی بڑی تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔اورایک دوسرے کے لیےخوشیوں کا باعث بن سکتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''......اور ہم کو ہر وقت اپنے خالق کا شکریہ ادا کرتے رہنا چاہیےلیکن دوستوں سے ملنا،عزیزوں رشتہ داروں کی تکریم کرنا اور صلہ رحمی ادا کرنا بھی عبادت ہے۔آج کی رات خوشیوں کی اورمہربانیوں کی رات ہے۔اس لیے ہم ایک دوسرے کے درمیان خوشیاں تقسیم کریں گے اور مہربانیوں کی پھوار سے ایک دوسرے کوبھگو کر ٹھنڈک سے مال مال کر دیں گے''۔(۲۳۲)

اس طرح رب کا شکر ادا کرنے اور اپنے ہم جنسوں سے محبت کا رشتہ قائم کرنے سے پریشانیاں خود بخود ختم ہو جاتیں ہیں۔

ح۔ دیگر افسانے

اشفاق احمد نے اپنے افسانے ''نئے رفیق نئے راستے'' میں عورت کی نفسیات اور معاشرے کی طرف سے اس پر عائد اخلاقی اور سماجی ذمہ داریوں کے بارے میں بتایا ہے کہ عورت جب بچے کی ماں بن جاتی ہے تو پھر وہی اس کی محبت کا مرکز اور محور بن جاتا ہے اور پھر چاہے کچھ بھی ہو جائے اسے بہکایا نہیں جا سکتا۔اگر ''عذرا'' کے کردار کو ایک عورت نہیں ''انسان'' کے روپ میں لیا جائے تو بھی یہ بات واضح ہوتی ہے رشتوں میں خیانت نہ کرنے والے کسی بھی صورت میں راہ سے بھٹکتے نہیں ہیں۔

اشفاق احمد اس افسانے میں مرد اور عورت کی نفسیات کوبھی بیان کرتے ہیں۔مثلاً:

''مرد آخر عمر تک جذباتی رہتے ہیں اور عورتیں قدم قدم پر رنگ بدلتی رہتی ہیں۔''(۲۳۳)

اشفاق احمد محبت میں دلیری اور بہادری کو بھی ایک صفت یا پہچان کی صورت سمجھتے ہیں۔ان کے خیال میں جو محبت ڈر جاتی ہے وہ محبت نہیں ہوتی۔وہ کہتے ہیں کہ:

''مفلوج اور مریض محبت کو ہمیشہ سمبل کی ضرورت رہتی ہے اور اب...........''(۲۳۴)

اشفاق احمد افسانے میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایک عورت جب تک اپنے ماضی سے الگ نہیں ہوتی اپنا گھر نہیں بسا سکتی۔ملاحظہ فرمائیے:

''اورتم نے ڈولی میں بیٹھتے ہی پرانی یادوں کوحرفِ غلط کی طرح مٹا دیا!''

''بالکل۔ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا، ورنہ میں اپنے خاوند کے ساتھ انصاف نہ کرسکتی۔''(۲۳۵)

اشفاق احمداس افسانے کے ذریعے معاشرے میں ان تمام افراد کے سامنے ایک ایسا منظر پیش کرتے ہیں جس میں ماضی کے دومحبت کرنے والے شادی کے بعد ایک دوسرے سے باتیں کررہے ہیں۔قارئین کو یہ سمجھنا ہے کہ مذہبی، اخلاقی، سماجی اور معاشرتی کیا فرائض، ذمہ داریاں اور پابندیاں عائد ہوتی ہیں اورانہیں کس کس احسن طریقے سے کس طرح نبھایا جا سکتا ہے اورخصوصی طور پر شادی شدہ افراد کو یہ تلقین کی ہے۔شادی شدہ زندگی میں قدم رکھتے ہی پرانی یادوں کو دفن کرنا ہی بہتر ہے۔موجودہ معاشرے میں ترقی کے ساتھ شادی شدہ افراد کے جھگڑے، تنازعات اور محبتیں عام ہورہی ہیں۔ایسے میں عذرا کا کردار کئی عذراؤں اوراسلم کے لیےسودمند ثابت ہوسکتا ہے۔

اشفاق احمد''بدی بلی'' میں نہ صرف بدی کے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ آئندہ نسلوں تک اس کے اثرات لے کر جاتے ہیں۔لیکن اس کا ہرگز مطلب نہیں ہے کہ وہ ادب کو واعظ کی شکل میں قارئین کے قالب میں ڈھال رہے ہیں۔وہ برے کام کا برا نتیجہ دکھا کر قارئین کو بدی سے باز رہنے کی کوشش کررہے ہیں۔لیکن اس سے ہرگز یہ مرادنہیں ہے کہ اگر ایک نسل بدی کا شکار ہوتی ہےتو آنے والی نسلیں اس کا قرض چکاتی رہیں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے اور بائبل مقدس میں بنی نوع انسان کے لیے خدا کا ایک وعدہ بھی ہے۔ملاحظہ فرمائیے:

''ان ایام میں پھر یوں نہ کہیں گے کہ باپ دادا نے کچے انگور کھائے اور اولاد کے دانت کھٹے ہو گئے۔ کیونکہ ہرایک اپنی ہی بدکرداری کے سبب سے مرے گا ہرایک جو کچے انگور کھاتا ہےاسی کے دانت کھٹے ہوں گے۔''(۲۳۶)

پس یہ ڈراورخوف دماغ سے نکال دینے چاہئیں کہ ہمیں اپنے باپ دادا کے گناہوں کی سزا ملے گی۔

اشفاق احمد کا مقصد معاشرتی اصلاح ہے۔اس لیے وہ مختلف صورتوں میں بدی، برائی، گناہ سے بچنے کے راتے بتاتے رہتے ہیں۔اسی افسانے میں وہ انسان کو کام، کرودھ اورلوبھ سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''کلارا! کام کرودھ اورلوبھ آتما کے جانی دشمنی ہیں اور یہی تین نرک کے دروازے ہیں اوران میں کام سب سے بڑا دروازہ ہے۔انڈین فلاسفی میں کام کا مطلب ڈیزائر ہے...... یہ کام ہی کرودھ اورلوبھ کی

بنیاد ہے۔'' (۲۳۷)

اشفاق احمد ہر اس شے سے اپنے قاری کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کو دین و دنیا میں رسوا کر دے۔ خیر و شر کے تمام نتائج قارئین کے سامنے رکھنے کا مقصد ہی انہیں یہ آگاہی دینا ہے کہ نیکی کی طرف مائل ہوں۔

اشفاق احمد ''جیون جوت'' میں بتاتے ہیں کہ رشوت، چور بازاری، دھوکا دہی، جھوٹ، فریب، مکاری یہی وہ دیمک ہے جو معاشرتی خوشحالی کی دشمن ہے۔ امام دین نے آنکھیں ملنے کے بعد کوئی محکمہ یا ادارہ نہیں چھوڑا جہاں وہ نوکری کے لیے نہ گیا ہو لیکن ہر جگہ سے نہ ہی ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ نیلم کے ابا وجیہہ الدین صاحب کے پاس بھی گیا۔ اشفاق احمد امام دین کی حالت بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''اور اس دن تو امام دین کی کمر ہی ٹوٹ گئی جب وجیہہ الدین صاحب نے اسے ایک سو روپے دے کر اپنی لیبارٹری میں ملازم رکھنے سے انکار کر دیا۔'' (۲۳۸)

اس ساری صورت حال نے امام دین کو بوکھلا کر رکھ دیا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر وہ کس حالت میں بہتر تھا۔ بینائی نے اسے ٹھوکروں کے ساتھ ساتھ فکر اور پریشانی بھی عطا کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جو کبھی آہٹوں کو سمجھ لیا کرتا تھا۔ قدموں کی چاپ سے پہچان لیا کرتا تھا اسے نیالو کے آنے کی خبر نہ ہو سکی تو نیالو کہتی ہے کہ:

''اندھے تھے تو آسانی سے پہچان لیتے تھے اب سگوں سوچاں میں پڑ گئے۔'' (۲۳۹)

اور یوں امام دین اپنی آنکھوں سے مایوس ہو کر ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا ہے اور لڑتا ہے کہ اسے بینائی کیوں دی اور وہ اونچے اونچے للکار کر کہتا ہے کہ:

''اوئے یہ اس لیے لگا کر دی تھیں کہ جگہ جگہ ٹھوکریں کھانے میں آسانی رہے اور منکروں کے متھے لگنے میں کوئی غلطی نہ لگے۔ آجا اوئے لے لے واپس۔'' (۲۴۰)

اشفاق احمد کے نزدیک گداگری کو عام کرنے والے ہم ہی لوگ ہیں جو امام دین کو تو ٹھوکر مار کر گرا دینا چاہتے ہیں لیکن حافظ امام دین کے لیے ہر طرح کی مدد کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کے آخر میں امام دین تنگ آ کر اپنی آنکھیں ہی واپس کرنے چل پڑتا ہے کیونکہ بینائی کے بعد اسے ہر جگہ سے آنسو، آہیں اور ٹھوکریں ہی ملیں۔ اشفاق احمد ان رویوں کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ صرف بیماری سے علاج ہی کافی نہیں بلکہ بعد میں

اس زندگی کی حفاظت بھی ہماری ذمہ داری ہے تا کہ صحت مند معاشرتی سوچ پیدا ہو سکے اور ہم بحیثیت قوم اجتماعی خوشحالی اور ترقی کی طرف بڑھ سکیں تا کہ نہ صرف آنکھوں کی روشنی سلامت رہے بلکہ زندگی میں بھی اندھیرا باقی نہ رہے تب ہی اس جیون کو جیون جوت کہا جا سکے گا۔

اشفاق احمد فلسفہ اخلاق کی اسی بنیاد پر معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں جہاں انسانوں اور جانوروں میں فرق بالکل واضح ہو اور حضرت انسان اللہ تعالیٰ کے نائب ہونے کے منصب پر پورا اتر سکے۔ نیکی اور بدی خیر اور شر میں امتیاز ہی کسی بھی معاشرے میں خوشحالی لا سکتا ہے اور امن اور سلامتی برقرار رکھ سکتا ہے اور انسان کو یہ شعور دینا ہی اشفاق احمد کا مقصد حیات رہا ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

حواشی

۱۔ The New Encyclopedia Britanica "volume:10, 15th Edition, Printed in U.S.A, 1997, Page:761

۲۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ''اردو کی ادبی تاریخ کا خاصا'' اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اول ۱۹۸۴، ص ۲۵

۳۔ Edger Allenpoe "Selection from Critically WriHings" Compiled by Arghur Robinson Quinn Alfred A knops Newyork Third Edition 1958, Pg958

۴۔ پروین اظہر، ڈاکٹر ''اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، طبع اول، ۲۰۰۰، ص ۱۳

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر ''مختصر افسانہ عہد بہ عہد'' مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۲، ص ۱۰

۶۔ راجندر سنگھ بیدی، ''افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل'' مشمولہ: ''اردو افسانہ روایت اور مسائل''، گوپی چند نارنگ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۲۵۔۲۶

۷۔ محمود ہاشمی ''تخلیقی افسانہ کا فن'' مشمولہ: ''اردو افسانہ روایت اور مسائل'' گوپی چند نارنگ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۴۵۸

۸۔ رام لعل ''اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا'' نئی دہلی، نریندر ناتھ سوز، ۱۹۸۵، ص ۴۷

۹۔ مرزا حامد بیگ، ''افسانے کا منظر نامہ'' الٰہ آباد، اردو رائٹرز گلڈ، ۱۹۸۳، ص ۱۹۸

۱۰۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر ''جدید اردو افسانے کے رجحانات'' کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰، ص ۲۳۳

۱۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر ''مختصر افسانے کا فن''، مشمولہ: ''نقوش، لاہور: ادارہ فروغ اردو، مرتبہ: محمد طفیل، ۱۹۸۲، ص ۱۰۰۴

۱۲۔ سعادت حسن منٹو، مشمولہ: ''نقوش'' افسانہ نمبر، سمپوزیم، ۱۹۵۵، ص ۴۶۸

۱۳۔ وقار عظیم، پروفیسر ''فن افسانہ نگاری''، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۱، ص ۸

۱۴۔ نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، ''اردو مختصر افسانہ ۱۹۴۷ کے بعد'' دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۶، ص ۱۴۶

۱۵۔ انتظار حسین ''اشفاق احمد'' مشمولہ: دنیا زاد، ترتیب و تالیف، آصف فرخی، اکتوبر ۲۰۰۴، ص ۲۶۲۔۲۶۱

۱۶۔ احمد ندیم قاسمی، ''اشفاق احمد'' مشمولہ: ''معاصر'' جلد ۲، شمارہ ۳، ۴، لاہور، ادارہ معاصر، دسمبر ۲۰۰۲، ص ۲۵۸

۱۷۔ وقار عظیم، ڈاکٹر، ''افسانہ نگاروں کی نئی پود'' مشمولہ: ''داستان سے افسانے تک'' لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۳۸۲

۱۸۔ محمد عالم خان، ڈاکٹر ''اردو افسانے میں رومانوی رجحانات، لاہور، علم و عرفان پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص ۴۷۸

۱۹۔ سید وقار عظیم، پروفیسر، ''نیا افسانہ'' علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰، ص ۲۸۴

۲۰۔ غلام حسین اظہر، ''اردو افسانہ پاکستان میں'' مشمولہ: اوراق (افسانہ انشائیہ نمبر) لاہور، ۱۹۷۲، ص ۴۴

۲۱۔ خالد حسین ''اشفاق احمد۔ چند یادیں'' مشمولہ: پوسٹ کارڈ واشنگٹن'' خبریں (روزنامہ) لاہور، ۱۵ دسمبر ۲۰۰۴

۲۲۔ جمیل الدین عالی ''اشفاق احمد کی وفات ادب کے لیے ایک سانحہ ہے'' جنگ (روزنامہ) لاہور، ۸ ستمبر ۲۰۰۴

۲۳۔ فرمان فتحپوری، ڈاکٹر ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار'' کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۲، ص ۱۷۷

۲۴۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، ''جدید افسانہ نگار'' مشمولہ: ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات'' لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰، ص ۵۱۱

۲۵۔ اشفاق احمد ''اپنا اپنا جنم'' مشمولہ: ''عرض مصنف'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶، ص ۱۸۷

۲۶۔ وقار عظیم، پروفیسر ''داستان سے افسانے تک'' مشمولہ: ''نقوش'' جلد دوم۔ افسانہ نمبر، س ن، ص ۹۹۱

۲۷۔ سید وقار عظیم، پروفیسر ''افسانہ نگاروں کی نئی پود، مشمولہ: ''داستان سے افسانے تک'' لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۳۸۲

۲۸۔ انور سدید، ڈاکٹر ''اشفاق احمد مجسم لطافتوں کا افسانہ نگار'' مشمولہ: ''اردو افسانے کی کروٹیں، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱، ص ۱۳۹

۲۹۔ محمد حمید شاہد ''اردو افسانہ: اہم نشانات'' مشمولہ: ''اردو افسانہ۔ صورت مغنی'' انتخاب و ترتیب: سین آفاقی، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۰۶، ص ۱۱۸

۳۰۔ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر ''اردو افسانہ آزادی کے بعد'' مشمولہ: ''اردو افسانے کی روایت ۱۹۹۰۔۱۹۹۳، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، دسمبر ۱۹۹۱، ص ۹۰

۳۱۔ انور سدید، ڈاکٹر ''اشفاق احمد۔ مجسم لطافتوں کا افسانہ نگار'' مشمولہ: ''اردو افسانے کی کروٹیں'' لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱، ص ۱۳۹

۳۲۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات'' لاہور، مکتبہ عالیہ ۱۹۹۰، ص ۵۱۱

۳۳۔ محمد عالم خان، ڈاکٹر، ''قیام پاکستان کے بعد چند نمایاں رجحانات''، مشمولہ: ''اردو افسانے میں رومانوی رجحانات'' لاہور، علم و عرفان پبلشرز، ۱۹۹۸، ص ۴۸۰

۳۴۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، ''اجلے پھول کا اجلا باطن'' مشمولہ: ''جنت نمائی'' لاہور، دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۵، ص ۱۰۰

۳۵۔ فرمان فتحپوری، ڈاکٹر ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار'' کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، جنوری ۱۹۸۲، ص ۳۷۸۔۳۷۷

۳۶۔ عبدالغفور شاہ قائم، ڈاکٹر ''پاکستان میں افسانہ نگاری'' مشمولہ ''پاکستانی ادب ۱۹۴۷ سے تا حال'' لاہور، معراج دین

پرنٹرز، ۱۹۹۵ء، ص ۸۳

۳۷۔ نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر ''اردو مختصر افسانہ۔فنی و تکنیکی مطالعہ۔۱۹۴۷ کے بعد'' لاہور، بک وائز، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴۶

۳۸۔ ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر ''جدید ادب کے دو تنقیدی جائزے'' مشمولہ ''ناقابل فراموش افسانے'' مرتبہ: ناصر زیدی لاہور، نواز پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۴ء، ص ۱۶۔۱۵

۳۹۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر ''پاکستانی ادب۔شناخت کی نصف صدی'' راولپنڈی، ریز پبلی کیشنز، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۷۔۲۲۶

۴۰۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر ''پاکستانی ادب۔شناخت کی نصف صدی'' راولپنڈی، ریز پبلی کیشنز، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۹

۴۱۔ ایضاً، ص ۷

۴۲۔ ایضاً، ص ۸

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۷

۴۵۔ اشفاق احمد، ''فہیم''، مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱

۴۶۔ اایضاً، ص ۲۴

۴۷۔ اشفاق احمد، ''رات بیت رہی ہے''، مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۳۵

۴۸۔ اشفاق احمد، ''تلاش''، مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۴۲

۴۹۔ ایضاً، ص ۴۲

۵۰۔ ایضاً، ص ۴۳

۵۱۔ ایضاً، ص ۳۷

۵۲۔ ایضاً، ص ۵۰

۵۳۔ اشفاق احمد، ''سنگ دل''، مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۵۲

۵۴۔ ایضاً، ص ۵۸

۵۵۔ ایضاً، ص ۶۴

۵۶۔ ایضاً، ص ۶۴

۵۷۔ اشفاق احمد، ''شب خون''، مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۸۷

۵۸۔ ایضاً، ص ۹۳

۵۹۔ اشفاق احمد، ''عجیب بادشاہ''، مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۰

۶۰۔ اشفاق احمد، ''بندرابن کی کنج گلی میں''، مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۰

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۶۲۔ ایضاً، صص ۱۳۳

۶۳۔ اشفاق احمد، ''بابا''، مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۵

۶۴۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۶۷۔ اشفاق احمد، ''پناہیں''، مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۶۵

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۶۸

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۷۱۔ اشفاق احمد، ''امی''، مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۷۸

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۷۵۔ اشفاق احمد، ''گڈریا''، مشمولہ: ''گڈریا۔ اُجلے پھول'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵

۷۶۔ ایضاً، ص ۱۳

۷۷۔ ایضاً، ص ۲۷

۷۸۔ ایضاً، ص ۱۷

۷۹۔ اشفاق احمد، ''گل ٹریا''، مشمولہ: ''گڈریا۔ اُجلے پھول'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۶۰

۸۰۔ اشفاق احمد، ''تنکہ''، مشمولہ: ''گڈریا۔ اُجلے پھول'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۶۲

۸۱۔ ایضاً، ص ۶۶

۸۲۔ ایضاً، ص ۷۰

۸۳۔ ایضاً،ص۷۳

۸۴۔ اشفاق احمد،''حقیقت نیوش''،مشمولہ:''گڈریا۔اُجلے پھول''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۸۳

۸۵۔ ایضاً،ص۸۷

۸۶۔ ایضاً،ص۸۹

۸۷۔ اشفاق احمد،''توشے بلے''،مشمولہ:''گڈریا۔اُجلے پھول'' لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۹۶

۸۸۔ ایضاً،ص۹۶

۸۹۔ ایضاً،ص۹۷

۹۰۔ اشفاق احمد،''صفدر ٹھیلا''،مشمولہ:''گڈریا۔اُجلے پھول''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۱۰۱

۹۱۔ ایضاً،ص۱۰۶

۹۲۔ ایضاً،ص۱۰۷

۹۳۔ اشفاق احمد،''اُجلے پھول''،مشمولہ:''گڈریا۔اُجلے پھول'' لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۱۲۰

۹۴۔ ایضاً،ص۱۲۰

۹۵۔ ایضاً،ص۱۲۰

۹۶۔ ایضاً،ص۱۲۰

۹۷۔ ایضاً،ص۱۱۵

۹۸۔ اشفاق احمد،''برکھا''،مشمولہ:''گڈریا۔اُجلے پھول''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۱۳۱

۹۹۔ ایضاً،ص۱۳۲

۱۰۰۔ اشفاق احمد،''ایل ویرا''،مشمولہ:''گڈریا۔اُجلے پھول'' لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۱۴۳

۱۰۱۔ ایضاً،ص۱۵۹

۱۰۲۔ ایضاً،ص۱۵۹

۱۰۳۔ اشفاق احمد،''اٹوٹ مان''،مشمولہ:''سفر مینا''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۱۴۷

۱۰۴۔ اشفاق احمد،''قاتل''،مشمولہ:''سفر مینا''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۱۵۸

۱۰۵۔ ایضاً،ص۱۶۲

۲۰۶۔ اشفاق احمد،''قصہ نل دمینتی''،مشمولہ:''سفر مینا''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۱۷۲

۱۰۷۔ ایضاً،ص۱۷۳

۱۰۸۔ اشفاق احمد، ''چور''، مشمولہ: ''سفر مینا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۷۸

۱۰۹۔ ایضاً،ص۱۸۰

۱۱۰۔ ایضاً،ص۱۸۱

۱۱۱۔ اشفاق احمد، ''بیاجاناں''، مشمولہ: ''سفر مینا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۲۰۱

۱۱۲۔ ایضاً،ص۲۰۳

۱۱۳۔ ایضاً،ص۲۰۵

۱۱۴۔ اشفاق احمد، ''محسن محلّہ''، مشمولہ: ''سفر مینا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۲۱۶

۱۱۵۔ ایضاً،ص۲۱۶

۱۱۶۔ اشفاق احمد، ''پانچ میل دور''، مشمولہ: ''سفر مینا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۲۱۷

۱۱۷۔ ایضاً،ص۲۲۰

۱۱۸۔ اشفاق احمد، ''گاتو''، مشمولہ: ''سفر مینا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۲۵۲

۱۱۹۔ ایضاً،ص۲۵۲

۱۲۰۔ ایضاً،ص۲۴۶

۱۲۱۔ اشفاق احمد، ''فل برائٹ''، مشمولہ: ''سفر مینا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۲۶۲

۱۲۲۔ اشفاق احمد، ''رکی ہوئی عمر''، مشمولہ: ''ایک ہی بولی'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص۱۵

۱۲۳۔ اشفاق احمد، ''ایک ہی بولی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص۲۳

۱۲۴۔ ایضاً،ص۲۳

۱۲۵۔ ایضاً،ص۲۳

۱۲۶۔ اشفاق احمد، ''سلامتے کی مار'' مشمولہ: ''ایک ہی بولی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص۳۲

۱۲۷۔ ایضاً،ص۳۳

۱۲۸۔ ایضاً،ص۳۴

۱۲۹۔ ایضاً،ص۳۴

۱۳۰۔ ایضاً،ص۳۵

۱۳۱۔ اشفاق احمد، ''چل چلی''مشمولہ: ''ایک ہی بولی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۸

۱۳۲۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۳۳۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۳۴۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۳۵۔ اشفاق احمد، ''ڈھچک چال''مشمولہ: ''ایک ہی بولی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۶۰

۱۳۶۔ اشفاق احمد، ''رشوت''مشمولہ: ''ایک ہی بولی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۷۱

۱۳۷۔ ایضاً، ص ۷۲

۱۳۸۔ ایضاً، ص ۷۳

۱۳۹۔ اشفاق احمد، ''ننگ ناموس''مشمولہ: ''ایک ہی بولی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۸۷

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۸۸

۱۴۱۔ ایضاً، ص ۸۸

۱۴۲۔ اشفاق احمد، ''بچھیری''مشمولہ: ''ایک ہی بولی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۸۹

۱۴۳۔ ایضاً، ص ۹۱

۱۴۴۔ ایضاً، ص ۸۳

۱۴۵۔ اشفاق احمد، ''بچھمن کہانی''مشمولہ: ''ایک ہی بولی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۰۶

۱۴۶۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۱۴۷۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۱۴۸۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۱۴۹۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۱۵۰۔ اشفاق احمد، ''سردار بیگم''، مشمولہ: ''صبحانے افسانے''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۹

۱۵۱۔ ایضاً، ص ۱۲،۱۳

۱۵۲۔ اشفاق احمد، ''خود بدولت''، مشمولہ: ''صبحانے افسانے''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵

۱۵۳۔ ایضاً، ص ۵۲

۱۵۴۔ اشفاق احمد، ''آڑھت منڈی''، مشمولہ: ''صبحانے افسانے''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۴۱

۱۵۵۔ ایضاً،ص۳۶

۱۵۶۔ ایضاً،ص۶۶

۱۵۷۔ اشفاق احمد، ''بٹیر باز''، مشمولہ: ''صبحانے افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۴۷

۱۵۸۔ ایضاً،ص۸۷

۱۵۹۔ اشفاق احمد، ''ماسٹر روشی''، مشمولہ: ''صبحانے افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۴۹

۱۶۰۔ ایضاً،ص۸۹

۱۶۱۔ ایضاً،ص۳۴

۱۶۲۔ ایضاً،ص۱۰۷

۱۶۳۔ اشفاق احمد، ''خانگی سیاست''، مشمولہ: ''صبحانے افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۱۰

۱۶۴۔ ایضاً،ص۱۱۷

۱۶۵۔ اشفاق احمد، ''مسرور مرثیہ''، مشمولہ: ''صبحانے افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۲۸

۱۶۶۔ ایضاً،ص۱۲۸

۱۶۷۔ ایضاً،ص۱۳۵

۱۶۸۔ ایضاً،ص۱۳۹

۱۶۹۔ اشفاق احمد، ''شازیہ کی رخصتی''، مشمولہ: ''صبحانے افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۴۵

۱۷۰۔ ایضاً،ص۱۴۵

۱۷۱۔ ایضاً،ص۱۴۶

۱۷۲۔ ایضاً،ص۱۴۷

۱۷۳۔ ایضاً،ص۱۴۸

۱۷۴۔ ایضاً،ص۱۵۰

۱۷۵۔ اشفاق احمد، ''بے غیرت مدت خان''، مشمولہ: ''صبحانے افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۵۴

۱۷۶۔ ایضاً،ص۱۵۷

۱۷۷۔ ایضاً،ص۱۵۸

۱۷۸۔ ایضاً،ص۱۵۸

۱۷۹۔ ایضاً،ص۱۵۸

۱۸۰۔ ایضاً،ص۱۶۴

۱۸۱۔ ایضاً،ص۱۶۶

۱۸۲۔ ایضاً،ص۱۶۶

۱۸۳۔ ایضاً،ص۱۶۷

۱۸۴۔ ایضاً،ص۱۶۱

۱۸۵۔ اشفاق احمد،''بندرلوگ''،مشمولہ:''صبحانے افسانے''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۱۷۵۔۱۷۴

۱۸۶۔ ایضاً،ص۱۷۶۔۱۷۶

۱۸۷۔ اشفاق احمد،''ڈھور ڈنگر کی واپسی''،مشمولہ:''صبحانے افسانے''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۱۳۸

۱۸۸۔ ایضاً،ص۱۴۸

۱۸۹۔ ایضاً،ص۱۹۰

۱۹۰۔ ایضاً،ص۱۹۱

۱۹۱۔ ایضاً،ص۱۵۸

۱۹۲۔ اشفاق احمد،''پل صراط اور پاسپورٹ''،مشمولہ:''صبحانے افسانے''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۲۱۲

۱۹۳۔ ایضاً،ص۲۱۳

۱۹۴۔ ایضاً،ص۲۱۳

۱۹۵۔ اشفاق احمد،''وکھو۔وکھ''،مشمولہ:''صبحانے افسانے''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۲۲۲

۱۹۶۔ اشفاق احمد،''قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا''،مشمولہ:''صبحانے افسانے''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۲۳۹

۱۹۷۔ا ایضاً،ص۲۳۰

۱۹۸۔ ایضاً،ص۲۳۱

۱۹۹۔ اشفاق احمد،''مہمان عزیز''،مشمولہ:''صبحانے افسانے''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۲۳۹

۲۰۰۔ ایضاً،ص۲۴۱

۲۰۱۔ اشفاق احمد،''بیک گراؤنڈ''،مشمولہ:''صبحانے افسانے''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۶ء،ص۲۴۹۔۲۴۸

۲۰۲۔ ایضاً،ص۲۴۹

۲۰۳۔ اشفاق احمد،''زرناب گل''،مشمولہ:''صبحانے افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء،ص ۲۵۳

۲۰۴۔ ایضاً،ص ۲۵۵

۲۰۵۔ ایضاً،ص ۲۵۶

۲۰۶۔ اشفاق احمد،''دم بخود''،مشمولہ:''صبحانے افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء،ص ۲۶۲

۲۰۷۔ ایضاً،ص ۲۶۳

۲۰۸۔ اشفاق احمد،''بدلی سے بدلی تک''،مشمولہ:''صبحانے افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء،ص ۲۷۰

۲۰۹۔ اشفاق احمد،''سہیل کی سالگرہ''،مشمولہ:''صبحانے افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء،ص ۲۷۷

۲۱۰۔ ایضاً،ص ۲۷۷

۲۱۱۔ ایضاً،ص ۲۷۹

۲۱۲۔ ایضاً،ص ۲۷۹

۲۱۳۔ اشفاق احمد،''ملک مروت''،مشمولہ:''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء،ص ۲۷

۲۱۳۔ ایضاً،ص ۳۰

۲۱۴۔ ایضاً،ص ۳۱

۲۱۵۔ اشفاق احمد،''چھ چھکا بتیس''،مشمولہ:''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء،ص ۴۶

۲۱۶۔ ایضاً،ص ۴۶

۲۱۷۔ ایضاً،ص ۴۷

۲۱۸۔ اشفاق احمد،''سعید جونیئر''،مشمولہ:''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء،ص ۵۸

۲۱۹۔ اشفاق احمد،''آخری حملہ''،مشمولہ:''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء،ص ۶۰

۲۲۰۔ اشفاق احمد،''کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ''،مشمولہ:''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء،ص ۶۹

۲۲۱۔ اشفاق احمد،''پوری جان کاری''،مشمولہ:''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء،ص ۷۹

۲۲۳۔ ایضاً،ص ۸۱

۲۲۴۔ ایضاً،ص ۸۱

۲۲۵۔ اشفاق احمد،''قلارے''،مشمولہ:''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء،ص ۹۶

۲۲۶۔ ایضاً،ص ۹۶

۲۲۷۔ اشفاق احمد، ''بدنی ضرورت''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص۱۰۶

۲۲۸۔ ایضاً، ص۱۱۰

۲۲۹۔ اشفاق احمد، ''بولتا بندر''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص۱۱۴

۲۳۰۔ اشفاق احمد، ''کوٹ ودو پاور ہاؤس''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص۱۴۸۔۱۴۷

۲۳۱۔ ایضاً، ص۱۴۹

۲۳۲۔ ایضاً، ص۱۵۳

۲۳۳۔ اشفاق احمد، ''نئے رفیق نئے راستے''، مشمولہ: ''صحیفہ۳'' لاہور، مجلس ترقی اردو، دسمبر ۱۹۵۷ء، ص۱۵۰

۲۳۴۔ ایضاً، ص۱۵۵

۲۳۵۔ ایضاً، ص۱۵۰

۲۳۶۔ یرمیاہ، ۳۱ باب ۳۰۔۲۹

۲۳۷۔ اشفاق احمد، بدی بلی، مشمولہ: ''ادبیات'' سہ ماہی، جلد ۷، شمارہ ۳۷، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۴ء، ص۱۲

۲۳۸۔ اشفاق احمد ''جیون جوت'' مشمولہ: ''ہجرتوں کے درمیان'' بانو قدسیہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص۱۳۲

۲۳۹۔ ایضاً، ص۱۳۳

۲۴۰۔ ایضاً، ص۱۳۴

باب پنجم

اشفاق احمد کے افسانے اور مثالی معاشرہ

ا۔ ہمارا معاشرہ

ب۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں موجودہ معاشرہ

ج۔ اشفاق احمد کا مثالی معاشرہ

ا۔ ہمارا معاشرہ

معاشرتی انتظام کے لیے سب کو مل جل کر کوشش کرنی چاہیے کیونکہ یہ فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہے۔

''معاشرتی ترقی کے لیے سب سے بڑی اور بنیادی ضرورت معاشرہ میں ہم آہنگی کا ہونا ہے۔ کسی معاشرے کی ترقی سے مراد صرف مادی مسائل کا وافر مقدار میں ہونا نہیں بلکہ اصل معاشرتی ترقی مادی ضرورتوں کے پورا ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف گروہوں میں ہم آہنگی کا ہونا بھی ہے۔''(۱)

معاشرتی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ تمام افراد اجتماعی خوشحالی کے لیے کوشاں رہیں۔ کیونکہ کوئی بھی شخص تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ فرد اور معاشرہ لازم وملزوم ہیں۔ مثلاً:

''فرد اور معاشرہ باہم لازم وملزوم ہیں۔ معاشرہ افراد کے بغیر تشکیل نہیں پا سکتا اور فرد معاشرے سے کٹ کر ایک بےحقیقت اکائی رہ جاتا ہے۔''(۲)

معاشرہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی ''آپس میں مل جل کر رہنا یا اکٹھے زندگی بسر کرنا کے ہیں'' جبکہ انگلش لفظ Society لاطینی زبان کے لفظ (Society) لاطینی زبان کے لفظ (Socius) سے نکلا ہے جس کے معنی ''ساتھی'' کے ہیں۔ گویا ساتھیوں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنے کا نام معاشرہ ہے۔ اردو انسائیکلو پیڈیا میں معاشرہ کی وضاحت اس طرح سے کی گئی ہے کہ:

''معاشرہ (Society) کثیر التعداد بنی نوع انسان کی وہ جماعتی زندگی جس میں ہر فرد کو رہنے، سہنے اور اپنی ترقی، حصول مقصد اور فلاح و بقا کے لیے دوسروں سے سابقہ پڑتا ہے اور جس ماحول سے کسی فرد بشر کو مفر نہیں معاشرہ کہلاتا ہے۔ اس میں ہر فرد واحد اپنی اپنی جگہ اسی گروہ، جماعت یا معاشرہ کا جز اور حصہ ہوتا ہے، کیونکہ اسے اپنی ضروریات زندگی کے لیے دوسرے لوگوں یعنی معاشرہ سے وابستہ رہنا پڑتا ہے چنانچہ معاشرہ قدرت کا تشکیل کردہ ہوتا ہے۔ وہ کسی خاص گروہ کے کسی محدود مقصد کی ایجاد نہیں ہوتا بلکہ دنیا میں دور دراز علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے باہمی روابط اور اختلاط پر استوار ہوتا ہے۔''(۳)

یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مل جل کر زندگی بسر کرنا ہے۔ اصطلاح میں اس کے معنی لوگوں کا وہ گروہ ہے

جوکسی مشترکہ نصب العین کی خاطر وجود میں آیا ہو۔

کیمبرج ڈکشنری آف سوشیالوجی کے مطابق:

Human beings are social animals and organize their activities in groups, The term "Society" is used to describe a level of organization of group that is relatively self-contained".(۴)

بلیک ویل ڈکشنری کے مطابق:

Society: Probably the most frequent use of word today is in reference to the totality of human beings, on earth to gether with their culture, institutions, skills, ideas and values".(۵)

آکسفورڈ ڈکشنری آف سوشیالوجی کے مطابق:

Society generally a group of people who share a common culture occupy a particular territorial area and feel themselves to constitute a unified and distinctenity".(۶)

گویا افراد کے باہمی تعلقات کا سلسلہ معاشرہ کہلاتا ہے۔ معاشرہ افراد کا ایسا گروہ ہوتا ہے جومشترکہ مفادات اور مقاصد کے حصول کے لیے باہمی اتحاد اور تعاون کے ساتھ منظّم زندگی گزارتا ہے۔ معاشرہ انسان کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل اور اس کی سیرت و کردار کی تعمیر بھی اسی معاشرہ کی مرہون منت ہے اور انسان انہی باہمی تعلقات کے سہارے زندہ رہتا ہے اور زندگی گزارتا ہے کیونکہ تنہا زندگی گزارنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ پروفیسر رشید احمد اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ انسان بھی ایسی حیوانی ضروریات......حفاظت نفس اور بقائے نسل...... کی خاطر اجتماع کا محتاج ہے بلکہ دیگر حیوانات کے مقابلہ میں انسان دوسروں کا زیادہ دست نگر ہے کیونکہ اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل اتنی آسان نہیں جتنی دیگر جانوروں کی ہے۔''(۷)

اسی لیے انسان اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اور اپنی بنیادی ضرورتیں مثلاً اپنی بقا، تولید و تناسل، حفاظت، رہائش، لباس، خوراک کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہر طرح کا دکھ اٹھانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ بعض اوقات اپنے آپ کو ایسے خطرات سے دوچار کر بیٹھتا ہے جو اس کی بقائے حیات کے منافی ہوتے ہیں لیکن وہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ سارے کام بخوشی کر لیتا ہے۔ لیکن تنہا زندگی گزارنا اس کے بس سے باہر ہے۔ جو انسان اپنی الگ سے دنیا بنا لیتا ہے اور خود کو دوسروں سے علیحدہ کر بیٹھتا ہے۔ دیوانگی کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر اس کی یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔ کیونکہ قدرت نے انسان کو فطری طور پر مل جل کر رہنے کی جبلت عطا کی ہے۔ معاشرے میں رہنے والے افراد بظاہر ایک دوسرے سے الگ لیکن اصل میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ مل جل کر رہنے سے ہر شخص دوسرے پر اثر انداز ہوتا اور اہمیت بھی رکھتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی شخص صرف اپنی بنائی ہوئی چیزوں سے فائدہ نہیں اٹھاتا یا اس کی بنائی ہوئی اشیاء صرف اسی کے لیے سودمند نہیں ہوتیں۔ ہر فرد کے لیے جسمانی اور ذہنی طور پر اپنا کردار ادا کرنا ضروری ہوتا ہے اور ہر کردار کے مختلف رول ہوتے ہیں جو اسے نبھانے پڑتے ہیں۔ اسی لیے معاشرہ، مختلف افراد کے گروہ سے وجود میں آتا ہے۔ معاشرہ فرد کے بغیر اور فرد معاشرے کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ فرد کی اسی اہمیت کے پیش نظر تجمل حسین ہاشمی اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں۔

> ''ایک صحت مند معاشرہ کسی بھی فرد کو بے حقیقت نہیں سمجھتا۔ اگر کسی معاشرہ کے افراد اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھتے ہیں تو یہ معاشرہ کے جمود اور اس کی کم مائیگی کی نشانی ہے۔'' (۸)

معاشرہ ہی افراد کو نشو و نما دیتا ہے۔ انسان کا وجود معاشرے کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ پروفیسر خورشید اس موضوع پر لکھتے ہیں کہ:

> ''انسان ایک معاشرتی حیوان ہے یا یوں کہیے کہ ہمیشہ سے مدنی الطبع ہے اور اپنی فطرت میں اجتماعی زندگی کا محتاج ہے۔ بغیر اجتماعیت کے اس کی زندگی ناممکن ہے۔ انسان اپنی ہر متعلقہ سے مثلاً خوراک، لباس، مکان اور زندگی کے دوسرے ہر شعبے میں جماعت کا دست نگر ہے اور اگر اس سے وہ تمام علائق حذف کر دیئے جائیں جو جماعت کی بدولت اس کو حاصل ہوتے ہیں تو پھر اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ انسان کے اعمال، اغراض و عادات کی جماعتی زندگی کے بغیر کوئی حقیقت نہیں۔'' (۹)

کیونکہ معاشرہ ہی افراد کو بناتا اور بگاڑتا ہے۔اس کے اثرات انسانی زندگی بلکہ اس کی شخصیت و کردار کی تعمیر کرتے ہیں۔معاشرہ ہی افراد کی نشو ونما کرتا ہے۔اس لیے انسان معاشرے سے بیگانہ نہیں رہ سکتا ہے کیونکہ دوسری صورت میں وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے گا۔ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں کہ:

''انسان اپنی طبیعت، اپنے ماحول، اپنی خواہشات اور دیگر عوامل کی وجہ سے معاشرتی تشکیل کے لیے مجبور ہوا۔اس سے مراد انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے مربوط کوشش کرنا ہے تاکہ ذاتی تحفظ، اظہار شخصیت اور ہمسائیگی کی تکمیل ہو سکے۔''(۱۰)

جو لوگ معاشرے میں افراد کی اہمیت سے آگاہ نہیں ہوتے وہ کم فہمی کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ فرد اور معاشرہ لازم و ملزوم ہیں اور افراد ہی سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔فرد کے کردار، شخصیت اور ماحول سے نمو پانے والے معاشرے میں افراد کا چال چلن ہی معاشرے میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔تجمل حسین ہاشمی اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''افراد کا کردار ہی چال چلن بن جاتا ہے۔معاشرے کی یہ روش اور زیادہ افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور زیادہ سے زیادہ افراد کا کردار اسی سمت میں چلنا شروع ہو جاتا ہے۔جس سے اس روش کو اور زیادہ تقویت ملتی ہے۔حتیٰ کہ معاشرے کے بیشتر افراد اس رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔اس کا مطلب ہوا کہ چند افراد کا کردار معاشرے کا چلن بن سکتا ہے اور ہزاروں، لاکھوں افراد کا کردار متاثر کر سکتا ہے۔''(۱۱)

گویا معاشرے جہاں انسان کو پستی کی گہرائیوں اور آسمان کی بلندیوں تک لے جاتا ہے، اسی طرح افراد کا چال چلن بھی معاشرے کو متاثر کرتا ہے اور معاشرے میں جو تبدیلیاں آتی ہیں اس کا اثر افراد اور ماحول پر بھی پڑتا ہے اور نئے تغیرات سامنے آتے ہیں۔اسی لیے اگر معاشرے میں چند افراد اخلاقی برائیوں کا شکار ہونے لگیں اور انھیں ابتدا میں ہی ان افعال سے باز نہ رکھا جائے تو آہستہ آہستہ یہ اخلاقی برائیاں معاشرتی برائیوں میں ڈھل جائیں گی۔مثلاً رشوت خوری، سفارش، کاروباری نظام میں ملاوٹ، شراب نوشی، عصمت فروشی، جوا جیسی بیماریوں کا ابتدا ہی میں سدباب نہ کیا جائے تو معاشرہ ان برائیوں کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ان برائیوں کو روکنے کے لیے نہایت ہمت، جرأت اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ورنہ یہ تبدیلیاں معاشرے کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔اس سلسلے میں شیخ محمد اکرام رقمطراز ہیں کہ:

''معاشرتی ماحول اور سماجی حالات میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کا اثر قدروں پر بھی پڑتا ہے مثلاً کسی

زمانے میں عرب قوم میں مروت کو انسانیت کا جوہر خیال کیا جاتا تھا لیکن آپ کو آج بغداد، جدہ، دمشق، قاہرہ اور بیروت کے عرب تہذیب کے مراکز میں احساس مروت کا نام ونشان نہیں ملے گا بلکہ سود زیاں کا وہی کاروباری اور بے مروت ماحول جو دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی سرشت ہے اب عرب معاشرے میں سرائیت کر گیا ہے۔'' (۱۲)

بدلتی سماجی اقدار سے معاشرے میں مثبت اور منفی قوتیں برسر پیکار ہوتی ہیں اور معاشرہ جمود کا شکار نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ معاشرے کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ مسلسل ارتقا کی جانب سفر کرے۔ پروفیسر رشید احمد اس بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

''شاہ ولی اللہ نہ صرف معاشرے کے ارتقاء پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ نہایت تفصیل کے ساتھ اس کی چار تدریجی منزلیں بھی متعین فرماتے ہیں...... پہلا اور اہم طبقہ عقلا کا ہوتا ہے جو اجتماعی مصالح کی تجاویز مرتب کرتے ہیں تاکہ دوسرے اس کو عملی جامہ پہنا کر فلاح وترقی حاصل کر سکیں۔ دوسرا طبقہ دولتمندوں اور آرام طلبوں پر مشتمل ہوتا ہے اور تیسرے میں بہادر افراد شامل ہوتے ہیں جو معاشرہ کو خارجی حملوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور چوتھے میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو شہرت اور ناموری کے دلدادہ ہوتے ہیں اور اسی جذبہ کے تحت تنگ دست لوگوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ اس طرح شاہ صاحب وجود انسانی کے ساتھ ہی مختلف طبقات کے قیام کا تصور پیش کرتے ہیں۔'' (۱۳)

اس طریقے سے معاشرہ جمود یا سست روی کا شکار نہیں ہوتا ہے اور ارتقاء کی جانب گامزن رہتا ہے کیونکہ معاشرے کے تمام افراد اپنے اپنے کردار نبھانے میں مصروف عمل رہتے ہیں اور تمام افراد کو مساوی حقوق دیئے جاتے ہیں کیونکہ اگر معاشرے میں افراد میں برابری کے حقوق نہ تقسیم کیے جائیں تو وہ انتشار کا شکار ہو کر ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ مولانا وحیدالدین خان اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ:

''کسی سماج کے اندر خرابیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں محض اس لیے کہ سماج کے بعض افراد کو سماج کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں زیادہ اختیارات اور زیادہ مواقع حاصل ہو جاتے ہیں اگر سماج کا ہر فرد یکساں ہو اور کسی کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہ ہو تو ظلم اور لوٹ کھسوٹ کا کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔'' (۱۴)

پرانے زمانے میں بھی معاشرہ ترقی کرتا تھا اور ارتقاء کی منازل طے کرتا تھا، لیکن اس میں دو طرح سے معاشرے کا

تصور تھا۔ ایک وہ جو مسلط ہونا چاہتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس تسلط سے بچنا چاہتے ہیں اکثر معاشرے سادہ مگر خود کفیل ہوتے تھے لیکن دوسروں کے ساتھ خلط ملط نہیں ہوتے تھے۔ اندھا دھند تقلید نہیں کرتے تھے۔ جیسے کہ موجودہ معاشرے میں ترقی کے تصور کو تیز رفتاری سے جوڑ دیا گیا ہے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس جیسے حربوں کو مثالی تصور کیا جاتا ہے۔ بزرگ اور دانا لوگ زمانے سے بہت پیچھے سمجھے جاتے ہیں۔ موجودہ دور افراتفری کا دورہ ہے۔ مذاہب کو عقل و دلائل پر پرکھا جانے لگا ہے۔ نئی نسل پرانی نسل سے باغی اور رنجیدہ خاطر ہی رہتی ہے۔ پر تعیش زندگی ہر انسان کی بنیادی ضرورت دکھائی دینے لگ گئی ہے۔ سائنس کی ترقی نے دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے لیکن ان ساری تبدیلیوں، تیز رفتاریوں کا رخ مثبت انداز کی طرف بدلا جا سکتا ہے۔ اگر سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے تو معاشرے کی صحیح سمت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ:

> ''سمجھ بغیر علم و عقل دونوں ناچیز ہیں۔ بھلائی، برائی دکھائی دیتی ہے باوجودیکہ انسان میں عمدہ خصلتیں ہیں مگر سمجھ بغیر ان کے برتاؤ میں غلطیاں کرتا ہے اور نقصان پر نقصان اٹھاتا ہے۔ جس شخص کو بڑی سے بڑی لیاقت حاصل ہو، پر سمجھ نہ ہو وہ ایک نہایت قوی اور زبردست اندھے کی مانند ہے جو بہ سبب اپنے اندھے پن کے اپنے زور قوت سے کچھ کام نہیں لے سکتا۔'' (۱۵)

جب تک سوجھ بوجھ سے کام نہ لیا جائے موجودہ معاشرہ میں تبدیلی لانا ناممکن ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ نہ تو کوئی فرد تنہا زندگی گزار سکتا ہے اور نہ ہی کوئی معاشرہ الگ تھلگ ہو کر نمو پا سکتا ہے۔ چنانچہ الگ ہو کر، اپنے گرد دیواریں کھڑی کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ حیات کا کارواں رواں دواں رہے گا تو تگ و دو کرنی پڑے گی۔ ایک معاشرہ دوسرے کا رنگ ضرور اختیار کرتا ہے لیکن اس کا اپنا رنگ مٹ نہیں جاتا ہے۔ بعض اوقات جمود اور سست روی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں وہ حرکت اور حرارت ختم ہو جاتی ہے جو ایک زندہ معاشرے کے قیام کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف بخشا ہے کہ وہ خیر و شر، نیکی و بدی، مناسب اور غیر مناسب میں تمیز کر سکتا ہے۔ انسانی تقسیم وہ زبردست قوت ہے جو انسان کو بہتر زندگی گزارنے میں مدد دیتی ہے اور اگر معاشرے کی ضروری اور غیر ضروری اقدار میں امتیاز کر لیا جائے تو صحت مند معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں آزاد کوثری لکھتے ہیں کہ:

> ''ظاہر ہے کہ زندگی کا ہر معاملہ اولاً ایک اصول کا متقاضی ہوتا ہے۔ ثانیاً اس کے لیے (ڈسپلن و ذہنی و

عمل ریاضت کے تحت ایک اجتماعی رویے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ اس قسم کے ڈسپلن کے بغیر، اچھے معاشرتی طرزِ عمل کی توقع رکھتے ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انسان فطری طور پر ماحول کا پابند ہوتا ہے۔ اس میں کچھ رجحانات اس ماحول کے تابع ہوتے ہیں مگر وہ بہت کچھ تعلیم اور ریاضت سے حاصل کرتا ہے۔ اگر زندگی میں یہ ریاضت اور ڈسپلن نہ رہے تو زندگی کی گاڑی کا کوئی پہیہ بھی سلامت نہ رہے۔" (۱۶)

معاشرے میں بہتری لانے کے لیے ہمیں کچھ اصول وضوابط کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مثبت پیمانے پر صحیح سمت کا تعین کیا جا سکے اور معاشرے کو پستی کی گہرائیوں سے نکالا جائے۔ ان تقاضوں کے پیشِ نظر ہم ایک نئے مثالی معاشرے کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ آزاد کوثری اس سلسلے میں کچھ یوں رقمطراز ہیں کہ:

"نئی معاشرت اور کلچر کی تعمیر کے لیے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو جو مدت سے سونی پڑی تھیں یا بیزاری و بے کسی میں کھو کر رہ گئی تھیں ایسے کاموں میں لگائیں جن سے ہمارے اجتماعی وانفرادی مسائل کو حل کرنے کی بھی کوئی صورت نکلے۔" (۱۷)

معاشرے کی بہتر تشکیل کے لیے ایسا ماحول پیدا کرنا پڑے گا جو افراد کی ضروریات کے حصول میں مدد ومعاون ثابت ہو۔ ان کے فطری تقاضوں کے لیے تسکین فراہم کرنے کا بندوبست کرے۔ ظلم وستم، فتنہ وفساد، تحمل وتشدد اور مقابلہ ومجادلہ کی فضا کو ناکام بنایا جائے، اصابت رائے، حوصلہ مندی اور قوت قلب سے معاشرے میں مثبت تبدیلیوں کا عزم کیا جائے کیونکہ موجودہ دور نے فرد کی حیثیت کو معاشرے میں کمزور اور ناکارہ کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ:

"امام غزالی نے جواب دیا کہ" آج کل کے لوگ میری باتوں کو برداشت نہیں کر سکیں گے کیونکہ اس زمانے میں جو شخص سچ کہتا ہے" انسان تو درکنار در و دیوار اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ سچ کا یہی ڈر پیر تسمہ پا بن کر آج ہمارے معاشرے کا کاندھوں پر سوار ہے۔ اس ڈر نے فرد کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ آج وہ ہر اس بات کے اظہار سے خائف ہے جسے وہ صحیح جانتا ہے اور جو اسے ذرا سا بھی نقصان پہنچانے کی قوت رکھتی ہے۔ اس بیماری میں معاشرے کا ہر ادنیٰ واعلیٰ مبتلا ہے۔" (۱۸)

معاشرے میں فرد کی حیثیت کمزور ہوتی ہے تو پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ کیونکہ معاشرہ افراد کے مل

جل کر زندگی گزارنے سے وجود میں آتا ہے اور باہمی تعاون سے ہی معاشرہ زندہ رہتا اور بڑھتا پھولتا پھیلتا ہے۔ معاشرہ انسانوں کے ایسے گروہ کا نام ہے جو اکٹھے عمل کرتے ہیں اور معاشرے کا قیام معاشرتی تعلقات پر ہی قائم ہوتا ہے۔ جب فرد عدم تحفظ کا شکار ہوتا ہے تو اس کا اثر سارے معاشرے پر پڑتا ہے اور معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیاں ہی اس کی ترقی اور انحطاط کی سمت کا تعین کرتی ہیں۔ ڈاکٹر چوہدری عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

''آج کل سوسائٹی بڑی تیزی سے بدل رہی ہے جس سے نئے نئے مسائل کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ ابلاغ عامہ یعنی ریڈیو، ٹی وی، اخبارات سے جھٹ ایک جگہ کی خبر دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے۔ اگر ایک جگہ ہڑتال ہو تو سب جگہ مشتہر ہو جاتی ہے اور ہر جگہ ہمدردی میں یاد سے مسائل کی بدولت ہڑتالیں ہو جاتی ہیں۔'' (۱۹)

آج کل جس تیزی سے سائنسی ترقی کا عمل جاری ہے، اسی تیزی سے معاشرے میں مثبت اور منفی کوئی بھی شے پھیلتی ہے۔ موجودہ دور میں ہمارا معاشرہ بہت سے مسائل کا شکار ہے جس میں بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث معاشرے میں بنیادی انسانی ضرورتوں کی تکمیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ آبادی زیادہ ہوگئی ہے اور معاشرہ ذہنی عارضے میں مبتلا ہو جاتا ہے، پاکستانی معاشرے میں فرسٹریشن کی ایک وجہ یہ بے جا بڑھتی ہوئی آبادی بھی ہے۔ محمد اقبال چوہدری لکھتے ہیں کہ:

''پاکستان کی شہری آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس صدی کے اختتام تک شہری آبادی ساٹھ ملین (چھ کروڑ) ہو جائے گی جو ملک کی مجموعی آبادی کا تقریباً نصف بنتی ہے۔'' (۲۰)

بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث معاشرے سے اخلاقی اقدار بھی مفقود ہوتی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر وحید عشرت لکھتے ہیں کہ:

''کسی معاشرے میں اخلاقی اور عمرانی قدریں جب زوال پذیر ہوتی ہیں تو معاشرہ بھی زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔'' (۲۱)

ہر معاشرے کی اپنی اقدار ہوتی ہیں اور مختلف قسم کے اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ بعض چیزیں پسندیدہ اور بعض ناپسندیدہ ہوتی ہیں۔ مثلاً بزرگوں کی عزت، بچوں کی شفقت، محتاجوں کی امداد، عفت وعصمت کے احترام، اعلیٰ تعلیم، دوستی، مہمان نوازی وغیرہ ہماری معاشرتی اقدار ہیں اور افراد کو چاہیے کہ ان اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا احترام کریں۔ معاشرہ، سکول اور استاد میں مرقوم ہے کہ:

''اسی طرح پاکستان میں جہاں بڑی عمر کے آدمی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ نوجوان کی نسبت زیادہ آزادانہ طریق پر اپنی رائے کا اظہار کرسکتا ہے وہاں اس پر یہ پابندی بھی عائد کی جاتی ہے کہ وہ ملک کی اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان میں شریک نہیں ہوسکتا۔ چانچہ ہر حیثیت کے ہر فرد کے لیے مخصوص مراعات اور پابندیاں ہوتی ہیں اور شخصیت کے تغیر اور ارتقاء پر ان کے نمایاں اثر پڑتا ہے۔''(۲۲)

چنانچہ ہر عمر، منصب اور حیثیت کا فرد جب اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیتا ہے تو معاشرہ صحیح انداز میں پرورش پاتا ہے۔ معاشرے میں تباہی کا سبب جہاں بڑھتی ہوئی آبادی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا انحطاط وہاں موجودہ دور میں طبقاتی درجہ بندی نے معاشرے کو جماعتوں میں بانٹ کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے لوگ ذات پات، فرقوں اور طبقات میں بٹ کر رہ گئے ہیں اور معاشرے کی مجموعی ترقی کا عمل رک گیا ہے اور اس کا مظاہرہ جابجا ظر آتا ہے۔ اکبر ایس احمد اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''چکوال میں بھی شیعہ سنی اختلافات جن کی طویل اور قدیم تاریخ ہے، معاشرے کو تقسیم کر رکھا ہے۔ مقامی سیاست، شادیاں اور اقتصادیات سب کی بنیاد ان ہی اختلافات پر ہے۔''(۲۳)

ان فرقہ وارانہ تنازعات کا اثر نہ صرف معاشرتی سطح پر بلکہ خاندانی سطح پر بھی افراد کی زندگی متاثر کرتا ہے۔ اس سے معاشرے میں طبقہ بندی کے رجحانات جنم لیتے ہیں اور اگر طبقہ بندی کو مذہب کا سہارا بھی مل جائے تو طبقہ بندی کا یہ عمل معاشرے کا حصہ بن جاتی ہے اور اگر معاشرے کے کچھ افراد کو اس سے فائدہ پہنچ رہا ہو تو وہ اس کے حامی بن جاتے ہیں اور اس کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سی اے قادر اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''سوسائٹی بذات خود اس امر میں لچسپی نہیں رکھتی کہ اس کے ہاں طبقہ بندی موجود ہے یا نہیں لیکن اگر موجود ہو تو وہ صرف ان خصوصیات کو متعین کرے گی جن کی بنیاد پر امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ مثلاً حبشی اور سفید فام امریکی صرف نام کا فرق ہے اور اس فرق کی بناء پر حبشیوں کو سفید امریکیوں سے الگ الگ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ یہ کیفیت تقریباً ہر سوسائٹی میں پائی جاتی ہے جتنے کہ وہ معاشرے جو مساوات کے حامی ہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ لوگ ہمارا نظام معیشت قبول کریں گے تو ان کو یہ مراعات حاصل ہوں گی اور جو پرانے نظام میں رہنا چاہیں گے انھیں یہ فائدے نہ مل سکیں گے۔ ہر ایک قسم کی طبقہ بندی

ہے۔ جو مساوات پسند معاشرہ روا رکھے گا۔'' (۲۴)

یہ طبقہ بندی معاشرے میں برابری کے سلوک کا تصور پیدا نہیں ہونے دیتی۔ اس سے معاشرہ طبقوں اور ذاتوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور مختلف جماعتوں میں بٹ جاتا ہے۔ موجودہ دور میں طبقاتی تقسیم ایک مکمل روگ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ کسی بھی قابلیت یا معیار کو ملحوظ خاطر رکھے بغیر افراد کی درجہ بندی کے معیار مختلف ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر سی اے قادر لکھتے ہیں کہ:

''زمانہ گزشتہ میں جماعتوں کو علم، نسل، خاندان، مذہب، دولت اور شجاعت کی بناء پر فوقیت حاصل ہوتی تھی لیکن آج کل فوقیت کے معیار بدل گئے ہیں۔'' (۲۵)

سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ اور طبقاتی نظام، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، تعلیم کی کمی نے معاشرے میں جا بجا بے اطمانیت پیدا کر دی ہے جو مہذب معاشرے کی تشکیل میں رکاوٹ ہے اور جب ہم فرد اور معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ربط کرنے میں ناکام رہیں گے تو معاشرہ بری طرح ناکام ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں ''صحت مند معاشرہ'' میں مرقوم ہے کہ:

''......اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ مہذب اور ہوشمند معاشرہ وہ ہوتا ہے جو انسان کی ضرورتوں سے ہم آہنگی کا حامل ہو۔ ضروری نہیں کہ وہ ان ضرورتوں کے مطابق ہو جو معروضی طور پر اس کی ضروریات ہیں اور انسان کے مطالعے سے انھیں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔'' (۲٦)

جدید معاشرے کی تشکیل کے لیے ہمیں فرد اور معاشرے کے باہمی تضادات کو دور کر کے نئی بنیادوں پر سوچنا چاہیے کیونکہ جب انسانی فطرت اور معاشرے کے تقاضے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں تو معاشرہ تضاد کا شکار ہو جاتا ہے اور چوری، رہزنی، سمگلنگ، قوانین کا غلط استعمال، دہشت گردی، منشیات فروشی اور گداگری جیسی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے معاشرے میں بہتری لانے کے لیے افراد کو مل جل کر کام کرنا چاہیے تاکہ منظّم طریقے سے ان معاشرتی بیماریوں کا سدباب کیا جا سکے۔ ڈاکٹر سی اے قادر اپنی کتاب ''معاشریات طب میں لکھتے ہیں کہ:

''اگر نیت نیک ہو تو مختلف ادارے مل جل کر اس تضاد کا حل ڈھونڈ نکالیں گے۔ اگر افہام و تفہیم کی مجلس وقتاً فوقتاً منعقد ہوں تو کئی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اور معاملات سدھر جاتے ہیں۔'' (۲۷)

معاشرے کے قیام کا سب سے ضروری مقصد یہ ہے کہ افراد کو بنیادی ضروری سہولتیں میسر ہوں اور معاشرہ فرد کی

ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے ترقی سے ہمکنار ہونے کے مواقع فراہم کرے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے سب مل جل کر کوشش کریں۔

افراد کو مل جل کر معاشرے کی اصلاح کے لیے کام کرنا چاہیے اور ایسے ذرائع کو اپنانا چاہیے جنہیں معاشرے میں حمایت حاصل ہو اور سارا معاشرہ اپنے مقاصد کا تعین کرے اور ضروریات کے مطابق منظّم ہو کر کام کرے تو ہی صحت مند معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکے گی کیونکہ صحت مند مثالی معاشرے کے خواب کو تعبیر دینا صرف ایک فرد کا کام نہیں ہے۔ یا معاشرے کی تباہی کا باعث کوئی ایک فرد یا افراد کا مخصوص گروہ نہیں ہوسکتا بلکہ تمام لوگ اس کے یکساں ذمہ دار ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''ایسے معاشرے میں ایک صحت مند نسل کا پروان چڑھنا ناممکنات میں ہے۔اگر چہ قانون کے نفاذ کے ذمہ دار ادارے اپنے طور پر کچھ کرتے ہیں مگر اصلاح کا مسئلہ اگر صرف عدالتوں اور تھانوں کی جدوجہد سے حل ہونا ممکن ہوتا تو مدت سے ہو چکا ہوتا جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان معاشرتی مسائل میں روز افزوں اضافہ ہی ہو رہا ہے بلکہ چاقو، آتشیں اسلحہ میں اور چرس ہیروئن میں تبدیلی ہو چکی ہے اور اب طلباء کی اقامت گاہیں بھی اس سے محفوظ نہیں۔'' (۲۸)

پاکستان کے قیام کی بنیاد مذہب پر ہے اس لیے صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے ہم مذہب سے رابطہ کریں تو موجودہ معاشرہ مثالی معاشرے میں تبدیل ہوسکتا ہے۔مثلاً اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں معاشرت کے تصور کے بارے میں درج ہے کہ:

''شریعت پاک نے معاشرت کے متعلق انسان کو اعلیٰ تعلیم دی ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا جس کے سبب سے زبردست دلیل یہ ہے کہ اسلام نے عرب جیسی جاہل اور بادیہ نشین قوم کو تہذیب وتمدن میں وہ کمال عطا کیا کہ عرب کی اسلامی معاشرت اس زمانہ کی تمام قدیمی مہذب متمدن اقوام کے لیے دستور العمل بن گئی۔'' (۲۹)

اسلام ہی وہ طرز معاشرت ہے جسے اپنا کر مثالی معاشرے کا قیام ممکن ہوسکتا ہے اور پاکستان کے قیام کی بنیاد ہی مذہب ہے اس لیے یہ اور بھی ضروری ہے۔ پاکستانی معاشرہ اور ثقافت میں درج ہے کہ:

''پاکستان مذہبی بنیاد پر قائم ہوا اس وجہ سے تقویٰ اور مذہبی احکام کی پابندی عمومی حیثیت میں زیادہ اہم ہوگئی۔''(۳۰)

اسلامی تعلیمات ہی واحد راستہ ہے جس کی بنیاد پر اعلیٰ انسانی اقدار پر مشتمل معاشرے کی تشکیل ممکن نظر آتی ہے۔ آج معاشرہ انتشار کا شکار بھی اسی لیے ہے کہ وہ مذہبی تعلیمات سے دور ہو چکا ہے۔ سید قطب شیر معاشرے کی بہبود اور کفالت کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

''اسلام انفرادی آزادی کو اس کی بہترین شکل میں عطا کرتا ہے اور اعلیٰ ترین معنی میں انسانی مساوات برپا کرتا ہے لیکن ان دونوں کو بے لگام نہیں چھوڑتا۔''(۳۱)

ایک مثالی معاشرے کا تصور قرآن کی بنیادی تعلیمات کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ یہی وہ ضابطہ حیات ہے جو ہر زمانہ کے انسان کی ضروریات کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم اس سلسلے میں معاشرے کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''۱۔ایسے معاشرے میں مذہب اور کسی کو دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

۲۔اگر وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی نہ گزار سکتے ہیں تو ان کو صبر کرنا چاہیے یا ہجرت۔

۳۔اسلامی حکومت کے قیام کی صورت میں غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی پوری آزادی ہوگی اور وہ ان کے حقوق میں، ان کے مذہب کی بنیاد پر کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

۴۔اسلامی ریاست، ایک جمہوری اور سوشلسٹ ریاست ہوگی۔

۵۔عورتوں کے بنیادی حقوق میں جنس کی بنیاد پر کوئی امتیازی سلوک نہیں ہوگا۔

۶۔ریاست معاشی نظام کو اس طرح منظّم کرے گی کہ سرمایہ داری اور بغیر محنت کی کمائی معاشرے میں جگہ نہ پائے اور دولت مند ہاتھوں میں مرتکز نہ ہو جائے اس طرح معاشرے میں انتہائی گردش کے قانون بھی بنائے جائیں گے۔ جائیداد اور املاک کو مشترکہ ملکیت میں رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

۷۔کسی گروہ کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ حکومت وقت کے خلاف مسلح بغاوت کرے اس لیے معاشرے میں افراتفری اور شورش کی بہ نسبت امن وامان زیادہ قیمتی ہے۔''(۳۲)

درج بالا تعلیمات جو قرآن کی بنیادی تعلیمات پر عمل کر کے ہر فرد اپنے مقاصد کا تعین کر کے مثالی معاشرے کے خواب کو تعبیر دے سکتا ہے کیونکہ انسان فطری طور پر نفاست پسند ہے اور اس میں عمدگی کی طرف جانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ امن کے ساتھ عمدہ زندگی گزارے اور یہ خواہش انسان کی راہنمائی کر کے انسانی بود و باش کی بہتر سے بہتر صورت کی طرف بڑھتا ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں موجودہ معاشرے اور مثالی معاشرے کی حقیقتوں کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کی کہانیاں ہمارے معاشرتی نظام کی ایسی تصویریں ہیں جن میں ہر فرد کو اس کا نقش صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک سچے ادیب کی طرح معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھے نقشے کھینچتے چلے ہیں کہ اور یہ کہانیاں ماضی اور حال کے نقش و نگار کی وضاحت کرتی ہیں۔ ڈاکٹر سی۔ اے قادر کے خیال میں کہانیاں محض افسانوی دنیا کا حصہ نہیں بلکہ ان میں اپنے عہد کی پوری تاریخ رقم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ان کہانیوں کو محض ادب کے نمونے خیال نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان سے تو قدیم ذہن اور قدیم طرز حیات کا علم ہوتا ہے۔ ...... معاشرتی ساخت، مذہبی عقائد، چور ٹولیوں، اخلاقی تصورات اور جذباتی زندگی کا علم ہوتا ہے۔'' (۳۳)

اشفاق احمد نے اپنی کہانیوں میں نہ صرف اپنے معاشرہ کے تمام پہلوؤں کو زیر بحث لائے ہیں بلکہ موجودہ معاشرے پر مغرب کے اثرات کو بھی وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عطاء الرحمٰن لکھتے ہیں کہ:

> ''اشفاق احمد اہل مغرب کی معاشرتی اقدار پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان بعض کمزور پہلوؤں کو بڑے خوبصورت اور حکیمانہ انداز میں طشت از بام کرتے تھے۔'' (۳۴)

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں ان حالات کو بیان کیا ہے جن سے تنگ آ کر پاکستان حاصل کیا گیا ہے۔ اس جدوجہد میں کیا کیا قربانیاں دی گئیں، باہمی تعاون اور تضادات کو بیان کر کے نہ صرف نئے معاشرے کی تشکیل کی فضا تیار کرتے ہیں بلکہ پرانی قدروں کے قیام اور اہمیت کی بات بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''انھوں نے پاکستان کے نئے معاشرے میں ان قدروں کو مجتمع کرنے اور افسانے کے پورے ماجرے اور کرداروں کے عمل سے ان کی داخلی حقیقت آشکار کرنے کی کوشش کی جن کے فروغ کے لیے برصغیر

سے کاٹ کر ایک آزاد وطن حاصل کیا گیا تھا۔'' (۳۵)

نئے معاشرے کی تشکیل کے لیے وہ اسلامی معاشرتی نظام کے حامی نظر آتے ہیں اور اس کے بغیر کسی بھی ملک کی سالمیت کو ناممکن قرار دیتے ہیں ڈاکٹر عطاء الرحمٰن اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ:

''میرے نزدیک ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ مسلم تہذیب کی اعلیٰ قدروں اور ہمارے سماج کی بعض خوبیوں پر ان کا ایقان گہرا تھا کہ بڑے بڑے مغرب زدہ دانشوران کے بیان کے آگے سر جھکاتے نظر آتے تھے۔ ہماری کئی ایک سماجی قدروں میں سے جنہیں ہم نے فرسودہ سمجھ رکھا ہے۔ حکمت و دانائی کے ایسے نکات لا نکالتے تھے کہ سننے والا عش عش بھی کر اٹھتا اور اشفاق احمد کی نظر کی گہرائی کا بھی قائل ہو جاتا۔'' (۳۶)

چنانچہ اشفاق احمد موجودہ معاشرے کی تمام سچی تصویری اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔

ب۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں موجودہ معاشرہ

اشفاق احمد کے موجودہ معاشرے کی بے حسی کی داستان رقم کرتے ہوئے اس میں پنپنے والی برائیوں کی بھی نشاندہی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے افسانے ''عجیب بادشاہ'' میں جب ایک دوست چپکے سے اپنے دوست زمان کے بیٹے کے علاج کے لیے جیب میں چند روپے رکھ دیتا ہے تو اس کی جیب ہی کوئی کاٹ لیتا ہے اور یوں اس کا بیٹا ہمیشہ کے لیے موت کی وادی میں گم ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''یار وہ بھی اپنی ممی سے جا ملا۔ پھر اس نے اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دامن الٹ کر کہا ''یار ذرا دیکھنا۔ کل رات یہاں سے جاتے ہوئے کسی صاحبزادے نے ہماری جیب کاٹ لی۔ جیسے ہم جیبوں میں نوٹ ہی تو ڈالے پھرتے ہیں۔ سالے کو سٹرپٹو مائی سین کے پرمٹ اور تین آنے کے سوا اور کیا ملا ہوگا۔'' (۳۷)

اور یوں یہ جرم جان لیوا جرم میں تبدیل ہو جاتا ہے ایسا معاشرہ جہاں ہر قدم پر آپ کو خطرہ ہے آپ کی جان، مال، جیب کچھ بھی محفوظ نہیں ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں تعلیم بھی سوچوں کا رخ تبدیل نہیں کر سکتی۔ صدیوں سے بنے نظام میں سب بہتے چلے جا رہے ہیں۔ تبدیلی کی کہیں کوئی رمق نظر نہیں آتی۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ

''کلثوم کہہ رہی تھی ''میرا کوئی ساتھی نہیں۔ ہمارے خاندان میں بہت سے آدمی ہیں، مگر سارے کے سارے تاجر ہیں۔ ان کے یہاں ہر قسم کا سودا ہے، لیکن لطیف جذبات کی کمی ہے۔ کوئی ایسا ذہین نہیں جو میرا ساتھ دے سکے۔ کسی میں اتنی سکت نہیں کہ میرے ساتھ مل کر میری سکیم چلا سکے، لیکن میں کیا! میں تو خود ان کے ساتھ اسی دھارے میں بڑی تیزی سے بہے جاتی ہوں۔'' (۳۸)

حالات کی تبدیلی کی بات کرنے والے خود ہی گھٹنے ٹیک رہے ہیں اور اسی رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ تو ایسے حال میں بہتری کیسے لائی جا سکتی ہے۔ کلثوم سے امید تھی کہ شاید وہ تاجرانہ ذہنیت سے چھٹکارا پا کر نئے راستے تلاش کر سکے لیکن وہ بھی اسی رو میں بہہ جاتی ہے۔ اشفاق احمد نے بغیر تخیلاتی دھارے میں بہے نہایت سچائی سے صورتحال کو بیان کیا ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں معاشرتی بے حسی کا ذکر کیا ہے اور اس کی وجہ بھی آپس میں لوگوں کی بداعتمادی ہے۔

مختلف شعبہ ہائے زندگی میں رویوں میں نفرت اور حقارت کی مثال افسانے ''بابا'' میں نظر آتی ہے جب وہ اپنی بہو کے لیے ڈاکٹروں اور نرسوں کو بلانے کے لیے جاتا ہے تو کوئی بھی اس کے ساتھ آنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''بابا نے کہا، ''آپ کوئی موٹر لے لیجیے، ٹیکسی لے لیجیے۔ میں کرایہ ادا کر دوں گا۔ دوگنا کرایہ دوں گا۔ آپ کو دس گنا فیس دینے کا وعدہ کرتا ہوں، مگر میرے ساتھ ضرور چلئے۔ میری بہو کو بچا لیجیے۔'' نا بابا نا۔ دو تین نرسوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''جب ڈاکٹر لوگ نہیں جاتے تو ہم کیا کریں۔ پھر اسی نرس نے کہا ''بابا اپنی بہو کو جا کر دم کرو۔ اچھی ہو جائے گی۔'' اور ساری نرسیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔'' (۳۹)

اور یوں اس بے حسی کا شکار ہو کر بابا کی بہو ایلین سخت اذیت کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔ اور کوئی بھی اس کے علاج کے لیے نہیں پہنچتا ہے۔ جس معاشرے میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی زبان اور انداز اس قدر غیر سنجیدہ ہوگا وہ زندگیوں کا ضامن کون سا پیشہ کہلائے گا۔ اشفاق احمد یقیناً ان رویوں کو بے نقاب کر کے ان میں بہتری لانا چاہتے ہیں۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف جا بجا آواز اٹھائی ہے اور طبقاتی تقسیم کا ذکر بھی بارہا کیا ہے کہ موجودہ معاشرے میں عزت و آبرو کا تعلق روپے پیسے سے ہے نہ کہ علم و دانش۔ جس کے پاس دھن دولت کی فراوانی

ہو گی دنیا اسی کو سلام کرے گی۔ اس کی مثال وہ اپنے افسانے ''تنکہ'' میں پیش کرتے ہیں، جہاں رتبے خان کی نسبت، گاؤں کے پیرزادہ صاحب کی عزت ہے کیونکہ ان کے پاس روپے پیسے کی فراوانی ہے جبکہ رتبے خان کے ملٹری کراس کی وہ عزت نہیں ہے کیونکہ لوگوں کی سوچ ہی ایسی نہیں ہے کہ سونے چاندی کے سکوں سے آگے بھی سوچ سکیں۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''سارا گاؤں پیرزادہ صاحب کی اس لیے عزت کرتا تھا کہ وہ گاؤں کے مالک تھے، ان کی بے شمار زمینیں تھیں، ان گنت مزارعے تھے، سینکڑوں مویشی تھے اور پیٹیوں کے علاوہ بینکوں میں کتنا ہی روپیہ تھا اور وہ وقت بے وقت لوگوں کو قرض دیتا رہتا تھا اور لوگ سرکار کو اس لیے مان دیتے تھے کہ سرکار کے خزانے بھی روپے سے بھرے ہوئے تھے اور اس کی جاگیریں بہت وسیع تھیں اور ان پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا۔ لیکن لوگ رتبے خان کی عزت نہ کرتے تھے۔ حالانکہ اس کے پاس ملٹری کراس تھا۔ اس نے گاؤں کی بہو بیٹی کو زندگی میں نہ تاکا تھا اور اس نے کسی کو نہ ستایا تھا۔ وہ باقاعدہ نماز پڑھتا تھا، روزے رکھتا تھا اور اپنی حیثیت کے مطابق خیرات بھی کرتا تھا، لیکن لوگ نہ تو چکر کاٹ کر اسے سلام کرنے آتے تھے نہ اس کی آمد پر کھڑے ہوتے تھے۔'' (۴۰)

کیونکہ رتبے خان کے پاس اس قدر روپیہ نہیں تھا جتنا کہ پیرزادہ صاحب کے پاس تھا۔ رتبے خان کی اخلاقی اقدار اس کی عزت میں اضافے کا باعث نہیں بن سکتیں کیونکہ یہاں عزت کو اچھائی کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی شرافت کا ہونا عزت کا باعث بن سکتا ہے بلکہ موجودہ معاشرے کا المیہ ہی یہ ہے کہ یہاں صرف روپے پیسے کے مالک افراد ہی کو عزت بخشی جاتی ہے اور قابل احترام جانا جاتا ہے۔ خدا کے عزت دینے پر بھی لوگ پروا نہیں کرتے بلکہ روپے پیسے کی بنیاد پر ہی لوگوں کو پرکھتے اور عزت دیتے ہیں۔

اشفاق احمد موجودہ معاشرے میں موجود عناصر پر روشنی ڈالنے کے ساتھ اس دور میں لوگوں کے مختلف کرداروں کی بھی بات کرتے ہیں۔ اس معاشرے میں موجود ''مرد'' عورت کی محبت کا کس طرح سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کے ساتھ بے وفائی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کو سچائی سے بیان کیا ہے اور مرد ہوتے ہوئے بھی ذرا بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ اسی طرح کا ایک ''حقیقت نیوش'' میں جمیل کا بھی ہے۔ جو مختلف لڑکیوں سے صرف محبت کا کھیل رچاتا ہے اور شادی کے تقاضے کے ساتھ ہی بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اسے صرف محبت کا لطف اٹھانا آتا ہے۔ اسے نبھانا یا عزت دینے سے وہ ناواقف

ہے اور نہ ہی یہ ذمہ داری اٹھانا چاہتا ہے۔افسانے کے آخر میں سیدھی سادی بیوہ بلقیس کو محبت کے سنہرے سپنے دکھا کر مکر جاتا ہے تو بلقیس اسے اس کی اصلیت یاد کرواتی ہے۔افسانے میں یوں مرقوم ہے کہ:

''اور پھر میری پیاری بچیو! ایک دن کوٹھے پر بلقیس نے جمیل سے کہا۔تم مرد بڑے بے وفا ہوتے ہو۔ جس نے ساری عمر مجھ سے نبھا دینے کا وعدہ کیا تھا، وہ مجھے چھوڑ کر روپوش ہو گیا۔تم نے زبیدہ سے شادی کرنے کا اقرار کیا اور اس وعدے کو پورا نہ کیا۔تم نے میرے غموں کو جاننے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میرا سہارا شاید اس لیے نہ بن سکے کہ میں بیوہ ہوں۔ وہ چنگاری جو برسوں کی راکھ تلے دبی پڑی تھی۔تم نے پھونکیں مار مار کر پھر روشن کر دی اور اب اس چنگاری پر تم اپنے آنسو گرا کر اسے ہمیشہ کے لیے بجھا دینا چاہتے ہو۔'' (۴۱)

لیکن بلقیس کی ان تمام باتوں کے باوجود جمیل پر ایک لمحہ کا بھی اثر نہیں ہوتا،جمیل، جمیل ہی رہتا ہے۔سنگدل، دغا باز، ریا کار، جھوٹا،فریبی اور بے وفا۔زبیدہ، نجمہ، نیلما اور بلقیس اور اس کے بعد نجانے کتنی ہی لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں گی اور وہ بے وفا ہی رہے گا۔اشفاق احمد نے جمیل کے روپ میں ان تمام مردوں کے کردار کی عکاسی کی ہے جو محبت کو مذاق بنا کر رکھ دیتے اور معصوم لڑکیوں کے جذبات سے کھیل کر اپنی دنیا میں واپس چلے جاتے ہیں۔اشفاق احمد ان کرداروں کو بے نقاب کر کے ان کے زور کو ختم کرنا چاہتے ہیں تا کہ اس معاشرے میں کوئی نجمہ، زبیدہ، نیلما اور بلقیس ہمیشہ کے لیے آنسوؤں میں دفن نہ ہو سکے اور اپنا وجود برقرار رکھ سکے نہ کہ کسی کی باتوں میں آ کر خود کو برباد کر ڈالیں۔

اشفاق احمد معاشرے میں تعلیم کے انحطاط اور اس کے نتیجے میں ہونے والے مسائل کو بیان کرتے ہیں کہ کم علمی کے باعث کیسے بھولے بھالے عوام کو''گناہ'' تک کرنے پر آمادہ کر لیا جاتا ہے، جیسے ان کے افسانے''سلامتے کی ماں'' میں گاموں کو چوہدری اس بات پر قائل کر لیتا ہے کہ نکاح کے بغیر رخصتی مذہبی طور پر جائز ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''گاموں کو چوہدری کی بات تے یقین تو نہیں آیا پر اوا گے سے بولیا نئیں ،شاید چوہدری ٹھیک ہی آکھتا ہو کہ پہلے بھی ڈولا دے سکتے ہیں۔نکاح بعد ماں کر سکتے ہیں ہفتہ دس دن ٹھہر کے۔ یہ علم والیاں کیا باتاں ہیں۔کتاباں والیاں کیا...... کیا پتا ٹھیک ہی ہو سب کچھ۔'' (۴۲)

اور گاموں بغیر نکاح کے اپنی بیٹی کا ڈولا چوہدری کے ساتھ ٹور دیتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

اس کی وجہ اس کی کم علمی ہے۔

اشفاق احمد شہر میں جا کر پڑھنے والے بچوں کے بارے میں بھی بتاتے ہیں کہ وہ نئے ماحول کی روشنیوں میں گم ہو کر اپنے اصل سے دور ہو جاتے ہیں اور انھیں گھر والوں کے بجائے باہر والے اچھے لگنے لگ جاتے ہیں۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''ابا اپنے کام سے مڑ آیا تھا، میرا بھا عشاء کی نماز پڑھنے مسیت چلا گیا تھا، ماں دودھ جما کے منجی تے پے گئی تھی اور میں بسترے تے لیٹ کے سوچنے لگ گئی کہ میرے سارے گھر والوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کوئی گل کیوں نہیں کرتے...... کیا ہو گیا ہے کہ نہ میرے ساتھ بولتے ہیں، نہ میرے سنگ بیٹھتے ہیں۔ نہ ہی میکوں اپنے گھر کا بندا سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کا ہردا کیوں بدل گیا اے اور ان لوگوں پر کیا وقوعہ گزر گیا ہے کہ میرے سے بے تعلق ہی ہو گئے ہیں۔ پھر میں نے پاسا بدل کر کاندھ کی طرف منہ کر لیا اور یاد کرنے لگی کہ ان گھر والوں سے تو باہر کے لوگ ہی اچھے ہیں۔'' (۴۳)

صفیہ کے گھر والے نہیں بلکہ وہ خود تبدیل ہو گئی تھی اور اب اس کا جی اپنے گھر میں نہیں لگ رہا تھا۔ اور خود کو اس ماحول میں اجنبی سمجھ رہی تھی اور اسے باہر کے لوگ اچھے لگنے لگ گئے تھے۔

اسی طرح اشفاق احمد بری صحبت اور اس کے نتائج پر بھی بحث کرتے ہیں ان کے افسانے ''رشوت'' میں شدین اپنی شادی کے دن دلہن کے پاس جانے کے بجائے جب دوستوں کے ساتھ چلا جاتا ہے تو وہ اس کو کچھ اور ہی سبق دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

''شدین نے کہا یارو کھل کر بات کرو''۔

''سن''...... چدی نے آرام سے کہنا شروع کیا۔ ''ڈولی میں ویاہی کے نال اس کی نائین آتی ہے اور......''

شدین نے کہا ''یہ کون نہیں جانتا''

گھینے نے کہا ''بے صبرا آگے بھی سن''

چدی پھر کہنے لگا...... ''سہاگ کی رات کو جہاں لڑکی سوتی ہے اس کے آس پاس نائن بھی سوتی ہے اور سہروں والے کو ویاہی سے بات کرنے نہیں دیتی۔''

''پھر!'' شدین نے پوچھا۔

''پھر کیا'' ادو نے کہا، دس پانچ اس کے ہاتھ پر رکھو......سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔

سردار سوہنیا پانچ لے کر تو منصف خون معاف کر دیتا ہے، یہ تو نہ کوئی جرم ہے نہ تقصیر۔'' (۴۴)

گناہ اور اس کی لذت کا مزہ بڑھانے والے یہ احساس بھی ختم کر دیتے ہیں کہ گناہ ہے بھی یا نہیں اور پھر ان دوستوں کی صحبت کا نتیجہ بھی نکلتا ہے اور شدین دلہن کے پاس جانے کے بجائے نائین کے پاس ہی رک جاتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''شدین نے اپنی ریشمی قمیض کی جیب سے دس کا نوٹ نکال کر نائین کے ہاتھ میں تھما دیا، نوٹ دیکھ کر وہ خوش ہو گئی اور مسکرا کر بولی ''بنی اس کوٹھڑی میں ہے''۔ لیکن شدین اٹھا نہ اس کی بات کا جواب دیا۔ جب اس نے دوبارہ کہا کہ بنی اس کوٹھڑی میں س رہی ہے تو شدین نے نائین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''اسے سونے دو۔ دفع کرو۔'' (۴۵)

بری صحبت کا برا نتیجہ نکلتا ہے اور معاشرے کا ایک فرد ہمیشہ کے لیے گناہ کے اندھیروں میں اتر جاتا ہے۔ کیونکہ شدین کا اپنی نئی زندگی کی شروعات میں پھر سے غلاظتوں میں اترنا اس بات کی علامت ہے کہ اب وہ ہمیشہ کے لیے اسی میں اتر جائے گا۔ موجودہ معاشرے میں یاروں کی محفل میں بیٹھ کر برائی کی جانب سفر آسان ہو کر رہ گیا ہے۔

اشفاق احمد اپنے انسانوں میں ذات پات کی بناء پر اور طبقاتی تقسیم کی بناء پر ہونے والے فرق کو بیان کرتے ہیں جس کی بناء پر غریب ہمیشہ بے عزت ہوتا ہے اور کسی بھی اس مقام اور مرتبے کو نہیں پہنچتا ہے جس پر امیر فائز ہوتے ہیں۔

''حیدری کو ذرا رکتے ہوئے دیکھ کر گلو بولا ''میں لے آؤں چوہدری!'' (۴۶)

اور بات ابھی اس کے منہ میں ہی تھی کہ چوہدری نے اکڑ کر کہا ''بیٹھ اوئے کم ذات! دھیوں جیسی بچھیری کی راس بیٹے کے ہاتھ میں ہی سجتی۔ تو ذات کا جولاہا، کھیس میں پھل چڑیاں ڈالنے والا! تجھے کیا پتہ گھوڑا کیا ہوتا ہے۔ اوئے میں تو تجھے اپنی شوقاں کے اگاڑی پچھاڑی بھی نہ باندھنے دوں، تو اسے واپس لانے کو کہہ رہا ہے۔''

ایسی طبقاتی تقسیم جس میں اپنے جانور کی راس بھی نیچ ذات کے انسان کو پکڑانا چوہدری توہین بات سمجھتا ہے اور ہم آج بھی اسی فرسودہ نظام میں زندہ ہیں۔ جن میں ذات پات کی تقسیم ہے، رنگ، نسل، مذہب کی، فرقوں کی تخصیص ہے۔

انسان کو انسان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ جانوروں سے بھی برا سلوک کیا جاتا ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانے ''پھمن کہانی'' میں معاشرتی زوال کی سچی تصویریں پیش کی ہیں۔ اس میں بہت سی معاشرتی برائیوں کو جہاں بے نقاب کیا ہے وہاں غریب کی بے کس اور مجبور حیات کے بھی کئی رخ دکھائے ہیں۔ جب پھمن کا ابا چوہدری کے روپے واپس نہیں کر پاتا تو چوہدری جو اس کے ساتھ سلوک کرتا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

''اس دن چوہدریاں نے میرے ابے کو چوکی بھیج کر میرے ابے کی چھترول کرائی تھی، اس کے ناک منہ سے لہو نکلا تھا تو حوالدار نے پوچھا تھا۔ ''چوہدری صاحب کے باقی کے تین سوکداں دے گا۔'' تو میرے ابے نے آکھیا تھا۔ ''میرے گھر کوئی پیسہ نئیں ناں ای کوئی ٹوم چھلا اے۔ جھوٹی وچ کے میں ادھے پیسے اتار چھڈے تھے باقی کے وی اتار دیاں گا، میری جان بخشی کرا دیؤ'' حوالدار نے میرے ابے تے تین روپے لے کر دس دن کی معافی دے دی تھی۔'' (۴۷)

درج بالا اقتباس میں غریب کی بے بسی بھی ہے، جاگیردار کا ظلم بھی ہے اور رشوت کا استعمال بھی ہے۔ جو موجودہ معاشرے کی سچی تصویریں ہیں۔ آج بھی غریب ایسی زندگی گزار رہا ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے اور نہ ہی اس کی زندگی بدلنے کے امکانات نظر آنے کی کوئی امید نظر آ رہی ہے۔ نہ صرف ایک غریب اپنی حیات میں پریشان حال ہے بلکہ مرنے کے بعد اس کو کفن میسر نہیں آتا۔ مثلاً۔

''جیونی فقیرنی کی جھگی سے بابے لوہار کا کتا باہر نکلا تو اس کے منہ میں جیونی کی آندر تھی۔'' (۴۸)

غریب جیوتی کے جینے کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی اس کی موت کا۔ اس کا وجود، زمین پر اضافی شے کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ اشفاق احمد ان حالات کو بیان کر کے موجودہ معاشرے سے ان عناصر کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں غریب کو خدا کے گھر میں بھی پناہ نہیں ملتی۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں۔

''اک دن سویرے سویرے میں سرکس چھڈ کے نس گیا۔ نال ای مینہ برسن لگ گیا تے میں اک مسیت وچ بڑ گیا۔ میرے بیٹھن نال صف بھیج گئی تے مولوی نے میرا کن پکڑ کے مینوں باہر نکال دیا۔ باہر نکل کے میں ہور بھج گیا تے مینوں سیت چڑھ گئی۔'' (۴۹)

درج بالا اقتباس میں اشفاق احمد نے معاشرے سے بیزار اور ظلم و ستم سے بھاگے ہوؤں کے لیے پناہ کا ہر دروازہ

بند ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ مولوی بھی ایسے دھتکارے ہوئے لوگوں کو کان سے پکڑ کر نکال دیتا ہے کیونکہ اس کو بھی ان کی ذات میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اشفاق احمد انہی رویوں کی درستگی اور اصلاح چاہتے ہیں تا کہ موجودہ معاشرے کی بگڑی ہوئی شکل کو درست کیا جا سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پہلے زمانے میں امیروں کے بچے لاڈلے، نالائق اور عیاش ہو جاتے تھے اور غریبوں کے محنتی، جفاکش اور مستعد بچے ان سے آگے نکل جاتے تھے، اب یہ بات نہیں رہی۔ اس وقت یونیورسٹیوں، کالجوں، اداروں، درس گاہوں میں اول آنے والے سب امیروں کی اولاد ہوتے ہیں۔ صاحب حیثیت لوگوں کے بچے ہر وقت غریبی اور افلاس کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ یہ خوف ایک چھوت کی بیماری بن کر ان کی روحوں میں سرائیت کر گیا ہے اور وہ ہر طرح کی لذت اور ذائقے سے محروم ہو گئے ہیں۔'' (۵۰)

مادیت پرستی کا دور دورہ ہے اشیاء سے محبت ہے اور ان کے حصول میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی اور ان کی چاہت کے سامنے کوئی اور چاہ ٹھہر نہیں سکتی ہے۔ جیسے کہ ''سونی'' میں وی سی آر سے محبت بیوی سے زیادہ ہے۔

''سونی وی سی آر کے لیے استعمال کا لفظ سن کر اس دیدہ دلیری پر دلگیر ہو کر ملک التجار بختیار کی روح بلبلا اٹھی۔ اس نے دردناک لہجے میں کہا ''سونی واقعی میری جان ہے، میں اپنے ہاتھ سے اٹھا کر کسی کو نہیں دے سکتا۔ میرے بعد خود اٹھا کر لے جانا، بڑے شوق سے۔'' (۵۱)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں معاشرتی انحطاط کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے بڑے واضح انداز میں بیان کرتے ہیں کہ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی بھی فرد تنہا کسی بھی اچھے یا برے فعل کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ اس بارے میں تجمل حسین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

''اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ معاشرہ فرد کے بغیر اور فرد معاشرہ کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس لیے بعض ماہرین معاشرہ کو ایک جسم اور فرد کو ایک عضو سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ جس طرح جسم کے مختلف اعضاء اپنا اپنا کام مخصوص طور پر کرنے کے باوجود باہمی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں مل کر تمام کام سرانجام دیتے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ کے افراد اپنے اپنے کام اور باہمی تعلقات سے معاشرے کا نظام قائم رکھتے ہیں۔'' (۵۲)

اسی لیے جب کوئی فرد برائی کی طرف اپنے قدم بڑھاتا ہے تو اس کو روکنا سب کا فرض ہے اور اگر نہیں روکتے تو اس کے جرم میں برابر کا شریک ہوتے ہیں۔ فرد اور معاشرہ ایک جسم کی طرح ایک دوسرے کے محتاج اور شریک ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ''سعید جونیر'' اگر بددیانتی، رشوت کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ اکیلا اس کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ بلکہ اردگرد کے افراد اسے ایسا بناتے ہیں۔ اشفاق احمد اپنے افسانے ''سعید جونیر'' میں سعید احمد کے رشوت خور ہونے کی وضاحت اس طرح سے کرتے ہیں کہ:

> ''دکاندار، آڑھتی، کارخانے دار اور امپورٹر وغیرہ بددیانت کارندے کا دل سے احترام کرتے ہیں اور اس کی بددیانتی کو تقویت عطا کرنے کے لیے ہر مشکل کام میں اسی کا ساتھ دیتے ہیں۔ سعید احمد کو یہ سہارا مفتا مفت فراہم ہو گیا اور وہ شہر کے معزز لوگوں کی انجمن کا معمولی رکن بننے کے لیے نامزدگی کے دائرے میں آ گیا۔'' (۵۳)

اور جس معاشرے میں حکومت عوام کے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتی وہاں کے عوام میں اعتماد نہیں آ سکے گا اور ملک تباہی کا شکار ہو جائے گا۔ اس بارے میں تجمل حسین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

> ''حکومتیں اس وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک وہ عوام کے حقوق کی نگہداشت کرتی اور انھیں روزمرہ کی ضروریات بہم پہنچانے کا اقدام کرتی ہیں...... کیونکہ عوام حکومت کی جان ہوتے ہیں اور حکومت عوام کی روح کے اصل میں عوام اور حکومت ایک ہی کشتی کے سوار ہوتے ہیں۔'' (۵۴)

اس لیے حکومت اور عوام دونوں کا ایک دوسرے سے تعاون کرنا کسی بھی صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے بے حد ضروری ہے۔

ایسی صورتحال سے حتی الامکان اجتناب کرنا چاہیے جس سے معاشرے کے افراد میں غلامانہ سوچ ابھرے اور بے بسی کا احساس ان کو بے حسی کی جانب لے جائیں۔ اس بارے میں اشفاق احمد اپنے افسانے ''آخری حملہ'' میں موجودہ معاشرتی صورتحال کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تم ایک خوف زدہ اور ڈرپوک قوم کے ڈرپوک سپاہی ہو اور تم میں اس ہزیمت خوردہ قوم کی ساری قباحتیں اور نحوستیں پیدا ہو چکی ہیں جو کئی صدیوں تک دوسروں کی غلام رہ چکی ہوتی ہے۔'' (۵۵)

اشفاق احمد کے مطابق جس ملک کے حکمران ظالم ہوتے ہیں۔ اس کے عوام بھی اس ظلم اور بے حسی میں برابر کے شریک

ہوتے ہیں کیونکہ وہ بلا سوچے سمجھے حکمرانوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانے ''کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کہاں جا رہا ہوں یا یہ مجھے کدھر لے جا رہے ہیں......جس طرح لیڈروں کے پیچھے ان کے عوام چپ چاپ چلتے رہتے ہیں اور ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں اور ان کے لیڈروں کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اپنے عوام کو کدھر لے جا رہے ہیں، ایسی ہی کچھ میری کیفیت تھی۔'' (۵۶)

موجودہ معاشرہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اب وہ پہلے والا زمانہ نہیں رہا کھلی کائنات کا، اب یہاں بھی گھپلے بازی ہونے لگی ہے۔'' (۵۷)

جھوٹ، دھوکے، فریب جیسے عناصر نے ہمارے معاشرے میں بد اخلاقی اور غیر انسانی رویوں کو جنم دیا ہے۔ علم کی کمی نے لڑائی جھگڑے اور افراتفری کے امکانات بڑھا دیئے ہیں۔ محبت اور یگانگت خواب وخیال ہو چکے ہیں۔ ہر شخص ہر وقت کچھ نہ کچھ تلاش کرتا رہتا ہے۔ اس کی کم فہمی اور کم علمی اس کو ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتے۔ اس معاشرے سے چھٹکارے کے لیے اشفاق احمد ''قلارے، جیسا ستارہ دریافت کرتے ہیں جہاں یہ سب برائیاں موجود نہیں ہیں جو ہمارے معاشروں کا حصہ بن چکی ہیں۔ ان برائیوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ جو ہمارے معاشروں میں ہر وقت ایک افراتفری بھاگا دوڑی، تانا بتھاری اور بوجھ بجھول سی لگی رہتی ہے اور ہر فرد، ہر معاشرہ، ہر گروہ اور ہر ملک دوسروں کی سوئیاں لیتا رہتا ہے تو یہ بات ماہڑا کی عظیم الشان بستی میں نہیں تھی۔'' (۵۸)

اس لیے زمین کی نسبت قدرے پر امن سکون تھا محبت کا گہوارہ تھا نہ اندرونی نہ بیرونی لڑائی کا خطرہ تھا اور ایسا ہی معاشرہ اشفاق احمد زمین پر چاہتے ہیں۔

ہمارے موجوہ معاشرہ کی ایک اور عمدہ مثال اشفاق احمد کے افسانے ''چھ چھکا بتیس'' میں دکھائی دیتی ہے جہاں ایک ذہین وفطین ماہر پروفیسر کو ایک طے شدہ فارمولے سے انحراف کی وجہ سے اس دور کا بادشاہ غیر ملکی نمائندوں کے حوالے کر دیتا ہے کیونکہ وہ پروفیسر صاحب کے اس انحراف سے ڈر جاتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ:

''پروفیسر ساعتی کا طے شدہ قاعدے سے انحراف خطرے کی ایک گھنٹی ہے۔ یہ صرف ان کی ذہنی کج روی نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے پورا ایک سسٹم کام کر رہا ہے جس سے آپ سب بے خبر ہیں۔'' (۵۹)

غیرملکی نمائندے پروفیسر ساعتی کی ذہانت سے خوفزدہ ہیں کہ کہیں یہ کوئی بڑا کارنامہ نہ سرانجام دے دیں جبکہ ہمارے ہاں اس پروفیسر کی بات سمجھنے کی بجائے اس سے جھگڑا کیا جاتا ہے۔ یا سائیں کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حکمران عوام اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے کی بجائے انھیں کسی بھی طرح کا نقصان پہنچانے یا پہنچنے میں کوئی ہمدردی نہیں رکھتے اسی افسانے ''چھ چیکا بتیس'' میں ملاحظہ فرمائیے:

''چونکہ اس وقت ایک مطلق العنان بادشاہ یہاں حکمران تھا اور کوئی پوچھنے والا نہیں تھا اس لیے بادشاہ نے حکم دیا کہ ''ہمارے مہمانان گرامی غیرملکی نمائندے جو قرضے کی بوجھل رقم اٹھا کر یہاں تشریف لائے ہیں، اگر مناسب سمجھیں تو ہماری رعایا کے ایک فرد، چالوسوچ کے منحرف پروفیسر ساعتی کو خود گرفتار کر کے لے جائیں اور اپنے ملک کے کسی قید خانے میں قید کر دیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں اور اگر ہم پر اعتبار کریں تو بے شک ہماری سلطنت کے کسی بھی پسندیدہ قید خانے میں ڈال کر تالا لگا دیں اور چابی اپنے ساتھ لے جائیں۔'' (۶۰)

اشفاق احمد معاشرے کی حقیقی تصویر پوری باریک بینی اور گہرائی سے ہمارے سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں، فرد اور معاشرے کا گہرا تعلق ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے اس بارے میں تجمل حسین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ معاشرے میں فرد کی کوئی حیثیت نہیں اور فرد معاشرہ پر اثر نہیں ڈال سکتا یا یہ کہ معاشرہ کے بالمقابل فرد کی کیا اہمیت ہے یہ ایسی باتیں ہیں جو کم فہمی پر مبنی ہیں اور دانستہ یا نادانستہ طور پر اہمیت کم کرنے کی کوشش ہے اصل میں فرد اور معاشرے کا تعلق (Feed Back) کے اصول پر قائم ہے۔'' (۶۱)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں جہاں زمین پر ہونے والی اخلاقی تباہی و بربادی کو بیان کرتے ہیں وہاں کرہ ارض پر مختلف ممالک اور ان کے درمیان تعلقات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک ضروری نہیں ہے کہ اخلاقی برتری بھی رکھتے ہوں مثلاً 'فلارے'' میں وہ بیان کرتے ہیں کہ:

''شہزادان کی باتیں سن کر ویسے ہی شرمندہ ہوتا جیسے ترقی یافتہ ممالک کے فہمیدہ اور زیرک ایکسپرٹ غریب اور پسماندہ ملکوں کے حاکموں اور اہلکاروں کو اپنی گفتگو سے شرمندہ کیا کرتے ہیں۔'' (۶۲)

ترقی یافتہ ممالک کا رویہ، غریب اور پس ماندہ ممالک کے ساتھ حقیر اور جارحانہ رہتا ہے اور ترقی یافتہ ممالک اپنی ترقی کے نشے میں چور من مانیاں کرتے ہیں اور خود کو دوسروں سے اعلیٰ و افضل گردانتے ہیں جس سے دوسرے ممالک احساس کمتری اور شرمندگی میں مبتلا رہتے ہیں۔

اشفاق احمد زمین کی محبت کو انسان کا دشمن خیال کرتے ہیں کہ یہ زمین کا جھگڑا ہی ہے جو زمین کو انسان کے خون سے رنگ دیتا ہے اور زمین کی یہی کشش انسانی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''زمین کی کشش، کشش ثقل تھی اور اس کے اپنے ستارے قلارے کی کشش صقل تھی۔ کشش ثقل انسان کو انسانوں کے قتل پر آمادہ کرتی تھی اور پھر قتل کرنے پر مجبور بھی کرتی تھی۔'' (۶۳)

یہی وجہ ہے کہ جب شہزاد، ستارے سے زمین پر پہنچتا تو کشش ثقل اس کو بدل کر رکھ دیتی تھی۔ مثلاً

''جونہی وہ زمین کے مدار میں داخل ہوا اور اس کے وجود پر کشش ثقل کی کھینچ پڑی تو اس نے ندیم اور رعنا کو ماں بہن کی گندی گالیاں دینا شروع کر دیں اور تھوک کے بڑے بڑے تھوبے زمین پر گرانے لگا۔'' (۶۴)

موجودہ معاشرے میں کسی بھی مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے بیٹھیں تو وہ آپس کی ضد کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر کوئی اپنی ضد پر قائم رہتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی مسئلہ ہو تو ہر کسی کو انفرادی آرام و سکون کی فکر میں پڑ جاتا ہے اور نقصان کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال دیتا ہے۔ بہادری کا جذبہ مفقود ہوتا جا رہا ہے اور بزدلی اور سہل پسندی بڑھتی جا رہی ہے۔ مثلاً ''بولتا بندر'' میں اشفاق احمد انسان کے سروائیول کو مشکل گردانتے ہیں اگر ایسا ہی معاشرہ موجود رہا تو زندگی کے امکانات کم ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہماری ان دنوں ایک بڑی عالمی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں ہماری جاتی کے لوگوں نے یہ پھڈا ڈالا ہوا تھا کہ اگر بقائے اصلح یعنی سروائیول آف دی فیٹسٹ ہی ارتقائی تھیوری کی بنیاد ہے تو پھر اس کرہ ارض کے اعلیٰ ترین اور ارفع ترین اور طاقت ور ترین شہر تو اس دنیا میں کم ہو رہے ہیں اور ناکارہ و نحیف ہرنیوں کی لرزاں و افتاں ڈاریں موج در موج بڑھتی جا رہی ہیں اس دنیا میں عقاب اور شاہین تو مٹتے جا رہے ہیں لیکن چڑیوں، پدیوں اور ممولوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔'' (۶۵)

اپنے مقصد کے حصول کے لیے جان لڑا دینے والے لوگ کم ہوتے جا رہے ہیں اور ناکارہ اور کمزور لوگ روز بروز

پھیلتے جا رہے ہیں۔محنتی اور ہنرمند لوگ پیچھے اور خوشامدی اور منہ چڑے لوگ آگے آتے جا رہے ہیں۔ اسی لیے موجودہ معاشرہ ایسی کمزور بنیاد پر قائم ہے جس کو سہارا دینے کے لیے کوئی مضبوط آسرانہیں ہے۔

اشفاق احمد بیان کرتے ہیں کہ غیر ملکی نظریات ہوں یا موضوعات ہم ذہنی طور پر ان سے مرعوب رہتے ہیں اور انہی کو سلام پیش کرتے ہیں جبکہ یہی بات یا نظریہ کوئی دیسی شخص پیش کرے تو یا تو اسے نظرانداز کر دیا جاتا ہے یا پھر ہنسی میں اڑا دیا جاتا ہے۔

اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''ہم نے اس وقت تو تالی بجا کر اور تھری چیئرز فار ماما'' کر کے اماں کو ان کی تحقیق پر شرمندہ کر دیا لیکن آج میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس وقت مغربی ممالک میں میموری کے ڈسپلن پر جو ریسرچ ہو رہی ہے، اگر کسی نے یہی بات سلیقے کے ساتھ کسی ولایتی زبان میں کھول کر بیان کر دی تو سائنسی دنیا میں ایک نمایاں تبدیلی آ جائے گی۔''(٦٦)

موجودہ معاشرے کا بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنی مٹی، اپنے وطن، اپنے لوگوں، اپنے نظریات سے محبت نہیں رکھتے۔ حکومتی سطح پر غریبوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ لاکھ ان کے سامنے غربت کا رونا رویا جائے۔ مجبوری اور بے کسی کے حالات رقم کیے جائیں کسی پر کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''ہماری غریبی کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ سن کر پتھروں کے دل بھی پانی ہو جائیں لیکن حکومت کو کوئی پروا ہی نہیں، سب اپنے حلوے مانڈے میں مگن ہیں۔''(٦٧)

موجودہ معاشرے میں یا تو غریبوں کا مذاق بنایا جاتا ہے اور نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی ان کی مدد کے لیے آگے آئے بھی تو اس میں سراسر اس کا اپنا بہت بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ آج بہت سے فلاحی اداروں کا قیام محض نام کی خدمت میں مصروف ہے۔ اگر کسی غریب کو پانچ روپے عنایت کیے جاتے ہیں تو اپنی جیب میں پانچ کروڑ ڈالے جاتے ہیں۔ اب غریب کی مدد محض دکھاوے اور شہرت کے حصل کے لیے کی جاتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''شرفو نے کہا'' جب تک یہ لوگوں کے دکھ اور لوگوں کی غریبی نہ بیچیں، ان کا کاروبار آگے نہیں بڑھتا اور ان کی نیک نامی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے ان کی نیک نامی بڑھتی ہے، ویسے ویسے ان کے کاروبار

میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بڑی زبردست تجارت ہے اور ساری دنیا میں اس کی مانگ ہے۔'' (۶۸)

غریب، بیمار، بے بس، اپاہج، مفلوج اور ناکارہ لوگوں کی کبھی تصویریں اتار کر، کبھی فلمیں بنا کر ان کی بے کسی کو کیش کروایا جاتا ہے اور ان کی غربت کو بیچ کر اپنے بینک بھرے جاتے ہیں اور نیک نامی کے تمغے سجائے جاتے ہیں۔

معاشرتی سطح پر بہتری لانے کے لیے ہمارے پاس اپنی کوئی سوچ یا نظریہ موجود نہیں ہے۔ ہم دوسروں پر انحصار کرتے ہیں۔ ابھی تک ذہنی طور پر ہم غلام ہیں اور غلامانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ جس کا اعادہ اشفاق احمد نے جا بجا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اصل میں نظریات ہمارے ہاں مینوفیکچر نہیں ہوتے، سارے باہر ہی سے امپورٹ ہوتے ہیں۔ نئے تو ہم خرید نہیں سکتے اس لیے استعمال شدہ سے ہی کام چلانا پڑتا ہے۔'' (۶۹)

موجودہ معاشرے میں نہ تو اپنے نظریات کی کوئی قدر ہے اور نہ ہی نظریات کو پیش کرنے والے کو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً

''اس ملک میں ادیب، آرٹسٹ، فن کار کی کوئی قدر نہیں۔'' (۷۰)

ماسٹر روشی کی طرح یہاں کئی بڑے بڑے آرٹسٹ اپنی عمر کے آخری ایام میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں اور زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اشفاق احمد ایک بڑے فنکار کی جلد وفات پر دوسرے فنکار کے خیالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ماسٹر روشی! محمد حسین میں بڑی جان تھی، بڑی ادائیگی تھی، بڑا فن کو سمجھنے والا تھا۔ افسوس اس کی عمر نے وفا نہ کی نہیں تو اپنے وقت کا عظیم اداکار ہوتا۔ اس کے کام کرنے میں مزا آتا تھا۔ کیمرے کی طرف چہرہ اٹھا کر، لیکن خواتین و حضرات، اچھا ہی ہوا کہ وہ مر گیا اور اس بے دید اور بے مروت دنیا کو چھوڑ گیا۔ آخر اس کو کیا مل جاتا! یہ واہ واہ کرنے والے اس کو کیا دے دیتے۔'' (۷۱)

یہ موجودہ معاشرہ کہ جب تک آرٹسٹ دل بہلاتا رہے واہ واہ گونجتی رہے اور جیسے ہی وہ اپنی عمر کے آخری ایام میں پہنچے اس سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ جہاں اشفاق احمد اس کی اور بہت سی وجوہات کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہاں طبقاتی نظام کی بڑی وجہ کو خاص طور پر واضح کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرتی انحطاط کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم مختلف طبقات میں بٹی

ہوئی قوم ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''افسوس کہ طبقاتی نظام میں حالات کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتے۔ خاص طور پر فنکاروں، ادیبوں، شاعروں اور تخلیقی صلاحیت رکھنے والوں کے ساتھ بہت زیادتی کرتے ہیں۔'' (۷۲)

اس تقسیم نے ایک ہی معاشرے میں رہنے والے مختلف افراد میں تقسیم کر دی ہے کہ ان کی ہر شے بٹی ہوئی ہے۔ اور بادشاہی، تخت و تاج، حکمرانی سب بانٹ دیئے گئے ہیں۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''راج پاٹھ بول بھاشن والوں کے لیے ہوگا اور گیت سلامیاں راج مستری کے لیے ہوں گی۔ تخت اور تاج علم والوں کے پاس رہے گا جبکہ شاعری شاباشی ہنرمندوں، محنت کشوں کے لیے ہوگی۔ بادشاہی اور حکمرانی بے ہنر، بے محنت، بے تعلق، بے اعتبار گفتگو بازوں اور پھوکے ایدیشکوں کے پاس رہے گی جبکہ تھاپی تھاپڑا کسان کاشت کار کے لیے ہوگا۔ رائل فیملی ذکر اذکار اور باتیں کرنے والوں کی ہوگی اور پچھکار چمکار کی رائلٹی ہنرمندوں کو ملے گی۔'' (۷۳)

درج بالا اقتباس سے صاف واضح ہے کہ دھن، دولت، شہرت کی تقسیم کن پیمانوں میں بانٹ دی گئی ہے۔ موجودہ معاشرہ اسی بنیاد پر تشکیل شدہ دکھائی دیتا ہے اور بڑھتی ہوئی ترقی نے اس سوچ میں رتی بھر بھی تبدیلی نہیں کی۔ بلکہ آج لوگ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کو، کب کس کو کس طرح سے خوش رکھنا ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ معاشرتی زندگی نہیں گزار سکتے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''اب زمانہ اکیسویں صدی میں داخل ہو رہا ہے۔ اس لیے لوگ آزادی کی قدر و قیمت جان گئے ہیں اور رجعتوں کی وادیوں میں گھرے ہوئے بدنصیبوں کو آزاد کرانے کے لیے ان پر وقفے وقفے بعد میزائل بھیج رہے ہیں ایسے دور میں ہر شخص کو یہ رقبہ یاد ہونا چاہیے اور حاکمات وقت کو مہربان رکھنے کے لیے ان کا جاپ کرتے رہنا چاہیے۔'' (۷۴)

موجودہ صورتحال میں جب تک حکمرانوں کی چاپلوسی اور خوشامد نہ کی جائے گی تب تک زندگی کی سانس چلتی رہے گی یہ ایک ایسا معاشرہ جہاں بات کرنے کو زبان ترستی رہتی ہے۔ کوئی اپنے دل کی بات کھل کر نہیں کرسکتا ہے، اشفاق احمد لکھتے ہیں:

''یہ سیٹھوں اور تاجروں کا اور جاگیرداروں کا ملک ہے۔ یہاں ہماری نہیں افسر شاہی کی عزت زیادہ

ہے...... بے ایمانوں، مکاروں اور چور بازاروں کی زیادہ وقعت ہے۔‘‘(۷۵)

ایسے معاشرے میں جہاں ادیبوں، شاعروں کا کوئی مقام نہ ہواور نہ ہی عزت کہیں سے توقع کی جائے گی وہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرے، اس کی ابتری کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اشفاق احمد اس کی وجوہات کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ کیوں ہم اپنے نظریات کے بارے میں خودکفیل نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں علم اور اہل علم کی عزت نہیں ہے اور تعلیم عام نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

’’لیکن مشرقی ممالک میں چونکہ تعلیم عام نہیں اور علم سے محبت نہیں اس لیے برق انداز اس مرتبہ بھی اس مشن کو ادھورا چھوڑ کر آ جائے گا۔ ہم نے روپے کا لالچ بڑھا دیا ہے اور معرکہ مارنے کی فیس دگنی کر دی ہے۔‘‘(۷۶)

جس معاشرے میں تعلیم عام نہیں ہوگی وہاں لوگوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو جائیں گی اور اچھے برے میں امتیاز سے ناواقف رہیں گے۔ پھر ان پر کوئی بھی سوچ تھوپ دی جائے وہ اس کے مطیع ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ایک مخصوص طبقہ ہے جو عوام کو اپنی مرضی کے مطابق چلا رہا ہے اور اپنی مرضی سے عوام کا استعمال بھی کرتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

’’پاکستان کا اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ طبقہ جو مشکل سے دو یا سوا دو یا حد ڈھائی فیصد تک ہے بالکل ہماری طرح کی سوچ رکھتا ہے اور ہماری طرز زندگی کو اپنائے ہوئے ہے۔ یہی اس ملک کا رائے گر طبقہ ہے اور اسی کی یہاں پر حکمرانی ہے۔ یہی طبقہ Trend Setter ہے اور ہر جگہ اسی کا سکہ چلتا ہے گویا اس عہد کی ایسٹ انڈیا کمپنی یہی ہے۔ باقی سارے لوگ عہد مغلیہ کے آخری شہزادے ہیں۔ ذہنی طور پر بودے، جسمانی طور پر تودے اور ہر ایک کے لیے بکاؤ سودے......‘‘(۷۷)

مذکور بالا اقتباس میں اشفاق احمد موجودہ معاشرے کے پڑھے لکھے طبقے کا اصل چہرہ بے نقاب کر دیتے ہیں کہ پاکستان کی موجودہ صورتحال دراصل ہے کیا؟ یہاں سب کچھ جائز ہے ہر شے کی آزادی ہے۔ سبھی کام ہو رہے ہیں، صرف اپنے اصل مقصد کو بھول گئے ہیں جس مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا تھا اس مشن کی تکمیل کہیں کھوگئی ہے۔ اپنے وطن کے سوا ہمیں ہر چیز عزیز ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''جس طرح بیوی سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے نوجوان کو اپنے ماں باپ کی بجائے بیوی کے والدین اور اس کے گھر والے اچھے لگنے لگ جاتے ہیں اسی طرح پسماندہ قوموں میں علم سے محبت کرنے والی نسل کو گورا اور اس کے گھر والے اور ان کے ملک اور ان کے انداز اور ان کی ادائیں اچھی لگنے لگتی ہیں......اپنے ملک، اپنے ملک کے لوگ، اپنے گھر، اپنی مائیں بری لگنے لگتی ہیں۔'' (۷۸)

آج پڑھا لکھا طبقہ گورا صاحب سے مرعوب ہے، جن سے جان چھڑائی تھی ان ہی کے کلچر کو، زبان کو، انداز، رہن سہن، لہجے کو اپنا کر خود کو دوسروں سے برتر سمجھا جاتا ہے اور اپنی تسکین کی جاتی ہے۔ نئی نسل پرانی سے نالاں اور ناراض نظر آتی ہے۔ بزرگوں کے لیے عزت و احترام کے جذبات کی جگہ حقارت نے لے لی ہیں۔ بچے اپنے بڑے بزرگوں کو بے وقوف اور کم عقل سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں کہ آج ہماری چھوٹی نسل کے سامنے ہم بالکل بودے بن کر رہ گئے ہیں۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''میں تو اتنی عمر گزارنے کے بعد بس ایک ہی بات سمجھ سکا ہوں کہ جس ملک کے مسودے، مخطوطے، مورتیاں اور ممیاں گورا اٹھا کر اپنے ملک میں لے گیا، اس ملک کی چھوٹی نسل اپنی بزرگ نسل سے نالاں اور ناراض رہ کر ہی پروان چڑھی اور پھر اپنے بڑے ہونے پر آنے والی چھوٹی نسل کی لعنت ملازمت کا ہدف بن گئی کہ جاؤ جاہلو، علم کے دشمنو! تم تو اپنے علم کی حفاظت بھی نہ ہو سکی۔'' (۷۹)

موجودہ دور میں ہم اپنے سے چھوٹی نسل کی نظر میں معتبر نہیں رہے۔ کیونکہ علم سے محبت کے سر پر ہی آج گورا سب بے گوری قوموں پر حکومت کر رہا ہے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان قوموں کو علم سے بے بہرہ کر کے ہی وہ ان پر حکومت کر سکتا ہے۔ اس لیے اس نے ہر ملک سے قیمتی مسودے اور مخطوطے اپنے ملک لے جا کر محفوظ کر لیے۔ وہ علم دوست ہیں اس لیے حکمران بھی ہیں۔ اسی لیے اشفاق احمد کہتے ہیں کہ اسباب زوال صرف علم کی محبت کا نہ ہونا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اسباب زوال امت بس ایک ہی ہے اور وہ ہے علم سے دوری، علم سے بیگانگی، علم سے نفرت......مسلمان کی تباہی کا راز ہی اس حقیقت میں چھپا ہوا ہے کہ مسلمان نے شروع دن سے علم سے محبت نہیں کیا۔ اس کو غیر ضروری سمجھا اور اس کو حاصل کرنے کے واسطے کوئی کوشش نہیں کی۔ نہ آج نہ کل۔ نہ ہی آگے اس کے واسطے کوئی کوشش کا خیال ہے۔ اور یہ ہمارے پاکستان میں ہی نہیں باجا بیگم، کل مسلمان ملکوں میں اس کا

یہی حال ہے۔علم داخلہ ہر جگہ بند ہے،علم کے اوپر ہر مسلمان کے گھر ٹیکس لگا ہوا ہے۔'' (۸۰)

اشفاق احمد نہ صرف پاکستان میں زوال کی وجہ، برے حالات کی وجہ علم سے دوری اور محرومی قرار دیتے ہیں بلکہ جس جگہ بھی مسلمان ہیں وہ علم کی محبت سے خالی ہیں یہی وجہ ہے کہ زوال کا شکار ہیں۔

اشفاق احمد موجودہ معاشرے میں ایک ''لیڈر'' کے رول کی بات کرتے ہیں کہ ایک عام شخص کس طرح لیڈر بن جاتا ہے۔اور آج کے دور میں لیڈر میں کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ملاحظہ فرمائیے:

''اس وقت لیڈر کے دو رول ہوتے ہیں: جارح، ظالم،حملہ آور اور محافظ سر پرست، کمزور بندر اس کو صرف محافظ اور سر پرست سمجھتا ہے اور ظالم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اسی میں گھسا چلا آتا ہے اور یوں اس کی خوب پٹائی ہوتی ہے۔اگر ایسے موقع پر کمزور اور دست نگر بھاگ جائے تو لیڈر کے عتاب سے بآسانی بچ سکتا ہے لیکن کمزور اور زبردست بندر کی یہی نفسیات ہوتی ہے کہ وہ علاقے کے زور آور لدھے بندر (جس نے ظالم کا روپ اختیار کر رکھا ہے) کی خدمت میں سر جھکائے جاتا ہے، پیچھا اٹھائے جاتا ہے۔'' (۸۱)

ہمارے ہاں راہنماؤں اور حکمرانوں کا یہ حال ہے اور کمزور عوام ہیں کہ جنہیں جہاں تک چاہو جب تک چاہو جوتے کے نیچے جھکائے رکھو، یہ نفسیاتی طور پر ہی محکوم رہیں گے اور جھکتے چلے جائیں گے۔کیونکہ وہ ذہنی طور پر اس قابل نہیں ہوئے کہ جابر اور ظالم حکمران کے سامنے کھڑے ہو سکیں یا اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر سکیں۔اشفاق احمد موجودہ معاشرے کی اخلاقی برائیوں کو دیکھ کر آنسو بہاتے نظر آتے ہیں کیونکہ اس کے سوا کوئی فوری حل ان کی سمجھ سے باہر نظر آتا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

''اسے اپنے معاشرے کی بے ایمانیوں، بدنیتیوں، بے اخلاقیوں اور بدنمائیوں پر رونا آ رہا تھا۔اس نے دردانگیز آواز میں ''اللہ جی'' کہہ کر خدا کو پکارا اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے چشمے ابل پڑے۔صدیق بلک بلک کر رو دیا۔روتے روتے سسکیوں میں اترا اور سسکیاں بھرتے بھرتے گہری نیند سو گیا۔'' (۸۲)

ایسے حالات میں اللہ کی مدد ہی صورتحال کو بہتر بنا سکتی ہے جبکہ موجودہ دور میں ایمان کی حال یہ ہے کہ کہیں بھی نظر نہیں آتا بلکہ اگر سب کی تلاشی بھی لو کہیں کسی کے پاس شاذ ہی نظر آئے۔ہم میں سے بہت سے لوگ اس کے بغیر ہی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ملاحظہ فرمائیے:

''حوالدار صاحب نے دو سپاہیوں کی مدد سے بس کے اندر سب کی جامہ تلاشی لی لیکن کسی سے فریاد کنندہ کا ایمان دستیاب نہ ہوا۔ ساری بس میں کسی کے پاس اپنا ایمان بھی نہیں تھا سوائے ایک بابا ماشکی کے جس کی ایمان بک سے ساری عبارت مع بابا ماشکی کے نام اور اس کی ولدیت کے دھل چکی تھی، بس ایک مہر باقی رہ گئی تھی جو اپنی پوری آب و تاب سے قائم تھی اور جس کا ایک ایک لفظ صاف پڑھا جاتا تھا۔'' (۸۳)

اشفاق احمد کے مطابق ہم اپنے ایمان استعمال کو اپنے پاس ہی نہیں رکھتے اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں بلکہ اپنی مرضی کے مطابق اس کو کبھی تالوں میں، ٹرنک میں، بینک لاکرز میں محفوظ کر دیتے ہیں اور جب چاہے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور اپنے اصولوں کے مطابق ہی چلاتے ہیں۔ اور اس معاشرے میں جو شخص اپنی مرضی کے مطابق زندگی اپنے اصولوں کے مطابق گزارنا چاہے۔ اس کو سزا دی جاتی ہے تاکہ اس کی آنے والی نسلیں آزادی فکر کے عملی اظہار سے توبہ کر لیں۔ جس طرح ''قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا'' میں ماسٹر عبدالودود جب اپنی مرضی سے اپنا حق چھوڑ دیتا ہے تو اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے کہ اس کی آنے والی نسلیں بھی اس سے توبہ کریں۔ ملاحظہ فرمائیے:

''لیکن بگے نورے پارٹی کے لوگ منہ کالے والے ماسٹر ودود کو گدھے سے اترنے نہیں دیتے تھے اور چھوٹے شاہ مراد کو جلوس سے بھاگنے نہیں دیتے تھے کہ اس کو بھی عبرت ہو اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنی مرضی سے اپنا جائز اور پیدائشی حق چھوڑنے والا نہ بن جائے۔ گدھے پر بیٹھا ہوا ماسٹر عبدالودود اپنے بے بس اور مجبور بیٹے کو بار بار گردن گھما کر اس لیے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی گردن میں پرانے کھوسڑوں اور سوکھے لتروں کے کئی ہار تھے۔ جن میں اس کی ٹھوڑی ڈوبی ہوئی تھی۔'' (۸۴)

اس سے صاف واضح ہے کہ اس معاشرے میں آزادی رائے کا عملی اظہار کرنے والوں کے ساتھ بری طرح سے نپٹا جاتا ہے۔

اشفاق احمد موجودہ معاشرے میں عام گھروں میں اور کوٹھوں میں پائی جانے والی رونقوں کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب ایک طوائف زادی سے کوٹھوں کی رونق کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ:

''اب گھروں میں ہی اتنی رونقیں ہو گئی ہیں کہ لوگوں کو ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اگلے زمانے میں جس چیز کی تلاش میں لوگ ہمارے پاس آیا کرتے تھے، وہ اب گھروں میں ہی مل جاتی

ہے۔ کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتا پھرے۔'' (۸۵)

اخلاقی انحطاط اب معاشرے میں ناسور کی طرح پھیل گیا ہے۔ عریانی، فحاشی اور بدکاری کے اڈے پر گھر میں کھلے پڑے ہیں جو عیاشیاں بالا خانوں تک محدود تھیں وہ گھر گھر میں میسر ہیں۔ شرفاء کی اولادوں نے میوزیکل گروپ بنا کر طوائفوں کو مات دے دی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

''وہ لوگ بھی گاؤں چھوڑ کر شہروں میں آ گئے ہیں اور ان کی زندگیاں بھی شہر والوں جیسی ہو گئی ہیں۔ بڑے بزرگ تو سیاست میں چلے گئے ہیں اور ان کی اولادوں نے شہری لڑکے لڑکیوں کے ساتھ مل کر اپنے میوزیکل گروپس بنا لئے ہیں۔ اب وہ گانا سننے نہیں آتے، گانے بجانے آتے ہیں۔ یہ گروپ جو اس وقت اکمپنی منٹ دے رہا ہے ایک رات کے گیارہ ہزار لیتا ہے...... وہ بھی بڑی خوشامدوں اور سفارشوں کے ساتھ۔'' (۸۶)

موجود معاشرے میں شرفاء وہ سامان تفریح فراہم کر رہے ہیں جو طوائفوں سے مخصوص ہوا کرتا تھا اس لیے کوٹھے سنسان اور ویران پڑے ہیں۔

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں انسان کو نہ ہی اپنے شریک حیات کی پروا رہی ہے اور نہ ہی پہلے زمانوں کی ماؤں کی طرح مائیں اپنے بچے خود پالتی ہیں بلکہ وہ نوکروں کے ہاتھوں میں بڑے ہوتے ہیں جبکہ جانوروں کا چلن وہی ہے جو ازمنہ قدیم سے تھا۔ وہ آج بھی اپنے جوڑوں اور بچوں کی پروا کرتے ہیں۔ اشفاق احمد اپنے افسانے ''اٹوٹ مان'' ہیں اس کو یوں بیان کرتے ہیں:

''انسان اپنے جوڑے کی اتنی پروا نہیں کرتا جتنی ہم جانور لوگ کرتے ہیں۔''

بلی نے حیران ہو کر پوچھا، ''اگر یہ ایک دوسرے کی پروا نہیں کرتے تو ان کے بچے کون پالتا ہے؟''

بلے نے کہا، ''ان کے بچے نوکروں کے سر پر پلتے ہیں۔''

''نوکر!'' بلی نے پوچھا۔ ''تو کیا ان کے بچے ان کی مادہ نہیں پالتی۔''

اس پر بلے کو ہنسی آ گئی اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اگر ان کی مادہ بچے پالنے کے قابل ہو تو اس کے بچے نہیں ہوتے۔''

''بچے ہی نہیں ہوتے!'' بلی نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں! پھر ان کی مادہ نوکری کرتی ہے شادی نہیں۔''

''شادی!''

''ہاں جب ان کا جوڑا بنتا ہے تو وہ دونوں ایک کاغذ پر دستخط کرتے ہیں۔''

''دستخط''

''ہاں اور جب ان میں نا چاقی ہو جاتی ہے تو دستخط کاٹ کر وہاں طلاق کی مہر لگا دیتے ہیں۔'' (۸۷)

انسانوں کی موجودہ دور میں زندگی کا آئینہ درج بالا اقتباس ہے کہ آج کے دور میں انسان کی ازدواجی زندگی بھی تباہی کی طرف جا رہی ہے اور بچوں کی پرورش میں عمومی طور پر والدین کی عدم دلچسپی عام ہے۔

موجودہ دور میں عیش و آرام کی کثرت اور بے جا آزادی نے انسان کو دکھی بنا دیا ہے اور وہ فرسٹریشن کا شکار ہو گیا ہے اور اس فرسٹریشن سے نکلنے کے لیے بھی جو راہ وہ اختیار کرتا ہے وہ بھی اس کے روگ میں اضافے کا باعث ہی بنتا ہے۔ مثلاً اسی صورت حال کو اشفاق احمد اپنے افسانے ''قصہ نل دمینتی'' میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''بہت زیادہ پالیٹکس اور بہت زیادہ سیکس انسان کو دکھی بنا دیتا ہے۔'' سہیل نے گلوگیر ہو کر کہا۔ ''یہ جتنا بھی گلٹ (Guilt) اس دنیا میں موجود ہے۔ سیکس اور پالیٹکس اور انفرمیشن کی وجہ سے ہے۔ ہر تیسرا آدمی السر کا شکار ہے اور ہر چوتھے آدمی کی شریان پھٹ رہی ہے اور ہر پڑھا لکھا آدمی ہارٹ سے مر رہا ہے۔ ہمیں ضرورت سے زیادہ انفرمیشن نے روگی بنا دیا ہے۔'' (۸۸)

ہر شے کی بہتات انسان کو تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور آج کے دور کا المیہ یہی ہے کہ انسان ہر شے کے بارے میں زیادتی کا شکار ہے جس نے اس کو مختلف روگوں کا شکار کر دیا ہے چاہے یہ جسمانی کرب کی صورت میں نمایاں ہیں یا اندرونی بیماریوں کی صورت میں لہو کے ساتھ شامل ہیں۔ لیکن حد سے بڑھی ہوئی جانکاری، معلومات، علم، تجربے، آگاہی، شعور نے اس کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس معاشرے میں کم علم، سیدھے سادے لوگوں کو احمق گردانا جاتا ہے بلکہ وہ سب کو اضافی شے محسوس ہوتے ہیں۔ اشفاق احمد کے افسانے ''محسن محلّہ'' کے ماسٹر الیاس بھی ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے، ایک سیدھے سادے شریف النفس انسان تھے، یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی عزت تو کرتے تھے لیکن صرف اسی قدر کہ سلام کر کے گزرتے

تھے باقی تو وہ بوجھ ہی محسوس ہوتے تھے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''وہ اتنے سیدھے اور اس قدر بے پیچ تھے کہ انسان ہی نہیں لگتے تھے۔ سارے محلے پر اور ساری سوسائٹی پر ایک بوجھ سے لگتے تھے اور چونکہ ایسے لوگوں کے ساتھ رسم و راہ پیدا کرنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اس لیے کوئی بھی ان کا دوست نہیں تھا۔'' (۸۹)

آج کے دور کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ یہاں پر شریف لوگ دھرتی کا بوجھ محسوس ہوتے ہیں اور چرب زبانی اور فریب کا بول بالا ہے۔ ماسٹر الیاس اسی بے حسی کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ معاشرتی بے حسی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو گی اور یہ رویہ موجودہ دور میں جا بجا نظر آتا ہے جہاں شرفاء کی پذیرائی نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ اسی زمانے کی بے حسی کا رونا اشفاق احمد کے افسانے ''گاتو'' کے کردار خواجہ صاحب اور مریم روتے نظر آتے ہیں۔ جہاں ایک امیر بیگم ان کے بچے کی اکلوتی خوشی چھین لے جاتی ہے اور وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کی بلی بیگم کو دے آتے ہیں کیونکہ اب زمانے کا دستور الگ ہو گیا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''مریم نے غصہ سے کہا ''نیاز صاحب کوئی ہمارے رزاق ہیں، روٹی تو اللہ دیتا ہے۔''

''اس نے وسیلے ہی ایسے بنائے ہیں۔ خواجہ صاحب نے اپنی بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ''اب وہ زمانہ نہیں رہا مریم۔ اور مریم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: ''اس زمانے نے تو ہماری ہڈیاں پولی کر دی ہیں۔ اللہ کرے نہ رہے یہ زمانہ!......''۔ (۹۰)

اس زمانے کے چلن کے ہاتھوں کئی بے بس اور مجبور لوگ اس کے خاتمے کے لیے دعا گو ہیں اور اشفاق اور ان پہلوؤں کو بے نقاب کر کے ان میں بہتری لانے کے خواہ ہیں تا کہ ایسی معاشرتی بے حسی کو ختم کیا جائے جہاں انسانیت ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ اشفاق احمد بیان کرتے ہیں کہ:

''اس نے برادرانہ لہجے میں کہا: ''محمد اسحاق وقت ہی ایسا جا رہا ہے۔ کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے۔ کیا بادشاہ کیا فقیر، سب ایک ہی رسے میں بندھے ہوئے ہیں۔'' (۹۱)

اشفاق احمد وقت کی طنابیں ایسے رخ پر موڑ دینا چاہتے ہیں جہاں سکھ سلامتی ہو، آپسی محبت و ایثار کا دور دورہ ہو، انسان ایک دوسرے سے تنگ اور خائف نہ ہوں بلکہ انسانوں کو اپنی ذات کے سوا بھی کسی کا دکھ درد محسوس ہو۔ اشفاق احمد

موجودہ معاشرے کے ہر کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے ملک میں ہر دوسرا شخص اس ملک کو چھوڑنے کے لیے ہر دم تیار رہتا ہے اور باہر جانے کے شوق میں دعا گو رہتا ہے۔ اشفاق احمد اس پر یوں بات کرتے ہیں کہ:

> ''میرے ملک کے لوگ بڑے سیلانی، بڑے سیاح اور بڑے مہم جو ہیں۔ انھیں باہر کے ملکوں سے پیار ہے۔ سیر و سیاحت سے عشق ہے۔ سفر کا جون ہے۔ پھر یہاں کا یہ دستور بھی ہے کہ سیر و سیاحت کی جائے تو اس سرکار کے یا اس سرکار کے پیسے سے کی جائے۔ کوئی وظیفہ مل جائے، کسی کانفرنس میں شرکت کا موقع نکل آئے اور نہیں تو کسی ثقافتی مشن کی رکنیت ہی مل جائے تا کہ اپنے اور بیگانے دونوں ملکوں میں عزت ہو۔'' (۹۲)

اپنے ملک میں بسنے والے شہریوں کے دلوں میں پنپنے والی خواہشات سے لے کر ذہنوں میں انگڑائی لینے والے خیالات تک کو اشفاق احمد بڑے واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا مقصد موجودہ معاشرے کی ہر بات اور پہلو پر بحث کر کے مسائل کا خاتمہ اور حل تلاش کرنا ہے تا کہ ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آ سکے۔

ج: مثالی معاشرہ

انسان ابتدا سے ہی تغیرات کا شکار رہا ہے، جیسے جیسے اپنی زندگی میں آگے بڑھتا گیا، اس کے رہن سہن، رویے اور اخلاق میں تبدیلیاں آتی چلی گئی ہیں۔ انسان کی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کی بڑی وجہ اردگرد کا ماحول بھی ہے۔ ہر انسان کے اندر زندہ رہنے کی خواہش موجود رہتی ہے اور اپنی جان کے لیے وہ لاکھوں پاپڑ بیلتا ہے۔ اپنے آپ کو بہتر ماحول میں رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت سی صفات میں سے کچھ انسان کے اندر ڈال کر اس کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو تبدیل کر سکتا ہے۔ ایک جانور جیسی زندگی گزارنے سے لے کر جب انسان کو تن ڈھانپنے کے لباس، پیٹ بھرنے کے لیے خوراک بھی میسر نہیں تھی انسان نے ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کی ہیں اور بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہا ہے۔ انسان جیسے جیسے ارتقاء کی جانب بڑھا۔ اسی کے اجتماعی، انفرادی، خاندانی، ذاتی اور معاشرتی تعلقات پیدا ہونے لگے۔ نیکی اور بدی کے تصور نے جنم لیا۔ خیر اور شر میں فرق ہوا، جزا اور سزا کا تصور ابھرا، بے شک اس میں مذہب نے کلیدی کردار ادا کیا، لیکن معاشرے میں صحت مند عناصر کو پیدا کرنے میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے کیونکہ ایک معاشرہ میں تمام افراد کو مل جل

کر رہنا ہے اوراس میں ذہنی،نفسیاتی، اخلاقی اور معاشرتی تعلقات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔اس میں ایک ادیب پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ معاشرے میں رہنے والے مختلف افراد میں باہمی یگانگت،محبت اورصحت مندسوچ کوابھارنے کے لیے مسلسل کوشاں رہے کیونکہ معاشرہ افراد کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا اس لیے افراد کی صحت مندنشوونما کے لیے ایسے عناصر کوسامنے لے کرآئے جوافراد میں خرابیاں پیدا کرنے کے باعث ہوتے ہیں تا کہ ان کا سدباب ہو سکے۔افراداور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔اس بارے میں تجمل حسین ہاشمی اپنی کتاب ہمارا معاشرہ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ معاشرہ کے فرد کے بغیر کوئی وجودنہیں رکھتا اس لیے بعض ماہرین معاشرہ کوایک جسم اور فرد کواس کے ایک عضو سے تشبیہہ دیتے ہیں،جس طرح جسم کے مختلف اعضاء اپنا اپنا کام مخصوص طور پر کرنے کے باوجود باہمی طور پرایک دوسرے کےمحتاج ہوتے ہیں اورمل کرتمام کام سرانجام دیتے ہیں۔اسی طرح معاشرہ کے افراد اپنے اپنے کام اور باہمی تعلقات سے معاشرے کا نظام قائم رکھتے ہیں۔''(۹۳)

یہی وجہ ہے کہ فرد کی اہمیت سے انکارنہیں کیا جاسکتا اورافسانہ،اردوادب کی وہ صنف ہے جس میں زندگی کے کسی ایک پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔کہانی جوکسی واقعہ سے ابھرتی ہے۔انسان کے گرد ہی بنی جاتی ہے۔مگراس کا مرکزی کردار تبدیل ہوتا رہتا ہے۔رابرٹ کہتا ہے:

> "Stories happen to people, If there is even a story connected chiefly with a tree, or a stone, or an Ape, the story will exist only because these things will be treated as if they were human rather than as we know they are in nature."(۹۴)

قدیم دور میں افسانہ سنانا،کہانی سناؤمحض تفریحی مقاصد یا وقت گزارنے کے لیے تھی لیکن آج کے دور میں یہ ایک سنجیدہ صنف ہے۔لیکن مختصر افسانے کا وجوداس وقت سامنے آیا جب تہذیب کے پنپنا شروع کر دیا۔انسان کوحقیقی زندگی میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا۔معاشرتی اورسماجی زندگی میں الجھنیں بڑھنے لگی۔نفسیاتی پیچیدگیوں نے جنم لیا تو افسانہ محض تفریحی مقصد کے لیے نہیں بلکہ سنجیدہ اخلاقی فریضے کی صورت میں ڈھل گیا۔اورسنجیدہ فکری صنف کی صورت اختیار کر

گیا۔ ہر سنجیدہ افسانہ نگار جب کہانی لکھتا ہے تو اس کے پیش نظر زندگی کا کوئی نہ کوئی لمحہ فکریہ سامنے ہوتا ہے۔ فرد یا معاشرہ کی کوئی الجھن ہی زیر سطور چھپی ہوتی ہے۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں کہ:

''افسانہ نگار کا سب سے قیمتی اور سب سے قبل قدر خزانہ اسے مشاہدے کی مدد سے حاصل ہوتا ہے۔ آنکھ برابر کھلی رہے تو زندگی میں تخیل اور فکر کے لیے دولت کی کمی نہیں...... افسانہ نگار کو چاہیے کہ وہ برابر اپنے آپ سے اپنی ذات کے متعلق سوالات کرتا رہے۔ ہر انسان ایک سربستہ راز ہے اور رازوں کا کھولنا افسانہ نگار کی دلچسپی کا اہم جزو......''(۹۵)

اشفاق احمد بھی ایک سنجیدہ افسانہ نگار کی حیثیت سے پوری دیانتداری، جرأت اور ذمہ داری سے فرد اور معاشرے کے تعلق کو صحت مند بنانے کی مسلسل کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور نہایت سنجیدگی اور فکر کے ساتھ اپنے عہد کے افراد کے ذاتی، اجتماعی، معاشرتی، سماجی، نفسیاتی اور اخلاقی مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں اور نہایت وضاحت سے فکر کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ انسان کی ذات میں چھپے جذبات میں احساسات کو سامنے لے کر آتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں پل بھر کو بھی بند نہیں ہوئی بلکہ وہ معاشرے کو مثالی معاشرے میں ڈھالنے کیلئے کمر باندھ کر تیار کھڑے ہیں۔

معاشرے میں افراد مل جل کر زندگی گزارتے ہیں۔ مختلف مذاہب، اقدار اور تہذیب کے لوگوں کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ساتھ ساتھ دوسرے افراد کو بھی اہم سمجھا جائے اور ان سے بیگانگی اختیار نہ کی جائے۔ ایک ہی معاشرے میں مختلف مذاہب، رسم و رواج اور عقائد سے وابستہ لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر زندگی گزارنا اور دوسروں کی اقدار کو فراموش اور نظر انداز کر دینا صحت مند معاشرے کی نشاندہی نہیں ہے۔ تجمل حسین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

''یہی وجہ ہے کہ ایک صحت مند معاشرہ کسی بھی فرد کو بے حقیقت نہیں سمجھتا۔ اگر کسی معاشرہ کے افراد اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھتے ہیں تو یہ معاشرہ کے جمود اور اس کی کم مائیگی کی نشانی ہے۔''(۹۶)

صحت مند اور مثالی معاشرہ جس میں مذاہب کی بناء پر تعصب نہ ہو، ایک دوسرے کی اقدار اور روایات کی پاسداری ہو، انسان کی عزت مقدم ہو، فرد کی اہمیت ہو، کی ایک کڑی اشفاق احمد کا افسانہ ''گڈریا'' ہے جو اخلاقیات کے بلند ترین مقام پر فائز ہے۔ داؤ جی کی مذہب اسلام سے عقیدت اور محبت دیدنی ہے۔ اشفاق احمد ''گڈریا'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جب میں سنانے لگا تو انھوں نے اپنا پائجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب میں نے ولا الضالین کہا تو میرے ساتھ ہی انھوں نے بھی آمین کہا۔'' (۹۷)

داؤ جی اپنے استاد کا بے حد احترام کرتے تھے، اور آخری عمر تک ان کا شکریہ ہی ادا کرتے رہے۔ عقیدت کا یہ عالم، گولو کے لیے بڑا حیران کن تھا اور وہ اکثر داؤ جی سے سوال کرتا کہ آپ اپنے استاد کا اس قدر احترام کیوں کرتے ہیں تو داؤ جی جواب میں کہا کرتے تھے کہ:

''ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں جس طرف توجہ فرماتے تھے، بندے سے ممولا کر دیتے تھے۔'' (۹۸)

مثالی معاشرے کے لیے رشتوں کا احترام بہت اہمیت رکھتا ہے اور اشفاق احمد اس میں استاد اور شاگرد کے حقیقی تعلق اس کی پاکیزگی، گہرائی اور حقیقت سے سب کو روشناس کروانا چاہتے ہیں۔ پورے افسانے میں اشفاق احمد نے خود کو یعنی شاگرد کو کم تر اور استاد کو اس کے ہر رویے، لفظ، عمل سے بلند ترین مقام پر فائز کیا اور جا بجا استاد کے ایثار، محبت، محنت اور قربانی کا ذکر کیا ہے، داؤ جی نے جو محنت اپنے شاگرد کے لیے کی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''داؤ جی نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھے تباہ کر دیا، مجھ پر جینا حرام کر دیا۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گزرتا اور رات، گرمیوں کی مختصر سی رات، ان کے سوالات کا جواب دنیا میں کوٹھے میں۔ ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے اور مونگ رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ میں نے ٹھیک بتا دیا ہے۔ وہ پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں۔ میں نے پھر ٹھیک بتا دیا ہے اور انھوں نے پھر انہی بندوں کو آگے لا کھڑا کیا ہے۔ میں جاتا اور جھڑک کر کہتا۔ ''مجھے پتہ نہیں، میں نہیں بتاتا تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا وہ شرمندگی کنکر بن کر پتلیوں میں اترتی جاتی میں آہستہ سے کہتا۔ ''داؤ جی''۔

''ہوں'' ایک گھمبیر سی آواز آئی۔

''داؤ جی کچھ اور پوچھو''۔

داؤ جی نے کہا، ''بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔ اس کی ترکیب نحوی کرو۔'' (۹۹)

اشفاق احمد انسان کے انہی تعلقات میں بحالی اور بہتری چاہتے ہیں اور ان روایات کو تازہ کرتے ہیں جو اب غیر اقوام نے اپنا کر ترقی کر لی ہے۔ استاد کا احترام، ہماری اقدار، مذہب اور تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ اس کا اعادہ ضروری ہے اور اس کے افسانے میں جہاں اور بہت سے اخلاقی پیغامات ہیں اور انسان دوستی کی عمدہ مثال ہے وہاں اساتذہ اور طلباء کے لیے بیک وقت مشعل راہ بھی ہے۔

دولت کا خمار، محبت کو روند دیتا ہے۔ دولت معاشرے میں زہر بن کر کیوں اترے، عوام کا معیار زندگی بلند کرنا، ایک ادیب کا اولین ترین فرض ہے۔ اور یہ بات اشفاق احمد بخوبی سمجھتے ہیں۔ دولت بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ ہر فرد اپنے آپ کو آرام دینا چاہتا ہے، روپے پیسے کا حصول، یا اس کی خواہش ایسی بھی ناجائز نہیں ہے لیکن ان خواہشات کی تکمیل کے لیے کسی کی محبت کو قدموں لے روند دینا اپنی خواہشات کے حصول کے لیے دوسروں کی خواہشات کو، دل کو ٹھیس پہنچانا سراسر بے انصافی، خودغرضی اور بے حسی ہے اور انہی رویوں کو بے نقاب کرنا اشفاق احمد اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ اپنے افسانے ''گل ٹریا'' میں مادیت پرستی میں ڈوبے ایسے ہی معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے جہاں جانور اور انسان دونوں برابر ہو جاتے ہیں، پہلے تمامتر دیکھ بھال اور اعتماد کے باوجود گل ٹریا بھاگ جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

> ''بھیا مسکرائے اور زمین پر زنجیر کی کنڈی بٹھاتے ہوئے بولے ''کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ اپنے مالک کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ نہیں جاتا اور اگر کوئی زبردستی لے جانا چاہے تو اس کو پھاڑ کھاتا ہے۔'' (۱۰۰)

گل ٹریا کے کھو جانے پر نہ تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ خود گیا یا کوئی اٹھا کر لے گیا اور نہ کسی کے بھونکنے کی آواز آئی، نہ شور مچانے کی اور نہ ہی پھاڑ کھانے کی کوئی خبر آئی۔ اسی طرح زندگی کے بہت برسوں بعد بھیا کی محبت ''ت'' بھی ان کو چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ شادی کر کے چلی جاتی ہے اور اس میں بھی ''ت'' کی پہلے عین گل ٹریا کی طرح ہی بھیا کو اپنی محبت کا یقین دلاتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''آج مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے کائنات کی سب سے معزز ہستی ہوں۔ جانداروں میں سب سے محترم ہوں۔ میرا جی اپنی عزت آپ کرنے کو چاہتا ہے اور مجھے چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ایسے لگتا ہے کہ جیسے حضوری کے تمام آداب مجھ میں سمٹ آئے ہو۔ ''ت'' دوسری لڑکیوں سے کس قدر مختلف ہے۔ اسے دنیوی مال و دولت اور جاہ و جلال کا ذرا بھی تو پاس نہیں۔'' (۱۰۱)

اور بعد میں یہی ''ت'' دولت مند دولہا کے ساتھ شرمائی، لجائی مخصوص لپک کے ساتھ کار میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے اور معاشرے میں بے حسی کا شکار ہونے والے افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو تمام معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایسا معاشرہ مادیت کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے اور ان مادیت میں ڈوبے لوگوں کو مرجھائے چہرے اور اداس نظریں دکھائی نہیں دیتیں کیونکہ ان کی آنکھوں میں دولت کا نشہ چڑھا رہتا ہے اور ان کا ذہن خمار میں ڈوبا رہتا ہے۔ اشفاق احمد ان ہی لوگوں کے رویوں کو بیان کرتے ہیں تا کہ عام لوگوں کے معیار زندگی کو بہتر بنایا جا سکے۔

تنکہ میں اشفاق احمد نے روایتی محبت کی کہانی کو انوکھے انداز میں پیش کیا۔ محبت کی ایسی کہانی جس میں روپیہ کی موٹی دیواریں اس میں پنپتی محبت کی جان لے لیتی ہے۔ اس افسانے میں جزئیات کے ساتھ معاشرتی نظام، اخلاقیات اور رسم و رواج کی وضاحت قابل تعریف انداز سے کی گئی ہے۔ داستانوی انداز سے آغاز ہونے والی اس کہانی کا انجام معاشرے کے ننگے سچ پر ہوتا ہے اور مصنف خواب و خیال کی فضا میں نہیں بناتے بلکہ حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں تا کہ معاشرے سے اس طبقاتی تقسیم کو ختم کیا جا سکے۔ جہاں ایک پڑھا لکھا نوجوان عزت کا حقدار نہیں بلکہ جہاں عزت کا معیار روپیہ پیسہ ہے۔ مثلاً

> سرور نے بلا سوچے سمجھے کہا۔ ''چلو ہم ابھی نکاح پڑھوا لیتے ہیں......عطیہ نے اس کی بات سنے بغیر کہا۔
> ''اگر تم بھی بزنس کیا کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اگر تمہارے پاس اتنا ہی روپیہ ہوتا تو ابا جی کبھی انکار نہ کرتے۔'' (۱۰۲)

اشفاق احمد ایسا مثالی معاشرہ تشکیل دینا چاہتے ہیں جہاں لوگ ایک دوسرے کے غم میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے پر بلاوجہ الزام تراشی نہیں کرتے بلکہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاک خانے میں سرور کا زیادہ وقت روپے جمع کرنے، روپے گننے اور روپے بچانے میں گزر جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ خود پر بھی ایک آنہ خرچ کرنے کو تیار نہ تھا۔ مثلاً

> ''اسے سخت بھوک لگی تھی اور وہ روپیہ بھنوانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ روپیہ جب بھنوا لیا جاتا ہے تو پھر وہ روپیہ نہیں رہتا! وہ اسی طرح اپنے کواٹر میں جا کر لیٹ گیا۔'' (۱۰۳)

ایسے شخص سے اس کے اردگرد کے لوگ غافل ہیں۔ وہ بجائے اس کے کہ اس کی وجہ تلاش کریں اس کی دلجوئی کریں انسان ہونے کا فرض ادا کریں، اس کے خلاف محاذ آرائی کرتے ہیں اور یوں انسان دوستی، محبت اور خلوص سے جذبے

بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور کوئی شخص بہت ہی اکیلا رہ جاتا ہے۔ مثلاً

''ڈاک خانے کے تینوں ڈاکیے اور بابو محمد دین اسے بے حد کنجوس خیال کرتے تھے اور جب بھی موقع ملتا وہ اس کی برائی کرتے۔'' (۱۰۴)

جبکہ اگر ان چاروں میں سے کوئی سرور کا دوست بن جاتا تو شاید صورتحال مختلف ہوتی اور سرور موت کا شکار ہونے سے بچ جاتا۔ ایک سچے ادیب کی طرح اشفاق احمد معاشرتی اصلاح کے لیے ان سرد رویوں کی وضاحت کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے معاشرتی بگاڑ کی بھی نشاندہی کرتے ہیں تاکہ ان میں مثبت تبدیلی پیدا کی جا سکے۔ بہتری کی صورت نکل سکے یا کہ کم از کم یہ شعور ہی ہو سکے کہ نیک و بد میں فرق کیا ہے۔ غریب اور امیر میں فاصلے کتنے ہیں اور کیوں ہیں تاکہ قاری ان فاصلوں کو پاٹنے کی راہ نکال سکے۔

اشفاق احمد اپنے افسانوں کے ذریعے سے ایسے قارئین کو کائنات، انسان اور زبان کی بنیادی حقیقتوں سے روشناس کرواتے ہیں، کہیں ان کا انداز ایک مشفق استاد اور کہیں بے تکلف دوست کا ہو جاتا ہے۔ لیکن ان کا بنیادی مقصد اپنے لوگوں کی اصلاح ہی ہے مثلاً وہ اپنے افسانے ''حقیقت نیوش'' میں لکھتے ہیں کہ:

''سنو! یہ کائنات نامکمل ہے، انسان نامکمل ہے اور سب سے بڑھ کر اس کی زبان نامکمل ہے۔ اگر سوچنے والے دماغ ہوتے، اگر پُرمعنی الفاظ ڈھل چکے ہوتے تو جمیل کی زندگی یوں نہ گزرتی۔'' (۱۰۵)

اشفاق احمد کے نزدیک اگر ہم آنے والے برے وقت کے بارے میں پہلے سے اپنے لوگوں کو آگاہ کر دے، اگر آنے والے بلا کے بارے میں پہلے سے علم ہو جائے تو شاید اس ناقابل تلافی نقصان سے بچا جا سکے جو ایک ایک مثالی معاشرے کی تکمیل میں حائل ہے۔

اشفاق احمد ایک ایسا مثالی معاشرہ ترتیب دینا چاہتے ہیں جہاں انسان کو اپنی اصلیت اور فضیلت کے بارے میں آگاہی ہو کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے۔ اس بات کی وضاحت یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنے افسانوں کے کمزور اور کم ہمت افراد کی وجہ سے پیدا ہونے والی معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور کبھی خود سر اور ضدی لوگوں کے منہ سے کہلواتے ہیں۔ لیکن مقصد وہی ہے کہ مثالی معاشرہ وجود میں آ سکے۔ اپنے وجود سے آگاہی حاصل کر سکے۔ اپنی حدود بندی کر سکے مثلاً توشے بلے میں ایک ہی وقت انسان کے اختیار اور بے اختیاری کی حد کا تعین کر دیا

ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''پھر وہ ذرا رکی اور دیوار پر نگاہیں جما کر کہنے لگی۔ ''میرا اب بھی یہی ایمان ہے کہ انسان کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ وہ ستاروں پر کمند ڈال سکتا ہے، پہاڑوں کے دل چیر دیتا ہے۔ آسمان و زمین کی ہر قوت کو مسخر کر لیتا ہے لیکن جذبہ آفرینش کی رو کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں بہا سکتا اور فطرت کے تخلیقی منصوبوں میں دخل نہیں دے سکتا۔'' (۱۰۶)

درج بالا پیراگراف میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ انسان کچھ معاملات میں بااختیار ہے اور کچھ میں بالکل بے اختیار۔

انسان اگر تقدیر اور تدبیر کی حد بندی کر لے تو اس سے معاشرے کے قوانین کا احترام خودبخود ہونے لگتا ہے۔ پھر فرائض اور حقوق کی حد بندی آسان ہو جاتی ہے۔ نہ کسی شے کی بہتات ہوتی ہے اور نہ کمی اور اسی طرح ایک اچھا معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں ہمیشہ معاشرے کے ایسے کرداروں کو ابھارا ہے جو ہمارے اردگرد موجود ہیں اور چلتے پھرتے ہمیں نظر آتے ہیں ایسا ہی ایک کردار ''صفدر ٹھیلا'' میں صفدر کا ہے۔ جو بظاہر بہت غصے والا اور طاقت ور ہے لیکن بطور شاگرد وہ پنڈت جی سے معافی مانگ لیتا ہے۔ مثلاً

''مولوی صاحب ٹھیلے کو کان سے پکڑ کر کشاں کشاں دفتر میں لے جاتے اور پنڈت جی کی میز کے سامنے کھڑا کر کے اپنے مخصوص لہجے میں کہتے ''نالائق خبیث توبہ کر، معافی مانگ پنڈت جی سے۔ نہیں تو جان سے مار دوں گا۔ اور ٹھیلا ہنستے ہوئے کہتا۔ توبہ جی پنڈت جی جی، معافی دے دو جی۔ اور پنڈت جی معاف کر دیتے۔'' (۱۰۷)

صفدر ٹھیلا جس سے سکول کے سارے لڑکے دبتے تھے اور جو ذرا سے غصے پر کسی کی بھی جان لینے کے درپے ہو جاتا تھا وہ مولوی صاحب کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا اور مولوی صاحب جب تک چاہتے صفدر ٹھیلے کو مارتے مگر وہ چوں تک کرتا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

''مولوی صاحب کمزور چمرخ ہاتھوں سے صفدر پر قمچیاں برسا رہے تھے۔ ان کا دم پھول چکا تھا اور اب ان سے بات بھی نہ ہو سکتی تھی۔ انھوں نے چھڑی پیرے پھینک کر کہا۔ زمین پر ناک سے چھ لکیریں

نکال۔ ابھی اسی وقت نہیں تو ہڈیاں توڑ دوں گا۔'' صفدر ٹھیلے نے فقرہ ختم ہونے سے پہلے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک دیئے اور گراؤنڈ پر ہتھیلیاں جما کر لکیریں نکالنے لگا۔''(۱۰۸)

اشفاق احمد نے صفدر ٹھیلے کے کردار کے سارے اتار چڑھاؤ کو افسانے میں نہایت چابکدستی سے بیان کیا ہے کیونکہ صفدر ٹھیلا کوئی پلاسٹک یا پتھر کا انسان نہیں بلکہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان ہے جس میں خوبیوں کے ساتھ برائیاں بھی موجود ہیں اور جو کمزوریوں کا بلکہ اخلاقی کمزوریوں کا شکار بھی ہوتا ہے، پستیوں میں بھی اترتا ہے اور اس میں تغیر بھی آتا ہے۔ صفدر ٹھیلا کی جب پنڈت جی سے ان بن ہوتی ہے تو وہ جا بجا ان کو دھمکیاں بھی دیتا ہے۔ مثلاً

''صفدر ٹھیلا نل پر بیٹھا دانت صاف کر رہا ہوتا اور پنڈت جی ادھر آنکلتے تو وہ کسی نہ کسی کو مخاطب کر کے کہتا۔''اس کی موت میرے ہاتھوں آئے گی۔ پھانسی لگ جاؤں گا پر اس کا خون کر کے رہوں گا۔''(۱۰۹)

پنڈت جی جب صفدر ٹھیلے کو سکول سے باہر نکال دیتے ہیں تو وہ اور اس کے دوست یہاں تک اخلاقی تنزلی کا شکار ہوتے ہیں کہ پنڈت جی کی راہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان سے بدلہ لینے کی غرض سے برائی کے منصوبے باندھتے ہیں اور پھر کہانی اچانک ایک نیا موڑ لیتی ہے۔ اور وہی ہوتا ہے جو ہر استاد اپنے شاگرد سے امید کرتا ہے۔ اور صفدر بھی اپنا فرض ادا کرنے سے نہیں چوکتا، اور یہیں سے مثالی معاشرے کا تصور اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ جب پنڈت جی کی گھوڑی کا پہیہ کیچے میں اتر جاتا ہے۔ تو یہی صفدر ٹھیلا پنڈت جی اور ان کے خاندان کی جان بچانے کے لیے اپنی جان سے گزر جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے اور ہیڈ ماسٹر کا فخر ایسا ہے کہ اساتذہ برادری کے سارے خلوص اور نیت کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اساتذہ ہمیشہ اپنے طلباء کی بہتری کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور بہتری ہی کی امید بھی کرتے ہیں۔ مثلاً

''پنڈت جی گاڑی کے پہلو میں کھڑے اپنی بیوی اور لڑکیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر چلا رہے تھے۔''میرا سٹوڈنٹ ہے صفدر...... میرا سٹوڈنٹ...... صفدر میرا سٹوڈنٹ......'' اور صفدر گھبرائی ہوئی گھوڑی کے قدموں میں بے حس وحرکت پڑا تھا۔''(۱۱۰)

اشفاق احمد ایسا ہی رویہ اور رشتہ استاد اور شاگرد دیکھنا چاہتے ہیں اور انھوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ شاگردوں کا بھی غصہ وقتی ہوتا ہے اور استاد اور شاگرد بلاتعصب وتخصیص کے ایک دوسرے کے لیے خدمت اور محبت اور حیات کو وقف کر دیتے ہیں۔ صفدر ٹھیلے کا مولوی صاحب کے بجائے پنڈت جی کے لیے جان قربان کر دینا بھی اس بات پر دال ہے۔

اشفاق احمد ایک صحت مند معاشرے کا خواب بنتے ہیں اور اس کے لیے جس بھی سامان کی ضرورت پڑتی ہے وہ اپنے افسانوں کے ذریعے رسد کی صورت عوام تک پہنچاتے ہیں۔ وہ ایسے جہان کے خواہشمند ہیں جہاں محبت ہو، پاکیزگی ہو، امید ہو، تبسم ہو اندھیرے نہ ہو، مایوسی نہ ہو، خوف نہ ہو۔ وہ اپنے افسانے ''اجلے پھول'' میں بیان کرتے ہیں کہ:

''ہمیں بشاشت کی ضرورت ہے۔ صحت مندانہ پیش قدمی کی حاجت ہے اور کھلاڑیوں جیسی روح کی احتیاج ہے۔ آپ لوگ نوجوان ہیں، صحت مند ہیں۔ اپنے شانوں پر سوچنے سمجھنے والا سر رکھتے ہیں۔ پھر دکھوں کی اندھیر گھپاؤں جھانک جھانک کر کیوں دیکھتے ہیں۔ خوشنما کلیوں کی باتیں کیجیے۔ چاند کی کرنوں سے گیت مرتب کیجیے۔ افقی ستارے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایئے...... اگر ایسا نہ ہوگا تو زندگی بے حد تلخ فرض ہو کے رہ جائے گی اور مستقبل حال بننے سے آسیب زدہ خرام نظر آئے گا۔'' (۱۱۱)

یعنی ایسا معاشرہ جہاں مایوسی، غم اور اداسی کے اندھیرے نہ ہوں بلکہ روشن، شیتل اور پرسکون حال ہوں اور ایسا ایسی صورت میں ہی ممکن ہے جب ذہن و دل سے اچھی باتیں نکلیں۔ کیونکہ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''انجم بھائی نے کہا ''اچھی اچھی باتیں سوچنے سے اچھے اچھے کام آپ سے آپ ہو جایا کرتے ہیں۔'' (۱۱۲)

اشفاق احمد کے نزدیک ہمت سے انسان اپنے اردگرد کے ماحول کو بہتر بنا سکتا ہے۔ اپنے حال اور مستقبل کو سنوار سکتا ہے۔ حالات کا رخ بدل سکتا ہے۔ مثلاً

''گاڑی چلنے لگی تو انجم بھیا نے کہا۔ طلودامن کیسا ہی کیوں نہ ہو، انھیں کلیوں سے سجانا تمہارا کام ہے۔ مقدر (اگر کوئی چیز مقدر ہے تو) کیسا بھی تاریک کیوں نہ ہوں، ہمت عالی سے منور کیا جا سکتا ہے۔ چاند نکلتا ہے تو اس کی کرنیں بلا قیمت میسر آتی ہیں لیکن انھیں مہیا کرنا اور سنہرا مستقبل وضع کرنا ہمارا اپنا کام ہے۔'' (۱۱۳)

اور انجم بھائی کا یہی اعتماد آگے چل کر سچ نکلتا ہے۔ اشفاق احمد قارئین کے دل سے کم ہمتی ختم کر کے انھیں اعتماد اور عالی ہمتی کا درس دیتے ہیں تاکہ مستقبل کی راہیں اجلی اجلی کرنوں سے منور ہو سکیں۔

قانون کسی بھی قوم کی آزادی کا علمبردار ہوتا ہے۔ قانون کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے تاکہ معاشرے میں توازن برقرار رکھا جا سکے۔ جس معاشرے میں قانون کی پاسداری نہ کی جائے وہاں کے افراد پر زندگی تنگ ہو جاتی ہے اور توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور لوگ کھلے بندوں قانون کو توڑ کر اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور انصاف ختم ہو جاتا ہے۔

جب انصاف ختم ہو جاتا ہے تو معاشرہ بے حسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں تجمل حسین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

''چنانچہ اگر قوانین کو اٹھا دیا جائے تو انسان او حیوان میں بہت کم فرق رہ جائے اور مختلف نظام انتشار میں مبتلا ہو کر ایسا ماحول پیدا کر دیں جسے جنگل کا قانون (Law of the Jungle) کہا جا سکتا ہے۔'' (۱۱۴)

جس معاشرے میں قانون مضبوط ہو اور اس کی اساس انصاف پر ہو وہاں جانوروں اور مشینوں کو انصاف کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی، معاشرے میں غیر مہذب روایات جنم نہیں لیتی اور زندگیاں عذاب میں مبتلا نہیں ہوتیں۔ مثلاً اشفاق احمد کے افسانے قصاص میں ہے کہ کرتارے کو جب قتل کر دیا جاتا ہے تو اس کے قاتل آرام سے قانون کی نظروں سے بچ نکلتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

''سابو نے کہا ''بڑا لمبا مقدمہ چلا۔ بے بے نے پورا رقبہ بیچ کر بیٹے کے قاتلوں کی ساری گردنیں پھندوں میں پھنسا دیں لیکن پانچ صاف بری ہو گئے اور چھٹے کو سشن بول گئی۔'' ''وہ بھی ہائیکورٹ میں بری ہو گیا۔'' (۱۱۵)

جس معاشرے میں برائی کی سزا دینے والا کوئی موجود نہ ہو۔ وہاں قانون کا احترام بے معنی ہو جاتا ہے۔ وہاں آس، امید ٹوٹ جاتی ہے۔ اسی طرح سابو، دینو اور بردے کے قتل کے بعد اس کے قاتل آرام سے لینڈ روور کے پاس آ جاتے ہیں اور اس کا جائزہ لینے لگ جاتے ہیں۔ جبکہ سپاہی وہاں موجود نہ تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

''انھوں نے موقعے پر موجود محافظ سنتری سے پوچھا تو اس نے قرآن کی قسم کھا کر کہا کہ میں تو ایک منٹ کے لیے بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا، صرف ایک پیالی چائے پینے گیا تھا اور اسی عرصے میں سارا کھیل ہو گیا۔'' (۱۱۶)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں اس حقیقت کو بھی بیان کرتے ہیں کہ کائنات میں تمام کام قانون قدرت کے مطابق جاری و ساری رہتے ہیں اور یہ بات ہمارے ایمان کا حصہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کائنات کا ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ کائنات اور اس میں موجود تمام مخلوقات اپنے اپنے کردار نبھانے میں مصروف ہے وہ اپنے افسانے ''ملک الموت'' میں بیان کرتے ہیں کہ:

''ہر کام کے لیے وقت اور مقام طے ہوتا ہے۔'' (۱۱۷)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں بتاتے ہیں کہ اگر رشوت، منافع خوری اور بددیانتی اس قدر عام ہو جائے کہ آپ کے

اپنے گھر کے افراد بھی اس میں ملوث ہو جائیں تو کیا آپ خاموش ہو جائیں گے، بے بس ہو کر تماشا دیکھیں گے نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ ہماری روایات کا حصہ نہیں ہے۔ ہم ایک زندہ قوم ہیں ہماری روایات اور اقدار ہیں، ظالم کے خلاف احتجاج کا رویہ شامل ہے جیسا کہ ''سعید جونیئر'' میں سعید احمد کی ماں کو جب یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا بیٹا رشوت خور ہے تو وہ اس سے الگ ہو جاتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

''سعید کی والدہ نے پہلے تو اس سے برتن علیحدہ کیے پھر خود اس سے علیحدہ ہو کر درزیوں کی کٹڑی میں چلی گئی۔'' (۱۱۸)

کیونکہ اس کی ماں کی تمام عمر دیانت داری سے گزری تھی اور رزق حلال پر اس کا ایمان تھا۔ اس لیے اس کی والدہ نے سعید احمد کے تمام عیش و آرام پر لات ماردی اور الگ جا کر رہنے لگی۔ اشفاق احمد نے اس افسانے میں مشرقی عورتوں کی اقدار کا ذکر بھی کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

''پرانے زمانے کی عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ قدروں کی بھی پالن ہار تھیں۔ مردوں کی بے راہ روی میں ان کے ساتھ شامل نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان کے خلاف اعلان جنگ کر دیتی......معاشرتی اقدار کے معاملے میں ان کے گھروں کی قلعہ بندیاں بڑی مضبوط تھیں اور ساری بستیاں انہی کے دم قدم سے آباد تھیں۔ پرانی عورتیں اقدار کی محافظ تھیں اس لیے اپنے فیصلوں میں بڑی آزاد تھیں۔'' (۱۱۹)

بے راہ روی، اقدار کی پامالی کے خلاف ایسا ہی رویہ اشفاق احمد سب میں دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کا علم عورتوں کے ہاتھوں میں پکڑا کر اس بات کا اعادہ کرواتے ہیں کہ تم اقدار کی پاسبان ہو، تم اپنے چلن کو مت چھوڑنا اور بے خوف ہو کر دلیری کے ساتھ ہر گھر میں ان برائیوں کے خلاف جنگ لڑنا تبھی مثالی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے۔

اشفاق احمد ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں جس میں سب ایک دوسرے سے محبت سے پیش آئیں۔ روایات کا پاس ہو، دکھ درد کا احساس ہو اور ان وقتوں کی یاد دلاتے ہیں جن میں تمام لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ میں بیان کرتے ہیں کہ:

''پہلے وقتوں میں جب دو ستارے ٹکرا جاتے تھے تو مہینہ مہینہ بھر ستاروں میں روشنی نہیں رہتی تھی، کسی کے ہاں چراغ تک نہیں جلتا تھا لیکن اب کہکشائیں ٹکرا جاتی ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔'' (۱۲۰)

اشفاق احمد اپنی چشمِ تخیل سے ایک ایسا معاشرہ دیکھتے اور دکھاتے ہیں جہاں ہر طرف امن ہو اور تعلیم، فلسفے، قاعدے قانون سے واقفیت نہ ہونے کے باوجود کسی کو کوئی بات بتانی یا سمجھانی نہ پڑے بلکہ ہر شخص اپنی سطح پر ہو اور ہر بات کا علم رکھتا ہو، کوئی سوال جواب نہ ہوں، کسی بات کے بارے میں ابہام نہ ہو، ہر طرف خوشحالی ہو اور لوگ غیر معمولی طور پر حکمت اور دانش سے معمور ہوں اس سلسلے میں اپنے افسانے ''پوری جان کاری'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ماہڑہ ایک ترقی یافتہ شہر تھا جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ یہاں کے بہت کم لوگ ہسٹری، فلسفے، الہیات اور قانون سے واقف تھے، ماہڑا کے باشندے کم آمیز، کم کوش، اور کم سخن تھے اور ان کے درمیان کبھی کوئی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ ان میں ہر بات کو سمجھنے، پرکھنے اور اختیار کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی۔'' (۱۲۱)

اشفاق احمد اپنے افسانے ''پوری جان کاری'' میں ایک ایسا معاشرہ دکھاتے ہیں جہاں لوگ لڑنے جھگڑنے سے ناواقف تھے اور پیار محبت سے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایسا ہی معاشرہ اشفاق احمد کا بھی خواب تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''ماہڑا'' کا معاشرہ وہ خوش قسمت معاشرہ تھا جس کے ہر فرد کو ہر چیز معلوم تھی اور ان کے درمیان کبھی مناظرہ، مکالمہ مجادلہ یا مباہلہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ لڑنے جھگڑنے کے فن سے ناآشنا تھے اور محبت اور یگانگت کی خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔'' (۱۲۲)

ایسے خوش قسمت معاشرے کی وجہ اشفاق احمد ''علم'' کا حصول گردانتے ہیں کہ علم کی روشنی سے ذہن و دل منور ہوتے ہیں اور صحت مند معاشرہ وجود میں آتا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ:

''بچے بھی سب کچھ جانتے تھے، عورتیں بھی جانتی تھیں، بڈھے بابے بھی آگاہی کی بیساکھیوں پر پڑے جھولتے تھے۔ ہر طرف جان کاری ہی جان کاری تھی۔ چنانچہ ہر شخص علم کی ڈور میں لپٹا ہوا تھا اور علم ہی ان کی واحد میراث تھی۔'' (۱۲۳)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''وہ لوگ علم کی ایسی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے کہ ان کے درمیان کسی قسم کی منافقت، پرخاش یا کھٹا پٹی باقی

نہیں رہی تھی۔'' (۱۲۴)

اشفاق احمد ایسا معاشرہ چاہتے ہیں جہاں نہ صرف ملک کے اندر امن وسکون کی فضا ہو بلکہ بیرونی طور پر بھی ملک ساری آفتوں سے محفوظ ہو جہاں کسی بھی قسم کا کوئی خلا نہ ہو نہ کوئی خطرہ ہو اسی قسم کے ایک ستارے کو انھوں نے پا لیا تھا اور اس کی تصویر اپنے قارئین کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ:

''رعنا نے کہا ''سر ہمارا ستارہ ایسے محفوظ مقام پر واقع ہے کہ وہاں نہ تو اسے کسی بلیک ہول کا خطرہ لاحق ہے اور نہ ہی اس کے قریب کوارکس کی آبادی ہے۔ بس سکون ہی سکون ہے، محبت ہی محبت ہے۔'' (۱۲۵)

ایسا معاشرہ، ایسا جہان، ایسا ستارہ جہاں کوئی بگاڑ نہ ہوں اخلاقی برائیاں نہ ہوں، شرارت کی قوتیں نہ ہوں، بدی کے اثرات نہ ہوں۔ ایسا معاشرہ جہاں ابلیسی طاقتیں پر مارنے کی طاقت نہ رکھتی ہوں۔ مثلاً قلارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس ستارے کی ساخت میں اور ساری کجیاں تو ہماری زمین جیسی ہیں لیکن اس میں تکبر اور انانیت کا جزو شامل نہیں ہے اور جس بنتر اور بناوٹ میں اشکبار کے اجزا شامل نہ ہوں وہاں شیطان کا عمل دخل نہیں ہوتا اور وہاں ابلیس کا اغوا ممکن نہیں رہتا۔ اور جو علاقہ شیطان اور اس کے لشکر کی دسترس میں نہ ہو، وہاں خواہشات نفسانی کی ساری ڈبیاں بھی کھل جائیں تو وہ خالی ہی رہتی ہیں۔ اصل میں ان کو آگ دکھانے والا اور شعلہ بھڑکانے والا شیطان ہی ہوتا ہے۔'' (۱۲۶)

یعنی جہاں نفرت، کدورت، حقارت اور غرور تکبر نہیں ہوتے وہاں شیطان کے سارے حربے ناکام ہو جاتے ہیں اور وہاں انسان کا نفس بے قابو نہیں ہوتا کیونکہ یہ نفسانی خواہشیں ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''ماحول اور محرک کے اثرات تو بلبلے پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، بنتا بھی ماحول کے دباؤ سے ہے اور ٹوٹتا بھی اسی کی تحریک پر ہے۔'' (۱۲۷)

اس لیے صحت مند معاشرے کے لیے ماحول کا بہتر ہونا بھی لازمی عنصر ہے۔ صحت مند ماحول سے جانور بھی انسانی صفات کا حامل ہوسکتا ہے اور بلند ترین مقام کو چھوسکتا ہے۔ مثلاً ''بولتا بندر'' میں ملاحظہ فرمائیے:

''جس طرح ان کے آباؤ اجداد ارتقاء کے زور پر بندر سے انسان بن گئے، ایک روز یہ بھی بندر نہیں رہیں گے اور انسانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔'' (۱۲۸)

اشفاق احمد ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی طرف ہمیں لے کر چلتے ہیں جہاں ہم اپنی کوشش اور ہمت سے حالات سے لڑ کر ان کو تبدیل کر سکتے ہیں جیسے کہ ان کے افسانے ''سلامتے کی مار'' اس کی واضح مثال ہے۔ جب سلامتے کو اس کا باپ گاموں چوہدری کے ساتھ رخصت کر دیتا ہے تو وہ ہتھیار نہیں ڈال دیتی بلکہ چوہدری کو مشکل میں ڈال دیتی ہے۔ جب گلو چوہدری کے چیخنے چلانے کی آواز سن کر گاموں کو بلانے کے لیے دوڑتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ:

> ''گاموں بولیا''ہن میں کی کراں۔ اوس سور کی بچی نے ہتھ ای ایسا پایا ہیگا کہ بندا ہل نئیں سکدا۔ یاں مر گیا یا توبہ تلا کر کے چھٹ گیا۔ بول میں کی کراں۔ بھلا میں کی پتہ سی اوہ ایسی زہری ہیگی۔ باہروں بالکل ملوک بالکل ساؤ۔ اندروں ایسی کپتی۔ میرے آکھیاں اوس چھڈ تھوڑی دینا ہیگا چوہدری کوں۔ دعا کرو۔ نال منت خوشامد کرو۔ چوہدری وی بچ جائے۔ گامو وی بچ جائے۔ بڑا بھاری مقدمہ بن سکدا ہیگا۔ میرے پورے ٹبر تے۔ آل اولاد تے۔'' گلو ایہہ گل سن کے رولا پاتا، حال دھائی مچاتا پھیر حویلی کی طرف نس گیا پر گاموں اپنی تھاں تے اسی طرح بیٹھا رہیا۔'' (۱۲۹)

گاموں تسلی سے بیٹھا رہتا ہے کیونکہ کہیں نہ کہیں وہ بھی اس بے جوڑ رشتے کے خلاف تھا اور رخصتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چوہدری کے آگے بے بس ہو کر اس نے اپنی بیٹی کی رخصتی کی تھی۔ سلامتے نے چوہدری کے ظلم کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اس کی جان مشکل کر دی کہ وہ بلبلا اٹھا۔ اشفاق احمد ایسا ہی معاشرہ چاہتے ہیں جہاں ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جائے، جہاں امیر کو اس کے ظلم کا مزا چکھایا جائے۔ جیسا کہ ان کے افسانے ''ننگ ناموس'' میں دارے لوہار نے ملک کے ساتھ اپنی بیوی کے یارانے کا بدلہ کچھ اس طرح سے لیا، اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''پرنالے کے ساتھ لگے لگے دارے کو شام کو واقعہ یاد آ گیا۔ مزارع دھاڑیں مار رہا تھا اور ملک کہہ رہا تھا یہ کتی نہیں میری دھی ہے۔ میری ننگ ناموس ہے۔ دارا نشے میں سوچ رہا تھا پستول چلے گا تو دونوں مر جائیں گے۔ دونوں ختم ہو جائیں گے پر ملک کی عزت میں فرق نہ آئے گا ملک زندہ بھی ملک تھا اور مر کر بھی ملک ہی رہے گا۔ اس نے اپنی ڈب میں پستول کو اچھی طرح سے لپیٹ کر تہمد میں اڑس لیا اور دیوار کے نال نال چلتا ہوا مسلیوں کے ڈیرے پہنچ گیا۔ سیٹی بجا کر اور پچکار پچکار کر وہ اسے اپنے ساتھ نالے کے اس لے آیا اور پھر ایک دم مسلیوں کے ڈبو کو گودی میں اٹھا کر ملک کے احاطے کے اندر سٹ دیا

جہاں بہار پر آئی ہوئی رانی فریادیں کر رہی تھی۔'' (۱۳۰)

ایسا معاشرہ جہاں غریب بھی ذہانت کا استعمال کر کے انتقام کا منصوبہ عقل مندی سے بنا سکتا ہے اور اس کو عملی جامہ بھی پہنا تا ہے تا کہ ایسے ملک لوگوں کو نصیحت ہو سکے وہ بھی اس کرب سے گزر سکیں جس سے دارا گزرا تھا جب اسے پتہ چلا تھا کہ ملک کے ساتھ اس کی بیوی کا یارانہ ہے۔

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں برے کام کا برا نتیجہ ہی دکھاتے ہیں کہ جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔ یہ اصلاحی سبق دے کر وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اگر اپنی نسلوں کو بقا چاہتے ہو تو خود کو درست رہنا پڑے گا۔ ان معاشرتی رویوں کو بے نقاب کر کے اور برائیوں کا نتیجہ پڑھ کر ہی ان سے اجتناب کیا جائے تا کہ اچھا اور صحت مند معاشرہ تشکیل دیا جا سکے۔ جیسا کہ چوہدری تفیّرے کی بچھیری اس کی اور اس کے بیٹے کی لا پرواہی کی وجہ سے کھو جاتی ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ:

''چوہدری تفیّرے نے جل کر کہا'' لکھ لعنت ہے تیری جوانی پر اور تیرے پیدا ہونے والے دن پر۔ پتہ نہیں کہاں کہاں خوار ہوتا پھرا ہے۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں خود جا کر بچھیری کھیت سے لے آتا...... جا دفع ہو جا میری آنکھوں کے آگے سے۔ پتہ نہیں کدھر کدھر بے حیائیاں کرتے پھرتے ہیں اور جانور بے آسرا چھوڑ کے خدا خیر کدھر منہ کالا کرتے ہیں۔'' (۱۳۱)

حالانکہ دونوں ایک ہی جیسی برائی اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اس لیے خدا بھی ان کی بچھیری کی حفاظت نہیں کرتا۔

اشفاق احمد ایک ایسے گھرانے کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں جہاں میاں بیوی وفاداری سے اپنے بچوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک پر سکون گھرانہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''تھوڑی دیر پچھوں رسولاں پولے پولے قدم دھرتی کوٹھے اندر گئی پھر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ دونوں شکاری اور شیرا ایک دوسرے کے گلے میں باہاں ڈال کے گھوک سوئے ہوئے پڑے تھے۔ منجی چھوٹی تھی۔ شیر کا سر اور پنجے سیر و اور پائنتی سے باہر نکلتے ہوئے تھے اور پگڑی بھوئیں نے کھلی پڑی تھی۔'' (۱۳۲)

اشفاق احمد کے نزدیک اگر اسی گھرانے کی طرح اپنے ملک، قوم، کام، زمین کے ساتھ وفادار رہا جائے تو پورا معاشرہ مثالی بن سکتا ہے۔ کیونکہ محبت ہی واحد شے ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک گھر سے ملک تک کو خوش مطمئن اور پر سکون رکھا جا سکتا ہے۔

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں ایسے مثالی معاشرے کا نقشہ کھینچتے ہیں جہاں انسان انسان سے محبت تو کیا، جانوروں کے لیے بھی اپنی جان کی بازی لگانے سے دریغ نہی کرتا۔ جس طرح ''بابا'' افسانے میں بابا کی بہو ایلن بچھڑے کو آزاد کروانے کے لیے خود کو منہ زور پانیوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''ایلن کمبل پرے پھینک کر اصطبل سے باہر بھاگ گئی۔ اس کے پیچھے بابا کی دو تین آوازیں گونجیں لیکن وہ طوفانی رات کے اندھیارے سینے میں گھستی چلی گئی۔ چتلی اب بھی ڈکرا رہی تھی اور ایلن کو پانی میں تیرتے دیکھ کر اس کی آواز میں اور کرب پیدا ہو گیا تھا۔ بارش کی شدت کم نہ ہوئی تھی اور پانی سمندری لہروں کی طرح اڈتا چلا آ رہا تھا۔ ایسی اندھیری رات میں کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ وہ اندازے لگاتی عین اس جگہ پہنچ گئی جہاں بہت سے بھنور پیدا ہو رہے تھے۔ جب اس نے آگے بڑھنے کے لیے زور سے پاؤں مارا تو اس کا پنجہ بچھڑے کی تھوتھنی پر لگا۔ وہیں سے غوطہ لگا کر وہ کھونٹے تک پہنچ گئی مگر زنجیر نہ کھول سکی۔ دوسری مرتبہ زیادہ گہری ڈبکی مار کر اس نے پانی کے اندر ہی اندر زنجیر کھولی اور بچھڑے کو آزاد کر دیا۔'' (۱۳۳)

اوار ایلن اس طوفانی بارش میں بچھڑے کو بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اشفاق احمد چاہتے ہیں کہ یہ احساس نہ صرف انسانوں کی آپس میں محبت پیدا ہو بلکہ جانوروں کے لیے بھی ہمدردی رکھتا ہو۔ کیونکہ جو انسان انسان سے محبت رکھتا ہو اس کے دل میں ہی ہمدردی کے جذبات ہو سکتے ہیں جو دردمند دل رکھتا ہو وہ ہی تڑپ کر ایک جانور کے لیے پانی میں چھلانگ لگا سکتا ہے۔

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں حکومتی سطح پر بھی کچھ تبدیلیاں لانے کے مشورے دیتے نظر آتے ہیں کہ ان جزئیات پر کام کر کے معاشرے میں تندرست افراد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ''گداگری'' باقاعدہ پیشے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اشفاق احمد کا خیال ہے کہ اگر حکومت ذرا سا غور فرمائے تو اس کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ نہ کہ ان کو سزا کے طور پر جیل خانوں میں بند کیا جائے بلکہ ان کو اگر روزگار فراہم کیا جائے یا ان کو ہنر سکھایا جائے تو معاشرے میں اچھی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے افسانے ''فل برائٹ'' میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''میں نے کہا اس کے کندھوں کی ہڈیاں نہیں دیکھیں آپ نے ایک ایک پسلی گنی جا سکتی تھی کمبخت کی۔

حکومت انھیں گرفتار کرنے کے بجائے ان کی روٹی پانی کا بندوبست کرے۔ انھیں کام مہیا کر کے دے تو
ایک بات بھی ہو۔ یہ کیا کہ ادھر ادھر سے پکڑ کر ٹرکوں میں بٹھایا اور لے جا کر بندی خانے میں دے دیا۔
اچھے بھلے آدمی کو جرائم پیشہ لوگوں کے حوالے کر دیا۔'' (۱۳۴)

اشفاق احمد نہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان ہاتھ پھیلانے والے ہاتھوں کو ہنرمند ہاتھوں میں تبدیل کر دیا جائے اور حکومت اس کے لیے کوئی عملی اقدام اٹھائے بلکہ وہ اس بات کو بھی ختم کرنے کے حق میں ہے کہ ان فقیروں کو جرائم پیشہ افراد میں شمار کرنا ان کے ساتھ نہ صرف زیادتی ہے بلکہ سراسر ظلم ہے۔ اشفاق کے خیال میں اگر ان ہاتھوں کو ہنر بخشا جائے ان کو کام دیا جائے تو یہ ہرگز کسی کے سامنے نہیں پھیلیں گے۔ اشفاق احمد ایسا مثالی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں انسانیت کی تذلیل ہو نہ ہو برابری کی سطح پر مساوات کے ساتھ زندگی گزاری جائے اور ایک دوسرے کے مسائل کا حل خوب سوچ سمجھ کر مثبت انداز میں کیا جائے۔ معاشرے سے گداگری جیسے پیشوں کا قلع قمع مثبت بنیادوں پر کیا جائے سزا کے ذریعے نہیں بلکہ حل نکال کر مسائل کا خاتمہ ہو نہ کہ ان کو عارضی طور پر دبا دیا جائے۔

اشفاق اپنے افسانوں میں اپنے لوگوں کو ایسی سوچ عطا کرتے ہیں جس کو اپنا کر ہمارا شمار ترقی یافتہ اقوام میں ہو سکتا ہے۔ وہ موجودہ معاشرتی صورتحال سے مایوس نہیں ہیں اور نہ ہی حالات کا ذمہ دار کسی ایک شے کو ٹھہرا کر کوستے نظر آتے ہیں بلکہ وہ آگے کی طرف چلنے کے لیے راہوں کو روشن کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''کوشش اور سعی مسلسل کے بغیر معاشرے میں زندگی کے آثار باقی نہیں رہتے۔ مقابلے کی فضا میں ہی قومیں
آگے بڑھتی ہیں اور مقابلہ کر کے ہی انسان حیات ارضی میں آفتاب جہاں تاب بن کر دمکتا ہے۔'' (۱۳۵)

اور آگے بڑھنے کے لیے مثالی صورتحال پیدا کرنے کے لیے چند مشورے بھی دیتے نظر آتے ہیں تا کہ ملک کو ترقی کا گہوارہ بنا کر کامیاب معاشرہ تشکیل دیا جائے وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہم کہتے ہیں میرٹ پر آنے والوں کو زندہ رہنے کا حق دو، انھوں نے محنت کی ہے، مشقت جھیلی ہے۔
بے میرٹ لوگوں کو اس معاشرے سے نکال دو، اس ملک سے دفع کرو۔ وہ ہمارے ملک کا بوجھ اور ہمارے
معاشرے کا ناسور ہیں۔ کامیاب لوگ ہمارے وطن کی زینت اور معاشرے کا حسن ہیں۔'' (۱۳۶)

اس لیے ہنرمند لوگوں کی عزت کی جائے اور بے ہنر لوگوں کو پیچھے کیا جائے تا کہ ملک کی ڈور ہنرمند، سلیقہ شعار اور

تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ ایسا معاشرہ تعمیر کیا جائے جہاں آرٹسٹ، فنکاروں اور تخلیق کاروں کی عزت ہو۔ کیونکہ فنکار معاشرے کو اپنے فن کے ذریعے سے جس طرح محظوظ کرتا ہے اور سوچ کے نئے در وا کرتا ہے معاشرے کا فرض ہے کہ اس کی عزت کرے اور اس کا اصل مقام اسے دے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''فن کار ایک انسان، ایک شخص یا ایک فرد نہیں ہوتا، وہ ایک مکتبہ فکر، ایک سکول آف تھاٹ ہوتا ہے۔ اس نے معاشرے کو اچھا وقت دیا ہوتا ہے۔ اس نے معاشرے پر کچھ احسانات کیے ہوتے ہیں اور ان احسانات کا بدلہ چکانا معاشرے کے فرائض میں داخل ہوتا ہے۔'' (۱۳۷)

اشفاق احمد ایسا معاشرہ چاہتے ہیں جہاں شاعروں اور ادیبوں کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیا جائے۔ انھیں باعزت طریقے سے سراہا جائے، ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ادیبوں اور شاعروں کا کوئی مقام ہے اس جگہ۔ کوئی ان کے لیے اچھی نوکریاں یا اچھے رتبے یا پلاٹ اور پنشن ہیں کہ معاشرے میں ان کا مقام ہو، ان کی بات سنی جائے، ان پر توجہ دی جائے۔'' (۱۳۸)

تا کہ ایک فنکار کی معاشرے میں عزت ہو اور وہ دوسروں کے لیے حقوق کے لیے اپنے قلم کو اٹھا سکیں اور عوام کے مسائل کے لیے آواز بلند کر سکیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی اپنی زندگی اور مستقبل محفوظ ہوں تا کہ وہ منفی رجحانات کی طرف قدم نہ بڑھائیں، بلکہ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''آپ ادیب اور شاعر اور نقاد اور دوسرے دانشور اپنے قلم کو ہماری سہائتا اور رکھشا کے لیے استعمال کریں اور ہمارا حق ہمیں دلوائیں۔'' (۱۳۹)

ایک ادیب اور شاعر سے یہی امید رکھی جائیں کہ اس کا قلم جب بھی اٹھے گا عوام کے مسائل کی نشاندہی اور حقوق کے لیے بلند ہوگا کیونکہ ساری کائنات خدا تعالیٰ کی بے مثال فن کی صناعی ہی تو ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''انسان عظیم ہے خدایا، اور میں لافنا ہوں کہ میرا فن امر ہے اور فن زندگی ہے، فن حیات ہے، فن شکتی ہے، اور اس ساری کائنات کا مدار فن پر ہے اور ساری تخلیق فن کی لیلا ہے اور فن آرٹسٹ کے ہاتھ کا مرہون منت ہے، انسان کے ہاتھ کا دست نگر ہے اور انسان بہت بڑا ہے......اس پوری کائنات سے بڑا اور اس ہر لحہ پھیلتی ہوئی کائنات سے اور بھی بڑا۔'' (۱۴۰)

اشفاق احمد جہاں انسان کی عزت اس کے فن کی قدردانی کرنے والے معاشرے کو اپنی چشم تخیل سے دیکھتے ہیں وہاں ایسے آرٹسٹ، بے دھڑک، شفاف انسانوں کے بھی طلب گار ہیں جو آگے بڑھ کر ان خوابوں کو تعبیر دے سکیں۔ کم حوصلہ اور بے زبان لوگوں کا حوصلہ اور زبان بن سکیں۔ مثلاً ڈھور ڈنگر کی واپسی میں نائیلہ گاؤں میں آکر وہاں کی بے بس عورتوں کی زبان بن گئی۔ ملاحظہ فرمائیے:

''گاؤں کی عورتیں کیا بڑی بوڑھیاں، کیا جوان لڑکیاں اور کیا نوخیز چھوکریاں سبھی نائلہ کی عاشق ہو گئی تھیں، جن باتوں کا اظہار مردوں کے منہ پر کرنے سے وہ ڈرتی تھیں اور جن باتوں کو ایک مرتبہ کر دینے کی حسرت لے کر ان کی مائیں، ماسیاں اور دادی نانیاں قبروں میں چلی گئی تھیں، وہ باتیں نائلہ پھٹاک دے کر بڑے بزرگوں کے منہ پر دے مارتی تھی اور اردگرد دور دور تک پھیلی عورتوں کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی تھی۔ ان کے ہر دے دیر تک تالیاں بجاتے رہتے تھے اور ان کی کوکھیں ہر ہر جنبش کے ساتھ نعرے مارتی چلی جاتی تھیں۔'' (۱۴۱)

اشفاق احمد کے خیال میں برے حالات کو اچھے میں بدلنے کے لیے کسی نہ کسی کو مسیحا بن کر میدان میں اترنا پڑتا ہے اور کوشش کر کے صدیوں کی گھٹن کو دور کیا جا سکتا ہے۔ تبھی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ایک مشن کا ہونا ضروری ہے تاکہ ایک مقصد کے تحت اپنی کوششوں کو بروئے کار لا کر مثبت تبدیلی لائی جا سکے۔ جیسا کہ ''ڈھور ڈنگر کی واپسی'' میں نائلہ کا ایک مشن تھا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''دراصل وہ گاؤں کی عورتوں کے ذہن سے صدیوں پرانی گھٹن دور کر کے انھیں پاک صاف کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان کے ذہن سے وہ جالے دور کرنا چاہتی تھی جو فیوڈل نظام اور ملا کے کلام کے متفقہ سازش کے ذریعے ان کے ذہنوں میں تانے تھے۔ وہ شفاف ذہن، شفاف بدن، شفاف الیکشن اور شفاف سودے کی قائل تھی۔ وہ ایسی غلط ملط غلطیاں قسم کی زندگی کے بے حد خلاف تھی جس میں انسان ساری زندگی ٹوٹتا تڑپتا ہی رہے اور تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔'' (۱۴۲)

ایسا معاشرہ جس میں صاف ستھرے لوگ نیک نیتی کے ساتھ سامنے آکر معاشرے میں مثبت انقلاب لا سکیں۔ انسانوں کو بہتری کی طرف لے جانے کی کوشش کر سکیں، بغیر کسی لوبھ لگن اور لالچ کے صرف انسانیت کی فلاح ہی مقصد ہو۔ ایسا

معاشرہ جہاں انسان آزادی رائے رکھتا ہو اور اسے اپنا حق مانگنے اور چھوڑنے دونوں کی آزادی ہو۔اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

''ماسٹر عبدالودود نے کہا'' دلبر شاہ صاحب مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ بے شک رائٹس مانگنے کے لیے ہوتے ہیں اور ہر شخص کو رائٹس مانگنے کا پورا پورا حق ہے، لیکن اگر کوئی اپنا حق چھوڑنا چاہے تو اس کو اتنی آزادی تو ہونی چاہیے کہ وہ اسے چھوڑ سکے اور بلا جبر و اکرا چھوڑ سکے۔ اس پر پابندی تو نہیں ہونی چاہیے۔'' (۱۴۳)

ایسا معاشرہ جہاں آزادی فکر کے عملی اظہار کو بے وقوفی نہ سمجھا جائے بلکہ اس کو سراہا جائے اور عزت سے نوازا جائے جہاں امیر غریب سب برابری کی سطح پر ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوں۔ طبقاتی تفریق ختم ہو کر رہ جائے۔ اشفاق احمد ایسے ہی تصوراتی معاشرے کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ہمارا کلچر پیٹرن کتنی تیزی سے بدل رہا ہے۔ ابرارا اب مزدور لوگ بھی کیک کاٹ کر اپنے بچوں کی سالگرہیں منانے لگے ہیں۔ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔'' (۱۴۴)

ایسا معاشرہ جہاں بغیر حسد اور جلن کے اپنے سے نچلے طبقے کے لوگوں کی خوشیوں کا احساس کر کے ان کو تسلیم کیا جا سکے اور ان کو مان اور عزت دی جائے۔ اشفاق احمد اپنے افسانوں میں مثالی معاشرے کا ایسا اسکیچ پیش کرتے ہیں جس پر مثبت سوچ کی تعمیر سے درخشاں مستقبل کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ وہ تمام عمر دنیا و آخرت کی فکر میں نہ صرف خود رہے بلکہ اپنے قارئین اور ناظرین کو بھی رکھا۔ اس لیے ان کے مثالی معاشرے میں مثالی انسان کا تصور بھی نظر آتا ہے۔ اشفاق احمد کے ہاں معاشرے میں موجود ہر فرد کی زندگی اپنے تمام تر عناصر کے ساتھ موجود ہے اور وہ فرد اور معاشرے کے تعلق کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر بہتر بنانے کی ہر کوشش میں مکمل کامیاب نظر آتے ہیں۔

حواشی

۱۔ ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر ''تصوف ہر انسان کی ضرورت'' لاہور، تخلیقات علی پلازہ مزنگ روڈ، ۲۰۱۰، ص ۵۹

۲۔ شمیم حسین قادری، سید، ''اسلامی ریاست۔قرآن وسنت کی روشنی میں'' لاہور، شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف پنجاب، جون ۱۹۸۴، ص ۲۸

۳۔ اردو انسائیکلوپیڈیا۔ فیروزسنز، چوتھا ایڈیشن، مطبوعہ فیروزسنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۸

۴۔ اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، جلد دوم، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، دائرہ معارف اسلامیہ، س ن، ص ۱۵۸۲

۵۔ Bryans Turner "The cambridge Dictionary of Sociology" Cambridge University Press, 2006, Pg 592

۶۔ William outh waite, Tom Bottomore "The Blackwell Dictionary of twentieth century social thought" Uk Blackwell Publishers, 1993, Pg 202

۷۔ Jhon Scots, Gordon Marshall, "Oxford Dictionary of Sociology" 3rd 2005, Pg 622

۸۔ رشید احمد، پروفیسر ''مسلمانوں کے سیاسی افکار'' لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۶ء، ص ۲۱۸

۹۔ تجمل حسین ہاشمی، ''ہمارا معاشرہ'' لاہور، ابلاغ پبلشرز، اردو بازار، جنوری ۲۰۰۱، ص ۲۲

۱۰۔ خورشید احمد ''اسلامی نظریہ حیات''، کراچی، شعبہ تصنیف وتالیف، ۱۹۷۹، ص ۴۰۵

۱۱۔ خالد علوی، ڈاکٹر، ''اسلام کا معاشرتی نظام، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، ۱۹۶۸ء، ص ۳۱

۱۲۔ تجمل حسین ہاشمی، ''ہمارا معاشرہ'' لاہور، ۲۰۰۱، ص ۱۳

۱۳۔ محمد اکرام شیخ ''ثقافتی ورثہ کی نوعیت'' مشمولہ پاکستانی ثقافت، پاکستانی ادیبوں کے منتخب مضامین، مرتبہ، رشید احمد ڈاکٹر، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۹، ص ۱۷

۱۴۔ رشید احمد پروفیسر، ''مسلمانوں کے سیاسی افکار'' لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۶، ص ۲۲۰۔۲۱۹

۱۵۔ وحیدالدین خان، مولانا، ''سوشلزم اور اسلام'' لاہور، المکتبۃ الاشرفیہ، ۱۹۸۵، ص ۱۷

۱۶۔ سرسید احمد خان، ''مقالات سرسید'' مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ج ۳، ۱۹۶۹، ص ۲۴

۱۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر ''کلچر کا مسئلہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۲

۱۸۔ آزاد کوثری، ''پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں، لاہور، ٹمپل روڈ، ۱۹۸۸، ص ۲۷

۱۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پاکستانی ثقافت۔ پاکستانی ادیبوں کے منتخب مضامین، مرتبہ: رشید احمد، ڈاکٹر، اسلام آباد، اکادمی ادبیات ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۱

۲۰۔ عبدالقادر، چوہدری، پروفیسر، ڈاکٹر ''تغیر اور نظریات تغیر'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، جون ۱۹۸۱، ص ۱۴

۲۱۔ محمد اقبال، چوہدری، ''پاکستانی معاشرہ'' لاہور، عزیز پبلشرز چوک اردو بازار، ۱۹۹۳ء، ص ۴۵

۲۲۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، فلسفہ عمرانیات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱، ص ۷

۲۳۔ علاؤ الدین اختر، ریڈولف سیلر، ''معاشرتی نفسیات (برائے اہل پاکستان)'' لاہور مجمع البحرین، میکلوڈ روڈ، ۱۹۵۸ء، ص ۵۱

۲۴۔ اکبر ایس احمد، ''پاکستانی معاشرہ۔ جنوبی ایشیا میں اسلام، نسل پرستی اور قیادت'' مترجم: طارق محمود، پاکستان، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۳

۲۵۔ سی اے قادر، ڈاکٹر ''معاشریات مذہب'' تدوین: انور سدید، ڈاکٹر، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، جون ۱۹۹۱، ص ۱۲۴

۲۶۔ سی اے قادر، پروفیسر، ڈاکٹر ''معاشریات'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، جنوری ۱۹۷۴ء، ص ۱۱۶

۲۷۔ ایرک فرام، ''صحت مند معاشرہ'' مترجم: قاضی جاوید، لاہور، انتخاب جدید پریس، ۱۹۹۱، ص ۳۱

۲۸۔ سی۔ اے قادر، ڈاکٹر، ''معاشریات طب'' تدوین: انور سدید، ڈاکٹر، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، اپریل ۱۹۸۹ء، ص ۵۳

۲۹۔ مظفر حسن، ڈاکٹر ''تعلیمی عمرانیات'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جون ۱۹۹۰ء، ص ۳۳۷

۳۰۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا، مرتبہ محبوب عالم، مولوی، ترتیب و تدوین، عالم محمود، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۸۹ء، ص ۶۴۷

۳۱۔ ایئرڈ جان، جان۔ جے ہونگمن بن، ڈینس برناٹ، میری جین کینڈی، جیمز ڈبلیو، بیس زیگر ایگلر، ہربرٹ ایچ، وریلٹر، ''پاکستان، معاشرہ اور ثقافت'' مولف سٹینلی میرن، مترجم غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، لاہور، تخلیقات علی پلازہ، ۳۔مزنگ روڈ، ۲۰۰۶، ص۱۱۴

۳۲۔ قطب شہدہ سید، العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، لاہور، اردو ترجمہ، ۱۹۷۷، ص ۱۶۵

۳۳۔ عبدالحکیم، خلیفہ، ''Islamic Ideology'' لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۸ء، ص۱۷۲۔۱۷۰

۳۴۔ سی۔اے قادر، ڈاکٹر، ''ثقافتی انسانیت''، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، جنوری ۱۹۸۹ء، ص۱۱۷

۳۵۔ عطاء الرحمٰن ''مرحوم اشفاق احمد'' مشمولہ، اردو کا آخری داستان گو، مرتبین: افتخار حجاز، عرفان احمد خان، لاہور، حیدر پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص۸۲

۳۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا'' مشمولہ اردو کا آخری داستان گو (مرتبین: افتخار مجاز، عرفان احمد، ۲۰۰۴ء، ص۹۷

۳۷۔ عطاء الرحمٰن ''مرحوم اشفاق احمد'' مشمولہ اردو کا آخری داستان گو (مرتبین: افتخار مجاز، عرفان احمد خان) لاہور، حیدر پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص۸۰

۳۸۔ اشفاق احمد ''عجیب بادشاہ'' مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۱۸

۳۹۔ اشفاق احمد ''بندرا بن کی کنج گلی میں'' مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے''، ص۱۲۸

۴۰۔ اشفاق احمد ''بابا'' مشمولہ ''ایک محبت سو افسانے''، ص۱۵۵

۴۱۔ اشفاق احمد ''تنکہ'' مشمولہ: ''اُجلے پھول۔ گڈریا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص۴۴

۴۲۔ اشفاق احمد ''حقیقت نیوش''، مشمولہ: ''اُجلے پھول۔ گڈریا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص۹۰۔۸۹

۴۳۔ اشفاق احمد ''سلامتے کی مار''، مشمولہ ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص۳۳

۴۴۔ اشفاق احمد ''چل چلی'' مشمولہ: ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص ۳۹

۴۵۔ اشفاق احمد ''رشوت'' مشمولہ ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری''، ص۲۷

۴۶۔ ایضاً، ص۳۷

۴۷۔ اشفاق احمد ''بچھیری'' مشمولہ: ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری''، ص ۸۹

۴۸۔ اشفاق احمد ''پھمن کہانی'' مشمولہ ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری'' ص ۱۰۴

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۷۷

۵۱۔ اشفاق احمد ''لسوڑی''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۲۹

۵۲۔ ایضاً، ص ۳۲

۵۳۔ جمیل حسین ہاشمی، ''ہمارا معاشرہ''، ص ۱۹

۵۴۔ اشفاق احمد، ''سعید جونیئر'' ایضاً، ص ۵۰

۵۵۔ جمیل حسین ہاشمی، ''ہمارا معاشرہ''، ص ۳۶

۵۶۔ اشفاق احمد، ''آخری حملہ''، ۶۲

۵۷۔ اشفاق احمد ''کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ'' ایضاً، ص ۱۷

۵۸۔ ایضاً

۵۹۔ اشفاق احمد ''قلارے'' ایضاً، ص ۹۷

۶۰۔ اشفاق احمد ''چھ چھکا بتیس'' ایضاً، ص ۶۴

۶۱۔ ایضاً، ص ۴۸

۶۲۔ جمیل حسین ہاشمی، ''ہمارا معاشرہ''، ص ۲۰

۶۳۔ قلارے۔ ص ۹۳

۶۴۔ قلارے۔ ص ۹۴

۶۵۔ قلارے۔ ص ۹۷

۶۶۔ اشفاق احمد ''بولتا بندر'' مشمولہ: ''طلسم ہوش افزا'' ص ۱۳۲

۶۷۔ اشفاق احمد، ''اماں سردار بیگم'' مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۱

۶۸۔ اشفاق احمد، ''آڑھت منڈی''، مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص۶۰

۶۹۔ ایضاً، ص۶۹

۷۰۔ اشفاق احمد، ''بٹر باز''، مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص۸۱

۷۱۔ اشفاق احمد، ''ماسٹر روشی''، مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص۹۲

۷۲۔ ایضاً، ص۱۰۱

۷۳۔ ایضاً، ص۱۰۳

۷۴۔ اشفاق احمد، ''سرور مرثیہ''، مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص۱۳۹

۷۵۔ اشفاق احمد، ''شازیہ کی رخصتی''، مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص۱۶۱

۷۶۔ ایضاً، ص۱۴۷

۷۷۔ اشفاق احمد، ''بے غیرت مدت خان''، مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص۱۵۷

۷۸۔ ایضاً، ص۱۵۸

۷۹۔ ایضاً، ص۱۶۸

۸۰۔ ایضاً، ص۱۶۶

۸۱۔ ایضاً، ص۱۵۴

۸۲۔ ایضاً، ''بندر لوگ'' ص ۱۷۸

۸۳۔ ایضاً، ''پل صراط اور پاسپورٹ''۔ ص۲۱۰

۸۴۔ ایضاً، ''پل صراط اور پاسپورٹ''، ص۲۰۷

۸۵۔ ایضاً، ''قصہ شاہ مراداوار ایک احمق چڑیا کا''، ص۲۳۲

۸۶۔ ایضاً ''بیک گراؤنڈ''، ص۲۴۵

۸۷۔ بیک گراؤنڈ۔ ص۲۴۶

۸۸۔ اشفاق احمد، ''اٹوٹ مان''، مشمولہ: ''سفر مینا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔ ۲۰۰۷ء، ص۱۴۲

۸۹۔ ایضاً ''قصہ نل دمنیتی''۔ص ۱۷۱

۹۰۔ ایضاً ''محسن محلّہ''۔ص ۲۱۴

۹۱۔ ایضاً ''گاتو''،ص ۲۴۷۔۲۴۶

۹۲۔ ایضاً ''فل برائٹ''،ص ۲۵۹

۹۳۔ ایضاً ''فل برائٹ''ص ۲۷۲

۹۴۔ تجمل حسین ہاشمی،''ہمارا معاشرہ'' لاہور، ابلاغ پبلشرز، ۱۹۷۳ء،ص ۱۹

۹۵۔ Robert Boynlon "Introduction to the short story" Haydon Book Company, U.S.A 1978, Page 13

۹۶۔ وقار عظیم، پروفیسر''فن اور افسانہ نگاری'' ادارہ اشاعت اردو، کراچی، طبع اول اکتوبر ۱۹۴۹،ص ۲۵

۹۷۔ تجمل حسین ہاشمی،''ہمارا معاشرہ'' ابلاغ پبلشرز اردو بازار، لاہور، طبع اول جنوری ۱۹۷۳،ص ۲۲

۹۸۔ اشفاق احمد''گڈریا'' مشمولہ:''جلے پھول۔گڈریا''، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔ص ۱۳

۹۹۔ ایضاً۔ص ۲۸

۱۰۰۔ ایضاً۔ص ۲۰

۱۰۱۔ ایضاً ''گل ٹریا''،ص ۵۴

۱۰۲۔ ایضاً ''گل ٹریا''،ص ۶۰

۱۰۳۔ ایضاً ''تنکہ''۔ص ۷۰

۱۰۴۔ ایضاً ''تنکہ''۔ص ۷۲

۱۰۵۔ ایضاً ''تنکہ''،ص ۷۲

۱۰۶۔ ایضاً ''حقیقت نیوش''۔ص ۷۹

۱۰۷۔ ایضاً ''توشے بلے''۔ص ۹۷

۱۰۸۔ ایضاً ''صفدر ٹھیلا''۔ص ۱۰۰

۱۰۹۔ ایضاً ''صفدر ٹھیلا''۔ص۱۰۱

۱۱۰۔ ایضاً ''صفدر ٹھیلا''۔ص۱۰۳

۱۱۱۔ ایضاً ''صفدر ٹھیلا''۔ص۱۰۷

۱۱۲۔ ایضاً ''اُجلے پھول''۔ص۱۲۰

۱۱۳۔ ایضاً ''اُجلے پھول''۔ص۱۲۱

۱۱۴۔ ایضاً ''اُجلے پھول''۔ص۱۲۲

۱۱۵۔ تجمل حسین ہاشمی، ہمارا معاشرہ، ابلاغ پبلشرز اردو بازار، لاہور، جنوری ۱۹۷۳، ص۹۵

۱۱۶۔ اشفاق احمد، ''قصاص''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۱

۱۱۷۔ ایضاً، ص۱۵

۱۱۸۔ اشفاق احمد، ''ملک مروت''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۲۷

۱۱۹۔ اشفاق احمد، ''سعید جونیئر''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۵۱

۱۲۰۔ ایضاً

۱۲۱۔ اشفاق احمد، ''کہکشاں ٹیکسی سٹینڈ''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۷۱

۱۲۲۔ اشفاق احمد، ''پوری جان کاری''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۷۵

۱۲۳۔ ایضاً، ص۷۸

۱۲۴۔ ایضاً، ص۷۹

۱۲۵۔ اشفاق احمد، ''پوری جان کاری''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۸۰

۱۲۶۔ اشفاق احمد، ''قلارے''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۸۷

۱۲۷۔ ایضاً، ص۹۵

۱۲۸۔ اشفاق احمد، ''بولتا بندر''، مشمولہ: ''طلسم ہوش افزاء'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص۱۲۶

۱۲۹۔ ایضاً، ص۱۳۴

۱۳۰۔ اشفاق احمد، ''سلامتے کی مار'' مشمولہ: ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۳۵

۱۳۱۔ اشفاق احمد، ''ننگ ناموس'' مشمولہ: ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۸۸

۱۳۲۔ اشفاق احمد، ''پچھیری'' مشمولہ: ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۹۴

۱۳۳۔ اشفاق احمد، ''دوپہر ویلے'' مشمولہ: ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۹۹

۱۳۴۔ اشفاق احمد، ''بابا'' مشمولہ: ''ایک محبت سو افسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۲

۱۳۵۔ اشفاق احمد، ''فل برائٹ'' مشمولہ: ''سفر مینا'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵۶

۱۳۶۔ اشفاق احمد، ''خود بدولت'' مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۳۵

۱۳۷۔ اشفاق احمد، ''ماسٹر روشی'' مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۴

۱۳۸۔ اشفاق احمد، ''شازیہ کی رخصتی'' مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۷

۱۳۹۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۱۴۰۔ ایضاً

۱۴۱۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۱۴۲۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۱۴۳۔ اشفاق احمد، ''قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا'' مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۳۱

۱۴۴۔ اشفاق احمد، ''سہیل کی سالگرہ'' مشمولہ: ''صبحانے فسانے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۷۶

محاکمہ

اشفاق احمد ۲۲ اگست ۱۹۲۵ کو مکتسر ضلع فیروز پور بھارت میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش تصنیف و تالیفات کے سلسلے میں بانو قدسیہ اور داستان سرائے کے مکینوں سے واضح شواہد راقمہ نے حاصل کیے اور بانو قدسیہ سے ملاقات بھی کی کیونکہ:

''اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی شخصیات افسانہ نگار ہونے کے باوجود ایک دوسرے میں اتنی پیوست ہیں کہ انھیں اپنی انفرادیت کے باوجود ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نظر نہیں آتا......اشفاق احمد بانو کے شوہر ہی نہیں بلکہ دوست بھی ہے۔'' (۱)

اشفاق احمد ۱۹۴۷ میں ملک کی تقسیم کے ساتھ ہی لاہور آ گئے اور یہاں مہاجرین کے کیمپوں سے ہی پاکستانی عوام کی خدمت کا آغاز کر دیا۔ ریڈیو اسٹیشن، ٹیلی ویژن، کتاب اور کام کے ذریعے ہر گام پر عوام کے ساتھ اپنا رویہ مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔ اشفاق احمد کی ادبی زندگی کا آغاز بچپن میں ہی ہو گیا تھا جب انھوں نے بچوں کے رسالے ''الوقیع'' میں کہانی لکھ کر بھیجی اور اس کے بعد قلم سے ان کا رشتہ تادم مرگ برقرار رہا۔ اشفاق احمد نے درس و تدریس، تعلیم و تالیف سے لے کر علمی و ادبی ہر سطح پر ملک و قوم کی خدمت سے کبھی منہ نہ موڑا۔ تقسیم کے بعد مہاجرین کے کیمپوں سے آغاز ہونے والی اس خدمت خلق کا سفر ''تلقین شاہ'' سے لے کر ''زاویہ'' کے بابا جی تک جاری رہا بلکہ ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد کبھی ''بابا صاحبا''، ''عرض مصنف'' اور کبھی بانو آپا کی ''راہ رواں'' میں ان کی حکمت و دانش کے موتی آج بھی دل و دماغ روشن اور روح کو تر و تازگی بخشتے ہیں۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں ہی ''گڈریا'' لکھ کر بے پناہ شہرت حاصل کرنے والے اشفاق احمد آج بھی صوفی بابا کے روپ میں ہر عمر، طبقے اور پیشے کے دل میں پوری آب و تاب کے ساتھ جاگزیں ہیں۔

اخلاقیات ایک ایسا علم ہے جو انسانی زندگی سے انتہائی قریبی تعلق رکھتا ہے۔ ماہرین اخلاقیات نے اس ضمن میں مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ ایک ماہر اخلاقیات جب اخلاق کی توضیع کرتا ہے تو اس کے پیش انسان کی عملی زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کی روشنی میں ایسے طریقے وضع کرنا ہوتا ہے جو اس کو صحیح معنوں میں صحت مند اور بھرپور کامیاب زندگی گزارنے میں مدد دے سکیں۔ اخلاقیات کا کام درس دینا یا آدرش جاری کرنا نہیں ہے۔ علم اخلاق انسان کو

نیک و بد، خیر وشر، اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا سکھاتا ہے۔ وہ کسی بات پر زور نہیں دیتا بلکہ پہچان عطا کرتا ہے۔علم اخلاقیات کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اس کی جڑیں کہیں نہ کہیں مذہب سے جڑی نظر آتی ہیں۔ مذہب کی بنیاد ہی انسان کی فلاح پر رکھی گئی ہے۔ مذہب صرف دکھاوے کو نہیں مانتا بلکہ اس کی اصل روح عمل پر منحصر ہوتی ہے۔ خالد محمود لکھتے ہیں کہ:

"There are two elements of religion they are 1. Faith and 2. Action." (2)

مذہب انسان کو آنکھیں بند کر کے اپنے احکامات پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دیتا ہے، ہر مذہب کی اخلاقی تعلیمات کا نچوڑ انسانی بھلائی اور فلاح ہے۔ نیکی کے لیے جزا اور بدی کے لیے سزا کے احکامات اس لیے مقرر کیے گئے ہیں تاکہ انسان سیدھے راستے پر چل کر خود اپنے اور دوسروں کے لیے خیر کا باعث ہو سکے۔ ماہرین اخلاقیات کے مطابق انسان کی فطرت میں بحرالحال نیکی کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی مٹی میں ضمیر کو گوندھ رکھا ہے جو اس کے اندر بدی سے نفرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ فطرت کی تفہیم کے لیے اسرار رموز کائنات کو جاننا ضروری ہے کیونکہ کائنات کے ہر ذرے میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں۔ اور جب انسان ان حقیقتوں کے عرفان تک پہنچتا ہے تو اعلیٰ اخلاقی اقدار سے وابستگی ہو جاتی ہے۔ مذہب کے مطابق بھی ایمان کے ساتھ اعمال کی موجودگی کو ہی بنیاد بنایا گیا ہے۔ اسی صورت میں انسان سے نیک اعمال سرزد ہو سکتے ہیں۔علم اخلاقیات سے ہرگز مراد نہیں ہے کہ آپ کو اچھے راستے پر چلنے کی اور برے سے بچنے کی تلقین کی جائے بلکہ علم اخلاق آپ کو فطرت کے قریب لے جا کر زندگی کے حسن و قبح سے واقف کرواتا ہے۔ کوئی بھی فیصلہ صادر نہیں کرتا بلکہ فطری طور پر طبیعت کو اس طرف مائل کرتا ہے جس میں نیکی کے سوا کوئی اور گنجائش نہیں ہوتی۔ یعنی اخلاقی اعمال سے جزا کو جوڑ کر اسے پر مسرت اور فائدہ مند بنا دیا جاتا ہے اس سلسلے میں ہربرٹ سپنسر لکھتے ہیں کہ:

> ''تربیت کا جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ ایسا عمل ہونا چاہیے جو فی الواقع مسرت انگیز ہو...... جوانی کی خوشی کا قائم رکھنا بجائے خود ایک قابل قدر مقصد سمجھنا چاہیے بجز اس صورت کے کہ ہم راہبانہ اخلاق (بلکہ یوں کہو کہ بداخلاقی) کی طرف الٹے ہٹ جائیں۔'' (۳)

انسان کی فطرت ہے کہ جس کام میں وہ راحت محسوس کرتا ہے اسے زیادہ دلجمعی سے کرتا ہے اور جس سے نفرت اس کو کرنے کے باوجود بے ترتیب اور بے ڈھنگ بنا ڈالتا ہے۔ اس لیے فلسفہ اخلاقیات میں اخلاق انسانی تربیت کے لیے زور

زبردستی سے کام نہیں لیتی بلکہ فطرت کے عین مطابق، معیار اور امتیاز پیدا کرتی ہے۔ ادب اور اخلاقیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے کیونکہ ایک سچا ادیب ہی واعظ اور مولوی سے ہٹ کر صرف قارئین کے سامنے پند و نصائح نہیں بلکہ زندگی کے نشیب و فراز، خوبصورتی و بدصورتی ان کی وجوہات پیش کرتا ہے اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ کس شے کا انتخاب کرتے ہے۔ ادیب نہایت ہوشیاری سے قاری کے سامنے ایسی صورت حال کا نقشہ جزئیات کے ساتھ کھینچتا ہے کہ وہ خود بخود ''درست'' کا فیصلہ کر بیٹھتا ہے۔ خود انتخاب کرتا ہے اس لیے اپنی مرضی سے کیے گئے فیصلے کا احترام بھی کرتا ہے۔ اس کو برقرار بھی رکھتا ہے اور روحانی مسرت بھی حاصل کرتا ہے۔ اشفاق احمد بھی ایک ایسے ہی ادیب ہیں۔ ان کے پیش نظر بھی ہمیشہ علم اخلاقیات رہا ہے۔ وہ برائی یا اچھائی کچھ بھی بیان کر کے اس سے نیکی کا پہلو واضح کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ اس سلسلے میں فرزانہ سید لکھتی ہیں کہ:

> ''اشفاق احمد بھی زندگی کے ہر طبقہ کی کہانی کہتے ہیں اور کرداروں کے تضادات، ان کی منافقتوں، کمینگیوں اور دیگر روحانی و سماجی آلائشوں سے بھی کہانی پیدا کرتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی ہوشیاری سے ریکارڈ اور نشر کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں اور واقعات سے بڑی باتیں خود بخود پیدا ہونے لگتی ہیں۔'' (۴)

اشفاق احمد نے آزادی سے پہلے اور بعد کے حالات کو بہت قریب سے دیکھا، مشاہدہ کیا اور تجربے سے گزرے۔ انھوں نے موجودہ معاشرے کے خدوخال اپنے سامنے ترتیب ہوتے دیکھے تھے۔ وہ پاکستان کی تہذیب کی اصلیت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''حصول پاکستان کے بعد، قیام پاکستان کے بعد، باوجود اس کے کہ جسمانی طور پر ہر باہر کا گورا حاکم ہم سے دور ہو گیا تھا۔ ذہنی طور پر ہم ان کی تہذیب اور تمدن کے قریب تر ہوتے گئے۔'' (۵)

اشفاق احمد اپنے وطن، تہذیب، ثقافت سے محبت کرتے ہیں اور اسی کو اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے ہر قومی اور بین الاقوامی مسئلے کو اخلاقی اور غیر اخلاقی تناظر میں پیش کیا ہے اور قارئین پر فیصلہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ کس راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''......اس کے ہاتھ میں ایک ترازو ہے جسے وہ بار بار تولتا رہتا ہے کہ مجھے کس سائیڈ کا ہو کر رہنے کی

ضرورت ہے اور جب وہ یہ کر لیتا ہے تو پھر وہ Declare کرتا ہے کہ میں اس سائیڈ پر ہو کر چلوں گا۔'' (۶)

اشفاق احمد کی تحریروں میں انسانی عمومی اخلاقیات جو اسے معاشرے میں بہتر طریقے سے زندگی گزارنے میں مدد دے سکتی ہیں، ملتا ہے اور اس کے لیے ہمت اور کوشش کے ساتھ اللہ کی مدد بھی مانگنی چاہیے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہمت اور کوشش اپنی جگہ، جدوجہد اور سعی کا اپنا ایک مقام لیکن یہی کامیابی کے ضروری عنصر نہیں......
جس طرح ایک اعلیٰ درجے کی منتظم بیوی کی سنبھال کے رکھی ہوئی چیز ڈھونڈنا مشکل ہے۔اسی طرح یہ راز پانا بھی بہت مشکل ہے کہ کامیابی حاصل کرنے کا فارمولہ کیا ہے، بس جسے اللہ دے۔'' (۷)

اشفاق احمد تصوف، مذہب، معاشرت، معیشت اور انفرادی اصلاح کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے۔ان کے خیال میں انسانی زندگی کی بقا کا تصور خدا کے بغیر ممکن نہیں ہے۔جدید دور کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہمیں درس نظامی کی بہتری کے لیے بھی کوشش کرنی چاہیے اور جس طرح دوسری ضروریات زندگی کی بہتری اور ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں اس کے لیے بھی رہنا چاہیے۔اشفاق احمد اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''دیکھئے عزیز من! جان ہمیں بہت پیاری ہے ہم ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتے ہیں، عزت ہمیں بہت پیاری ہے، ہم وکیل کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن ایمان ہمیں پیارا نہیں ہے۔اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ملا کو کیوں رکھیں۔اس لیے درس نظامی کی ضرورت ہے۔'' (۸)

اشفاق احمد خود بھی تمام عمر درس و تدریس کا یہ کار خیر نبھاتے رہے۔ریڈیو سکرپٹ، ڈراما نگاری، صدا کاری، افسانہ نگاری، مذہبی، روحانی، سماجی، معاشرتی، معاشی، مسائل کی بات ہو اشفاق احمد ہر وقت، ہر ذریعے سے مدد کے لیے تیار رہتے۔اس کے لیے انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کی اہم مصروفیات کو ثانوی درجہ دے رکھا تھا۔اس سلسلے میں بانو قدسیہ لکھتی ہیں کہ:

''وہ ہر بڑے امتحان میں خم ٹھونک کر زندگی کو مات دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اشفاق صاحب کے والد بابا محمد خان فوت ہوئے تو میت گھر پر تھی۔لوگوں کا انتظار ہو رہا تھا اور اسی کمرے میں بیٹھے خان صاحب تلقین شاہ لکھ رہے تھے کیونکہ دوسرے دن ریکارڈنگ تھی اور وہ کسی ذمہ داری سے بھاگنے والے نہ تھے۔'' (۹)

اشفاق احمد کے نزدیک انسان بہرحال ہر شے سے افضل حیثیت رکھتا ہے۔راقمہ نے بانو قدسیہ سے ملاقات کی تو

انھوں نے اشفاق احمد کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ:

''خان صاحب مذہب، تصوف، معاشرت اور معیشت کے بارے میں بڑے واضح تصورات رکھتے تھے۔ مذہب ان کے نزدیک احکامات کی پابندی ہے۔تصوف کا مطلب آسانیاں تقسیم کرنا، معاشرے سے مراد آپس میں مل جل کر رہنا اور معیشت کے بارے کہ دولت اتنی ہو کہ ضروری پوری ہو سکے وہ لینے کی بجائے دینے اور تقسیم کرنے پر یقین رکھتے تھے کہ کسی کو در سے خالی نہ لوٹایا جائے۔'' (۱۰)

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں اخلاقیات کی ترویج کو ہی پیش نظر رکھا۔ اردو افسانہ آزادی سے قبل مضبوط روایات کا حامل رہا ہے کیونکہ تقسیم سے قبل لکھنے والوں کے پیش نظر ایک طے شدہ مقصد تھا اور اس مقصد کی جڑیں سماج، تہذیب وتمدن، ثقافت، یہاں تک کہ مذہب کے ساتھ بھی جڑی دکھائی دیتی ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر فردوس انور لکھتے ہیں کہ:

''۴۷ سے قبل ہمارے تمام ممتاز اور بڑے افسانہ نگار اپنے معینہ خطوط اور رجحانات کے ساتھ لکھ رہے تھے۔ ان کے افسانوں میں محبت، رومان، جنسی تحریکات، سیاست، معیشت، معاشرت اور بین الاقوامی تغیرات کی ساری کروٹیں تھیں مگر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے فسادات کچھ اس شدت اور اتنے وسیع پیانے پر بھڑک اٹھے کہ ان کے خواب جھلس کر رہ گئے۔'' (۱۱)

پاکستان بننے کے بعد حالات و واقعات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ افسانے کے موضوعات بھی تبدیل ہوئے اور زندگی کو بدلتے وقت کے تقاضوں کے ساتھ پیش کرنے کی سعی ہونے لگی تا کہ نئے ماحول کے نئے انسان کی زندگی کے نئے رخ متعارف کروائے جا سکیں۔ بقول ڈاکٹر اعجاز راہی:

''جذبات، احساسات اور زندگی کے تجربے نئے عصر میں سانس لینے لگے۔ تب افسانے نے فکری اور اسلوبیاتی سطح پر ایک ساتھ موڑ کاٹا اور نئی زندگی کے نئے مسائل کا نظیر بن گیا۔ کہانی کہنے کے تمام پرانے سانچے ٹوٹ گئے، نئے رویوں میں نیا انداز غالب آ گیا۔ نئے اردو افسانے زندگی کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی روایت قائم کی......'' (۱۲)

اشفاق احمد نے اردو افسانے کے نہایت توانا لہجے میں زندگی کے بدلتے تناظر نہ صرف بتائے بلکہ ان تبدیلیوں کے اثرات بھی حقیقت پسندی سے دکھائے۔ آزادی نے اسلوب ومعنی کے نئے در وا کیے اور تقسیم کے باطنی اور ظاہری انتشار نے

افسانہ نگار سے کہانی چھینی نہیں بلکہ ہر جاء مہیا کی ہے۔ایک سچا ادیب ہر طرح کے حالات میں اپنے لیے موضوع انتخاب کر لیتا ہے اور اسے بہ احسن نبھاتا بھی ہے۔بقول ممتاز شیریں:

''کامیاب فن کار ہر طرح کے موضوع سے اچھا افسانہ تخلیق کر سکتا ہے۔''(۱۳)

اشفاق احمد افسانہ نگاری کے فن سے آشنا ہیں۔کہانی کہنا ان کی فطرت کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ اشفاق احمد کی زندگی کا آغاز تا انجام مطالعہ کرنے سے یہ بات صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ افسانہ نگاری پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور کسی لمحے بھی زندگی سے ان کا رابطہ ٹوٹتا نہیں ہے۔''کاروان ادب''(مرتب)اے وحید میں مرقوم ہے:

''زندگی کی تخلیق جو افسانوی ادب کا بڑا گر ہے اشفاق کے افسانوں کی خصوصیت خاصہ ہے۔''(۱۴)

افسانہ نگار زندگی کے تلخ حقائق کو اپنے عمدہ اسلوب اور زبان و بیان سے شیریں تر بناتا ہے۔تبھی تو قارئین افسانہ بھی پڑھتے جاتے ہیں اور زندگی سے بھی آگاہ ہوتے رہتے ہیں۔اس سلسلے میں مسعود رضا خاکی لکھتے ہیں:

''افسانے کے فن پر قدرت کے ساتھ ساتھ انداز بیان کی لطافت اور فکر و خیال کی ماورائیت ایسے عناصر ہیں جن سے اشفاق حمد کے افسانوں کا خمیر تیار ہوا ہے۔''(۱۵)

اشفاق احمد سادہ اور سلیس انداز میں گہری اور باریک باتیں اپنے افسانوں میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ان کے ہر لفظ کے پیچھے ایک مکمل فکر و دانش کا جہاں موجود ہوتا ہے۔انسان کی فطرت اور نفسیات سے واقفیت ان کے افسانوں میں صاف دکھائی دیتی ہے۔سراج منیر روزنامہ''جنگ''میں رقمطراز ہیں کہ:

''اشفاق صاحب کے ہاں انسانی نفسیات اور انسانی تقدیر کی ایک غیر معمولی سمجھ ہے۔جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے فقروں کے پیچھے چھلکتی ہوئی کتنی نایاب چیز ہے۔''(۱۶)

اشفاق احمد انسانی زندگی کی بقا و سلامتی کے لیے اپنی تحریروں کے ذریعے مصروف عمل رہے۔انھوں نے مذہب، تصوف، معاشرت، معیشت اور انفرادی اخلاقیات کے کئی قاعدے اور قانون ہمارے سامنے رکھے۔وہ معاشرے کو مضبوط بنیادوں پر مستحکم بنانا چاہتے تھے۔انسان کی تمام تر جدوجہد اور ترقی کا مقصد ہی صحت مند معاشرے کی تخلیق ہے۔اس سلسلے میں ایرک فرام لکھتے ہیں کہ:

''جدید انسان کی جدوجہد کا مقصد ایک صحت مند معاشرے کی تخلیق تھا۔خاص طور پر اس کا مقصود ایک

ایسا معاشرہ تھا جس کے ارکان نے اپنی عقل کو معروضیت کے معاملے میں اس حد تک ترقی دے دی ہو کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں کو اور فطرت کو اس کی سچی حقیقت میں دیکھ سکیں......اس کا مطلب ایک ایسا معاشرہ تھا جس کے ارکان نے اس حد تک اپنی آزادی کو بڑھا لیا ہو کہ وہ خیر و شر کے باہمی فرق کو سمجھ گئے ہو۔'' (۱۷)

افراد کی ذاتی زندگی سے اجتماعی زندگی تک ایک ہی دھاگے میں بندھی ہوئی ہو تو معاشرے کی مجموعی ترقی کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔ معاشرہ کی ابتدا خاندان سے ہوتی ہے اس سلسلے میں روسو کا خیال ہے کہ:

''تمام معاشروں میں سب سے قدیم خاندان ہے اور وہی ایک فطری معاشرہ ہے۔'' (۱۸)

خاندان میں مل جل کر رہنے والے افراد معاشرے میں بھی بھائی چارے کی فضا کو قائم رکھتے ہیں۔ فرد کی زندگی کی ابتداء جس ماحول اور خاندان میں ہوں اس کے اثرات تاعمر ساتھ رہتے ہیں۔ اسی لیے بطور مسلمان ذاتی زندگی میں جب ہم ایسی عادتیں اپنائیں گے جو فلاح اور ترقی کا باعث بنیں تو نہ صرف خاندانی سطح پر خوشحالی رونما ہو گی بلکہ اجتماعی طور پر معاشرے سے اسلامی اخلاقیات کی خوشبو پھیلے گی ایک مسلمان معاشرے کی بنیاد رانا احتشام ربانی کے نزدیک درج ذیل اصولوں پر ہونی چاہیے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہر مسلمان معاشرے میں رہنے والے لوگوں سے انسانیت کے اصولوں، عزت، محبت، احترام، حق، انصاف، جاں، سلامتی، مال کا تحفظ، بھائی چارہ، برابری اور خوشحالی کی خوشبو آنی چاہیے۔''

جس معاشرے میں لوگوں کی اکثریت مثبت ہو گی، انسانیت کا احترام اور اخلاقیات کی قدر ہو گی، اتنا ہی وہ معاشرہ صحت مند ہو گا۔

حواشی

۱۔ اختر ایمان ''بانو قدسیہ اور سرمہ'' مشمولہ: ''سات رنگ'' اسلام آباد، نصرت پبلشرز، ۱۹۸۶، ص ۱۴۸

۲۔ Khalid Mahmood, "Religion in Theory" Lahore, Moazam Press, 1989, Pg 13

۳۔ ہربرٹ سپنسر ' دفلسفہ تعلیم '' ترجمہ: خواجہ علام الحسنین، لاہور، بک ہوم پبلشرز، ۲۰۰۵، ص ۱۴۶

۴۔ فرزانہ سید ''نقوش۔ادب'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶، ص ۴۶۱

۵۔ اشفاق احمد ''عصری تنقید۔ ڈاکٹر وحید قریشی ۔ بحث'' مشمولہ: نقوش سالانہ شمارہ ۱۳۲، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۵، ص ۱۳

۶۔ http://youtube.com/idology and commercialism by Ishfaq Ahmed Part-3

۷۔ اشفاق احمد ''نقوش کا طفیل نمبر'' مشمولہ: ''نقوش۔ خاص نمبر'' لاہور، ادارہ فروغ اردو، دسمبر ۱۹۸۷، ص ۳۰

۸۔ محمد شاہد (مرتب) ''اشفاق احمد۔ بے نیاز صوفی بابا'' لاہور، علم دوست پبلی کیشنز، اردو بازار، ۲۰۱۱، ص ۴۳

۹۔ بانو قدسیہ ''راہ رواں'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱، ص ۲۶۷

۱۰۔ راقمہ کی ۲۰ جنوری ۲۰۱۲ کو داستان سرائے میں ملاقات

۱۱۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات'' لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰

۱۲۔ اعجاز راہی، ڈاکٹر ''اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ'' راولپنڈی، ریز پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۳، ص ۵۷۔۵۶

۱۳۔ ممتاز شیریں ''معیار'' لاہور، نیا ادارہ، طبع اول، ۱۹۶۳

۱۴۔ اے وحید (مرتب) ''کاروان ادب'' لاہور، فیروز سنز، ۱۹۷۳، ص ۱۸۲

۱۵۔ مسعود رضا خاکی، ''اردو افسانے کا ارتقاء'' لاہور، مکتبہ خیال، ۱۹۸۷، ص ۳۷۳

۱۶۔ ''جنگ'' روزنامہ (جریدہ ادب وثقافت)، ۱۵ اکتوبر، ۱۹۸۱

۱۷۔ ایرک فرام ''صحت مند معاشرہ'' مترجم قاضی جاوید، لاہور، انتخاب جدید پریس، ۱۹۹۱، ص ۳۱۳۔۳۱۲

۱۸۔ روسو ''ابتدائی معاشرے'' مشمولہ: ''معاہدہ عمرانی'' مترجم محمود حسین، کراچی، کراچی یونیورسٹی، شعبہ تصنیف وتالیف، ۱۹۶۴

۱۹۔ رانا احتشام ربانی ''خوشبودار معاشرہ'' مشمولہ: ''انسان اور معاشرہ''، لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، جون ۲۰۱۰، ص ۱۹۷

مآخذ و مصادر

کتابیات

اردو کتب:

◆ ابصار احمد، ڈاکٹر، ''فلسفہ اخلاق۔ چند مغربی مفکرین کے نظریات'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

◆ ابصار احمد، ڈاکٹر، ''فلسفہ اخلاق'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء

◆ ابواللیث صدیقی، ''جدید اردو ادبیات''، کراچی، غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۸۹ء

◆ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، ''اردو کی ادبی تاریخ کا خاصا'' کراچی، اردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۸۴ء

◆ احتشام ربانی، رانا، ''داستان اور معاشرہ'' لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، جون ۲۰۱۰ء

◆ ارنسٹ ڈمنٹ (Ernest Diment) ''تخلیقی رویے'' مترجم: شہزاد احمد، بار اول، مارچ ۱۹۸۶ء

◆ اشفاق احمد، ''ٹاہلی تھلے۔ پنجابی ڈرامے''، لاہور، مکتبہ جدید پریس، مارچ ۱۹۷۲ء

◆ اشفاق احمد، ''سفر در سفر''، لاہور، غالب پبلشرز،، ۱۹۸۱ء

◆ اشفاق احمد، ''توتا کہانی''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء

◆ اشفاق احمد، ''قلعہ کہانی''، لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۹۰ء

◆ اشفاق احمد ''ننگے پاؤں''، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۱ء

◆ اشفاق احمد، 'اور ڈرامے''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

◆ اشفاق احمد، ''' اُچے برج لاہور دے'، لاہور، عزیز پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

◆ اشفاق احمد، ''بند گلی۔ ڈرامے''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

◆ اشفاق احمد، ''حیرت کدہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء

◆ اشفاق احمد، ''مہمان سرائے۔ مشہور ڈرامہ سیریل کارواں''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

◆ اشفاق احمد، ''ایک محبت سو ڈرامے''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

◆ اشفاق احمد، ''کھیل تماشا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

◆ اشفاق احمد، ''شاہلا کوٹ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

◆ اشفاق احمد، ''حسرت تعمیر''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

◆ اشفاق احمد، ''جنگ بجنگ۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

◆ اشفاق احمد، ''گلدان۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء
◆ اشفاق احمد، ''اُجلے پھول۔ گڈریا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء
◆ اشفاق احمد، ''دھینگا مشتی۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
◆ اشفاق احمد، ''ڈھنڈورا۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
◆ اشفاق احمد، ''شوراشوری۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
◆ اشفاق احمد، ''طلسم ہوش افزاء''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
◆ اشفاق احمد، ''من چلے کا سودا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
◆ اشفاق احمد، ''ایک محبت سو افسانے''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
◆ اشفاق احمد، ''شہرِ آرزو''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
◆ اشفاق احمد، ''عرضِ مصنف''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
◆ اشفاق احمد، ''وداعِ جنگ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء
◆ اشفاق احمد، ''ایک اور دستک۔ ڈرامے''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
◆ اشفاق احمد، ''ایک ہی بولی۔ پھلکاری''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
◆ اشفاق احمد، ''آسودگی۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
◆ اشفاق احمد، ''آشیانے۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
◆ اشفاق احمد، ''بندۂ زمانہ۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
◆ اشفاق احمد، ''پڑاؤ۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
◆ اشفاق احمد، ''سفر مینا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
◆ اشفاق احمد، ''زاویہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
◆ اشفاق احمد، ''زاویہ۔۲''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
◆ اشفاق احمد، ''زاویہ۔۳''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
◆ اشفاق احمد، ''بابا صاحبا''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
◆ اشفاق احمد، ''زنجیرِ تعلق۔ تلقین شاہ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
◆ اشفاق احمد، ''صبحانے فسانے''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء
◆ اشفاق احمد، ''مہمان بہار۔ ناولٹ''، لاہور، شرکت پرنٹنگ پریس، یکم نومبر، ۲۰۰۹ء

◆ اشفاق احمد، ''کھٹیاوٹیا'۔ پنجابی شاعری، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

◆ اعجاز راہی، ڈاکٹر، ''اردو افسانے میں اسلوب کا آہنگ'' راولپنڈی، ریز پبلی کیشنز، جون ۲۰۰۳ء

◆ اعزاز احمد آزاد: (مرتب) ''مشمولہ زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا''، لاہور، خالد بک ڈپو، ۲۰۰۴ء

◆ افتخار حجاز، عرفان احمد خان: (مرتبین) ''اردو کا آخری داستان گو'' لاہور، حیدر پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

◆ اکبر ایس احمد، ''پاکستانی معاشرہ۔ جنوبی ایشیاء میں اسلام، نسل پرستی اور قیادت'' مترجم: طارق محمود، پاکستان، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۸ء

◆ امولیہ رنجن مہاتیر، ''فلسفہ مذاہب'' مترجم: یاسر جواد، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸ء

◆ انتظار حسین، ''ملاقاتیں''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۸ء

◆ انوار احمد، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ۔ تحقیق وتنقید''، ملتان، بیکن ہاؤس گل گشت، ۱۹۸۸ء

◆ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو افسانے کی کروٹیں'' لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء

◆ انور سدید، ڈاکٹر، ''مختصر افسانہ عہد بہ عہد'' مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء

◆ ایڈورڈ پول لیکی ''تاریخ اخلاق یورپ'' مترجم: عبدالماجد دریا آبادی، کراچی، سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۶ء

◆ ایرک فرام، ''صحت مند معاشرہ'' مترجم: قاضی جاوید، لاہور، انتخاب جدید پریس، ۱۹۹۱ء

◆ ایئرڈ جان، جان جے ہونگمن بن، ''پاکستان، معاشرہ اور ثقافت'' مترجم: غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، لاہور، تخلیقات پلازہ، ۲۰۰۶ء

◆ اے حمید ''داستان گو۔ اشفاق احمد'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

◆ اے وحید، ''' کاروانِ ادب'' لاہور، فیروز سنز، ۱۹۷۳ء

◆ آزاد کوثری، ''نئے افسانے کی سماجی بنیادیں''، لاہور، الخبیر پرنٹرز، ۱۹۹۱ء

◆ آزاد کوثری، ''پاکستانی کلچر کی مختلف جہتیں''، لاہور، ٹمپل روڈ، ۱۹۸۸ء

◆ بانو قدسیہ، ''راہ رواں'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

◆ بشیر احمد ڈار، ''حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق'' لاہور، مکتبہ جدید پریس، ۱۹۹۵ء

◆ پروین اظہر، ڈاکٹر، ''اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید'' علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، طبع اول، ۲۰۰۰ء

◆ پریشان خٹک صدیقی، پروفیسر، معاشرے کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ۔ مقالات۔ کل پاکستان اہل قلم کانفرنس، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، پاکستان، ۱۹۸۹ء

◆ تجمل حسین ہاشمی، ''ہمارا معاشرہ'' لاہور، ابلاغ پبلشرز، جنوری، ۲۰۰۱ء

◆ جان ڈیوی، ''اخلاقی زندگی کا نظریہ'' ترجمہ: میاں عبدالرشید، ۱۹۶۴ء

- جان ہاسپرس، ''ابتدائی فلسفہ'،مترجم: سلطان علی شیدا، ڈاکٹر، لاہور، نگارشات، میاں چیمبر، ۱۹۹۸ء
- جاوید اقبال ندیم''اہل مسکویہ کا فلسفہ اخلاق اوراس کا امام غزالی اور دوانی پر اثر''لاہور، معراج پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۳ء
- جاوید اقبال ندیم، ''شذراتِ فلسفہ''لاہور، معراج پریس، اردو بازار، ۱۹۹۳ء
- جیمز اے میچز''پاکستان''لاہور، ریڈرز ڈائجسٹ، امریکن ایڈیشن، ۱۹۵۴ء
- قاضی جاوید، ''پاکستان میں فلسفیانہ رجحانات''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء
- حسن رضوی، ''بالمشافہ''لاہور، عمیر پبلشرز، ۱۹۹۵ء
- حفیظ الرحمٰن خان''پاکستانی ادب کا منظر نامہ''لاہور، حاجی پرنٹرز، ۲۰۰۴ء
- حفیظ الرحمٰن، ''پاکستانی ادب کا منظر نامہ''، لاہور، حاجی پرنٹرز، ۲۰۰۶ء
- حمید احمد خان، ''تعلیم وتہذیب۔ مجموعہ خطبات ومقالات''، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء
- خالد علوی، ڈاکٹر، ''اسلام کا معاشرتی نظام''لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، ۱۹۶۸ء
- خورشید احمد، ''اسلامی نظریہ حیات'' کراچی، شعبہ تصنیف وتالیف، ۱۹۷۹ء
- ڈی۔ ڈی۔ رافیل''فلسفہ اخلاق''مترجم: راشد متین، اسلام آباد، قومی اکادمی برائے اعلیٰ تعلیم، س ن،
- رام لعل''اردو افسانے کی نئی تخلیقی فضا''نئی دہلی، نریندر ناتھ سوز، ۱۹۸۵ء
- رحمت اللہ سبحانی، لودیانوی، مولانا''مخزنِ اخلاق''لاہور، مکتبہ علمیہ، ۱۹۲۶ء
- رشید احمد، پروفیسر، ''مسلمانوں کے سیاسی افکار''لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۶ء
- رشید احمد، ڈاکٹر: (مرتب)''پاکستانی ثقافت: پاکستانی ادیبوں کے منتخب مضامین''، سلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۹ء
- روسو''معاہدہ عمرانی''، مترجم: محمود حسین، کراچی، یونیورسٹی، تصنیف وتالیف، ۱۹۶۴ء
- ریاض محمود، ''داستان گو''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء
- ژاں پال سارتر''ادب، فلسفہ اور وجودیت۔ ژاں پال سارتر کی نظر میں''، مرتبین: شیما مجید، نعیم حسن، مترجم: انتظار حسین، لاہور، بک پرنٹرز، ۱۹۹۲ء
- سرسید احمد خان، ''مقالاتِ سرسید''مرتبہ: محمد اسماعیل پانی پتی، لاہور، مجلس ترقی ادب، جد۴، ۱۹۶۹ء
- سعادت سعید، ڈاکٹر، ''جہت نمائی''لاہور، دستاویز مطبوعات، ۱۹۹۱ء
- سلیم اختر، ڈاکٹر''مغرب میں نفسیاتی تنقید''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء
- سلیم اختر، ڈاکٹر، ''افسانہ۔ حقیقت سے علامت تک''لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۰ء
- سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر''جدید افسانے کے رجحانات'' کراچی، انجمن ترقی پاکستان، ۲۰۰۰ء

◆ سیدعبداللہ،ڈاکٹر،''ادب وفن''،لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،جون ۱۹۸۷ء
◆ سیدوقارعظیم،ڈاکٹر''نیاافسانہ''علی گڑھ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۹۰ء
◆ سید،عبداللہ،ڈاکٹر،''کلچراور مسئلہ''لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء
◆ سجادحارث،''ادب اور ریڈیکل جدیدیت''لاہور،شرکت پرنٹنگ پریس،۱۹۸۸ء
◆ سی۔اے قادر،ڈاکٹر،''معاشریات''لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،جنوری ۱۹۷۴ء
◆ سی۔اے۔قادر،ڈاکٹر''اخلاقیات''لاہور،مجلس ترقی ادب،طبع چہارم،دسمبر،۱۹۸۵ء
◆ سی۔اے قادر،ڈاکٹر''کارل مارکس اوراس کی تعلیمات''تدوین:طارق عزیز،ڈاکٹر،لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۸۸ء
◆ سی۔اے۔قادر،ڈاکٹر،''معاشریات طب''تدوین:انورسدید،ڈاکٹر،لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۸۹ء
◆ سی۔اے۔قادر،ڈاکٹر،''معاشریات مذہب''تدوین:انورسدید،ڈاکٹر،لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،جون ۱۹۹۱ء
◆ سی۔اے۔قادر،ڈاکٹر،''ثقافتی انسانیت''لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۸۹ء
◆ شمس العلماء،مولانا،محمد ذکاءاللہ،''محاسن اخلاق''مرتبہ:محمد رضا،لاہور،مجلس ترقی ادب،۱۹۷۵ء
◆ شمیم حسین قادری،سید،''اسلامی ریاست۔قرآن وسنت کی روشنی میں''،لاہور،شعبہ مطبوعات،محکمہ اوقاف،پنجاب،جون ۱۹۸۴ء
◆ شیما مجید(مرتب)،''ادبی مذاکرے''لاہور سنگ میل پبلشرز،۱۹۸۹ء
◆ طاہر مسعود،''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے''کراچی،مکتبہ تخلیق ادب،۱۹۸۵ء
◆ طاہرالقادری،ڈاکٹر''حسن اخلاق۔سلوک تصوف کی تربیت کی عملی ہدایات''لاہور،منہاج القرآن،پبلی کیشنز،اکتوبر ۲۰۱۰ء
◆ ظہیراحمد صدیقی،ڈاکٹر،''تصوف اور تصورات صوفیہ''لاہور،سیٹھی بکس،۲۰۰۸ء
◆ ظہیراحمد صدیقی،ڈاکٹر،''تصوف ہر انسان کی ضرورت''،لاہور،تخلیقات،علی پلازہ مزنگ روڈ،۲۰۱۰ء
◆ عارف ثاقب''بیسویں صدی کا ادبی طرز احساس''لاہور،اظہارسنز پرنٹرز،۱۹۹۹ء
◆ عالم فقری،علامہ''اسلامی اخلاق''لاہور،ادارہ پیغام القرآن،سن ندارد
◆ عبدالحکیم،خلیفہ،''Islamic Ideology''لاہور،ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۹۸ء
◆ عبدالغفور شاہ قاسم،ڈاکٹر،''پاکستان ادب ۱۹۴۷ء سے تا حال''لاہور،معراج دین پرنٹرز،۱۹۹۵ء
◆ عبدالقادر،چوہدری،پروفیسر،ڈاکٹر،''تغیراور نظریات تغیر''لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،جون ۱۹۸۱ء
◆ علاؤالدین اختر،ریڈوولف سیلر''معاشرتی نفسیات(برائے اہل پاکستان)''لاہور،مجمع البحرین،میکولڈ روڈ،۱۹۵۸ء
◆ علی عباس جلالپوری،''روح عصر''لاہور تخلیقات،۱۹۹۹ء
◆ غفور شاہ قاسم،''پاکستانی ادب۔شناخت کی نصف صدی''راولپنڈی،ریز پبلی کیشنز،اگست ۲۰۰۰ء
◆ غلام صادق،خواجہ،:''فلسفہ جدید کے خدوخال''لاہور،ایچ وائی پرنٹرز،۱۹۸۶ء

◆ فدا کاردار، ''ایک کردار ایک کہانی''لاہور، برائٹ بکس، اردو بازار، اپریل ۲۰۰۵ء

◆ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ نگاری کے رجحانات''لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰ء

◆ فرزانہ سید، ''نقوش ادب''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء

◆ فرمان پوری، ''ادب اور ادب کی فادیت''، کراچی، اختر کتاب گھر، اردو بازار، جولائی، ۱۹۹۶ء

◆ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ اور افسانہ نگار'' کراچی، اردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۸۲ء

◆ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر ''اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے رجحانات''اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء

◆ قاسم محمود سید، ''جریدی کتاب''، مشمولہ ''اشفاق کا واحد ناولٹ''، ۲۰۰۹ء

◆ گوپی چند نارنگ، ''اردو افسانہ روایت اور مسائل''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

◆ محمد اقبال، چوہدری، ''پاکستانی معاشرہ''لاہور، عزیز پبلشرز، ۱۹۹۳ء

◆ محمد شاہد (مرتب) ''اشفاق احمد۔ بے نیاز صوفی بابا''لاہور، علم دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

◆ محمد حبیب الرحمٰن خان شیروانی ''اسلامی اخلاق''لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۲۰۱۰ء

◆ محمد حفیظ الرحمٰن، سیوہاری، مولانا، ''اخلاق اور فلسفہ اخلاق''لاہور، خالد مقبول پبلشرز، ۱۹۷۶ء

◆ محمد ذکاء اللہ، شمس العلماء مولانا، ''محاسن الاخلاق''مرتبہ: محمد رضا، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء

◆ محمد عالم خان، ڈاکٹر، ''اردو افسانے میں رومانوی رجحانات''، لاہور، علم و عرفان پبلی کیشنز، س ن

◆ محمد عثمان، پروفیسر، ''اسلام پاکستان میں''، لاہور، ادارہ تحقیقات پاکستان، ۱۹۵۴ء

◆ محمد سرور رانا، خان مصطفیٰ علی، ''معاشرہ، سکول اور استاذ''لاہور، مجید بک ڈپو، ۱۹۸۳ء

◆ محمد نواز، کھرل، (مرتب) ''باتوں سے خوشبو آئے''لاہور، زاویہ پبلشرز، ۲۰۰۴ء

◆ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ''اردو افسانے کی روایت ۱۹۹۳ء۔۱۹۹۰ء''اسلام آباد، اکادمی ادبیات، دسمبر، ۱۹۹۱ء

◆ مرزا حامد بیگ، ''افسانے کا منظر نامہ''الہ آباد، اردو رائٹرز گلڈ، ۱۹۸۳ء

◆ مرزا حامد بیگ، ''پاکستان کے شاہکار اردو افسانے''اسلام آباد، الحمرا پبلشنگ، ۲۰۰۰

◆ مسعود رضا خاکی، ''اردو افسانے کا ارتقا''، لاہور، مکتبہ خیال، ۱۹۸۷ء

◆ مظفر حسین، ڈاکٹر، ''تعلیمی عمرانیات''اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جون ۱۹۹۰ء

◆ ممتاز شیریں، ''معیار''، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء

◆ ممتاز مفتی، ''اوراو کھے لوگ''، لاہور، فیروز سنز، ۱۹۹۱ء

◆ مور ایڈورڈ جارج، ''اصولِ اخلاقیات''مترجم: عبدالقیوم، پروفیسر، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۱ء

- ناصر زیدی (مرتب)، ''نا قابل فراموش افسانے'' لاہور، نواز پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۴ء
- ناظمہ نقوی، ''فکر زاویے۔تنقیدی مضامین''، لاہور، حاجی حنیف پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
- نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر، ''فلسفہ حسن'' لاہور، مجلس ترقی ادب، جنوری ۱۹۸۴ء
- نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، ''اردو مختصر افسانہ۔۱۹۴۷ء کے بعد'' دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ، ۱۹۸۶ء
- نگہت ریحانہ خان، ڈاکٹر، ''اردو مختصر افسانہ۔فنی و تکنیکی مطالعہ ۱۹۴۷ء کے بعد'' لاہور، بک وائز، ۱۹۸۸ء
- نورالحسن خان ''غزالی کا تصور اخلاق'' لاہور، المکتبہ علمیہ، س ن
- واصف علی واصف، ''حرف۔حرف حقیقت'' لاہور، کاشف پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء
- وحید عشرت، ڈاکٹر، ''فلسفہ عمرانیات'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء
- وحید قریشی، ڈاکٹر، ''اردو نثر کے میلانات''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۶ء
- وحیدالدین خان، مولانا ''سوشلزم اور اسلام'' لاہور، المکتبہ الاشرفیہ، ۱۹۸۵ء
- وزیر آغا ڈاکٹر، ''اردو شاعری کا مزاج'' لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۸ء
- وزیر آغا، ڈاکٹر، ''ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین'' مرتبہ: سید سجاد نقوی، لاہور، مکتبہ عالیہ، ایبک روڈ، اردو بازار، ۱۹۹۵ء
- وزیر آغا، ''تخلیقی عمل''، سرگودھا، ریلوے روڈ، مکتبہ اردو زبان، اکتوبر ۱۹۷۰ء
- وقار عظیم، پروفیسر، ''فن افسانہ نگار''، دہلی، یم اے آفسٹ پرنٹرز، ۱۹۹۷ء
- وقار عظیم، پروفیسر، ''فن اور افسانہ نگاری'' کراچی، ادارہ اشاعت اردو، طبع اول، ۱۹۴۹ء
- وقار عظیم، پروفیسر، ''نیا افسانہ''، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء
- وقار عظیم، ڈاکٹر، ''داستان سے فسانے تک'' لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء
- وقار عظیم، پروفیسر، ''فن افسانہ نگاری'' لاہور، اردو مرکز، ۱۹۶۱ء
- ول ڈیوریٹ، ''نشاط فلسفہ'' مترجم: محمد اجمل، لاہور، مکتبہ خاور، چوک مینار، جون ۱۹۶۶ء
- ولیم للّی، ''تعارف اخلاقیات'' مترجم: سید محمد احمد سعید، کراچی، فضلی سنز، ۱۹۸۴ء
- یاسین آفاقی (انتخاب و ترتیب)، ''اردو افسانہ۔صورت معنی''، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۶ء
- یوسف شیدائی، پروفیسر، ''مطالعہ اخلاقیات'' لاہور، عزیز پبلشرز، ۱۹۸۴ء
- ''بیسویں صدی کے بیس افسانے'' لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶
- گوپی چند نارنگ ''اردو افسانہ روایت اور مسائل'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء
- ہربرٹ سپنسر ''فلسفہ تعلیم'' ترجمہ: خواجہ غلام الحسنین، لاہور، بک ہوم، ۲۰۰۵ء

English Books:

- Armstrong, karen, "A History of God" Great Britain Press, 1993
- Edger Allenpoe "Selection From Critically Writings" complied byArthus Robinson Quinn
  Alfred A knops, New York, third Edition, 1958.
- Robert Boynlou "Introduction to the short story" U.S.A haydon Book Company, 1978
- Khalid Mahmood "Religion in Theory", Lahore. Moazzam Press, 1989

English Newspapers:

- Business Recorder: International (http://ashfaqahmed.com)
- DAILY TIMES, Wednesday, September 8, 2004
- DAWN, Lahore, Wednesday, September 8, 2004
- KHALEEJ TIMES, Gulf, Wednesday, September 8, 2004
- NATIONAL DAILY (Peshawar & Queta)
- PAKISTAN OBSERVER, Islamaba, Septemeber 8, 2004
- THE FRONTIER POST, Wednesday 8, September 2004
- THE NATIONAL, Lahore, Karachi, Islamabad, Wednesday September 8, 2004
- THE NEWS, International
- THE PAKISTAN TIMES, Wednesday, September 8, 2004

رسائل:

- ''ادبیات'' سہ ماہی، جلد ۷، شمارہ ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۴ء
- ''ادبِ لطیف'' جلد ۷، شمارہ ۱۵، لاہور، ۲۰۰۴ء
- ''ادب خیمہ''، اوکاڑہ، ۱۹۹۱ء
- ''ادبِ لطیف''، لاہور، جلد نمبر ۴۹، شمارہ نمبر ۳، ۴ اپریل ۱۹۸۳ء
- ''ادبِ لطیف'' اشفاق نمبر، لاہور، مکتبہ جدید پریس، ۲۰۰۵ء
- ''ادبِ لطیف'' سالنامہ، لاہور، مکتبہ جدید پریس، ۱۹۵۸ء
- ''ادبِ لطیف''، لاہور، گولڈن جوبلی نمبر، جلد ۵۲، شمارہ۔ ۱۱، ۱۹۸۶ء
- ''ادبی دنیا'' لاہور، جلد نمبر ۲۴، شمارہ نمبر ۶، ۱۹۴۶ء
- ''ادبیات'' سہ ماہی، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۴ء
- ''ادبیات'' سہ ماہی، شمارہ ۶۴۔۶۳، جلد ۱۶۔۱۵، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۲۰۰۴ء
- ''افکار''، بھوپال، ستمبر، ۱۹۴۷ء
- ''افکار''، کراچی، دسمبر، ۱۹۹۰ء
- ''بیسویں صدی کے بیس افسانے'' لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- ''اوراق'' افسانہ، انشائیہ نمبر، لاہور، ۱۹۷۲ء
- ''پاکستانی ادب'' راولپنڈی، ایس ٹی پرنٹرز، جولائی ۱۹۸۱ء
- ''پاکستانی ادب'' راولپنڈی، ۱۹۹۸ء
- ''پاکستانی ادب'' جلد، حصہ دوم، راولپنڈی، ۱۹۸۸ء
- ''تخلیق''، لاہور ۱۹۹۰ء
- ''ٹی۔وی ٹیمپو'' (ماہنامہ)، کراچی، جولائی، ۱۹۸۶ء
- ''داستان گو'' لاہور، جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۹، جولائی ۱۹۵۸ء
- ''دنیا زاد'' کتاب ۱۳، خوابوں کا جزیرہ، س ن
- ''رابطہ'' ماہنامہ، کراچی، مئی ۱۹۸۷ء
- ''رابطہ'' کراچی، جنوری ۱۹۸۹ء

◆ ''رابطہ''، کراچی، جنوری ۱۹۹۰ء
◆ ''رابطہ''، کراچی، مئی جون ۱۹۹۱ء
◆ ''راوی''لاہور، جی سی یو، نومبر ۱۹۵۰ء
◆ ''راوی''لاہور، گورنمنٹ کالج، یونیورسٹی، مئی جون ۱۹۴۹ء
◆ ''راوی۔اشفاق احمد نمبر''لاہور، گورنمنٹ کالج، جلد۹۲، واحد شمارہ، اکتوبر ۲۰۰۵ء
◆ ''سات رنگ''اسلام آباد، نصرت پبلشرز، ۱۹۸۶ء
◆ ''سرسیدین۔پاکستانی ادب''راولپنڈی، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، ۱۹۸۲ء
◆ ''سویرا''، ۵۴، ۵۳، لاہور، مارچ ۱۹۷۷
◆ ''سویرا''لاہور، فروری مارچ ۱۹۷۸ء
◆ ''سویرا''، ۲۱، ۲۰، ۱۹، مارچ ۱۹۷۱
◆ ''صحیفہ''۳ شمارہ، لاہور، کلب روڈ، دسمبر، ۱۹۵۷ء
◆ ''طلوع افکار''ادب وجنس نمبر، کراچی، دسمبر ۱۹۷۵ء
◆ ''علامت''، لاہور، اپریل، ۱۹۹۰ء
◆ ''فنون''، لاہور، خاص نمبر، اکتوبر۔نومبر ۱۹۶۲ء
◆ ''فنون''ماہنامہ، شمارہ ۳۰، لاہور، لوئر مال، ملک مظہر، جولائی، ۱۹۹۰ء
◆ ''فنون''، لاہور، شمارہ ۳۰، جون، جولائی ۱۹۹۰ء
◆ ''فنون''لاہور، مزنگ روڈ، ستمبر، دسمبر، ۲۰۰۴ء
◆ ''ماہِ نو''جلد دوم چالیس سالہ مخزن، ادارہ مطبوعات پاکستان، ۱۹۶۷ء
◆ ''معاصر''جلد پر شمارہ ۳، ۴، لاہور، ادارہ معاصر، ۲۰۰۲ء
◆ ''نقوش ادب''لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء
◆ ''نقوش''شمارہ ۱۳۳، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۶ء
◆ ''نقوش''جلد دوم، افسانہ نمبر ۳۸، ۷و، ۱۹۵۴ء
◆ ''نقوش''خاص نمبر، لاہور، ادارہ فروغ اردو، دسمبر ۱۹۸۷ء
◆ ''نقوش''سالانہ شمارہ، ۱۳۲، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۵ء
◆ ''نقوش''لاہور افسانہ نمبر ۳۷، ۳۸، جنوری ۱۹۵۴ء

◆ ''نقوش'' مرتب: محمد طفیل، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۲ء

◆ ''نقوش'' ۵۲، ۵۳، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۲ء

◆ ''نقوش''، لاہور، ستمبر، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۶ء

◆ ''نیادور''، کراچی، شمارہ ۵۹، ۶۰،

◆ ''ہمایوں''، لاہور، جلد ۲۷، سالنامہ ۱۹۵۸ء

◆ ''بیاض'' (ماہنامہ)، جلد ۱۲، شمارہ ۱۱، لاہور، ۲۰۰۴ء

◆ ''ادب لطیف'' (ماہنامہ) جلد ۷۰، شمارہ ۵، لاہور، ۲۰۰۵ء

◆ ''ماورا'' (ماہنامہ) جلد ۸، شمارہ ۹، لاہور، ۲۰۰۷ء

اردو اخبار:

◆ انصاف، روزنامہ، لاہور: ۸ ستمبر، ۲۰۰۴ء

◆ پاکستان، روزنامہ، سنڈے، میگزین، لاہور: ۱۳ جولائی ۲۰۰۳ء

◆ پاکستان، لاہور، ۹ ستمبر، ۲۰۰۴ء

◆ جسارت، روزنامہ، کراچی، ۹ ستمبر، ۲۰۰۴ء

◆ جنگ، روزنامہ (جریدہ۔ادب وثقافت)، لاہور، ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۱ء

◆ جنگ، روزنامہ، سنڈے میگزین، لاہور: ۱۸ نومبر ۲۰۰۱ء

◆ جنگ، روزنامہ، لاہور: ۸ ستمبر ۲۰۰۴ء

◆ جنگ، لاہور، ۱۰ ستمبر، ۲۰۰۴ء

◆ خبریں، روزنامہ، سنڈے میگزین، لاہور: ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۰

◆ خبریں، روزنامہ، لاہور: ۱۵ ستمبر ۲۰۰۴ء

◆ خبریں، روزنامہ، لاہور: ۸ ستمبر ۲۰۰۴ء

◆ مساوات، روزنامہ، لاہور: ۸ ستمبر ۲۰۰۴ء

◆ نوائے وقت، روزنامہ، ادبی ایڈیشن، لاہور، ۱۰ ستمبر ۲۰۰۴

لغات/ انسائیکلو پیڈیا:

- اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز، چوتھا ایڈیشن، مطبوعہ فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء
- اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، دانش گاہ پنجاب، جلد دوم، ۱۹۶۲ء
- امیر مینائی لکھنوی، ''امیر اللغات'' لاہور، مقبول اکیڈمی، حصہ اول، ۱۹۸۸ء
- سید احمد دہلوی ''فرہنگ آصفیہ'' جلد اول، لاہور، مکتبہ حسن، ۱۹۷۴ء
- سید مرتضٰی فاضل لکھنوی، سید قاسم شمیم امروہوی، آغا محمد باقر، نیرہ آزاد (مرتبین)، ''نسیم اللغات اردو''، لاہور، غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۹ء
- سید قاسم محمود، ''اسلامی انسائیکلو پیڈیا'' لاہور، الفیصل ناشران، س ن
- شان الحق حقی، (مرتب و مترجم)، ''آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری''، کراچی، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۵ء
- عبدالمجید، نظامی، ''لغات نظامی اردو'' لاہور، نظامی پریس، طبع اول، ۱۹۸۵ء
- قطب شہدہ، سید، ''العدالتہ الاجتماعیۃ فی الاسلام'' لاہور، اردو ترجمہ، ۱۹۷۷ء
- قومی انگریزی اردو لغت، مرتبہ: جمیل جالبی، ڈاکٹر، اسلام، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء
- محبوب عالم، مولوی، (مرتب)، ''اسلامی انسائیکلو پیڈیا'' ترتیب و تدوین: عالم محمود، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۸۹ء
- نور الحسن نیر، مولوی، ''نور اللغات'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، جلد اول، ۱۹۸۹ء

مقالہ جات:

- ثمینہ شہناز، ''اشفاق احمد کی افسانہ نگاری'' مملوکہ لائبریری، اورنٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۹۲ء
- ثنا مصطفٰی، ''خالدہ حسین کے افسانوں کا تنقیدی مطالعہ'' مقالہ برائے ایم اے اردو، مملوکہ لائبریری، جی سی یو، لاہور، ۲۰۰۵ء
- شازیہ صدف، ''اشفاق احمد کی ادبی خدمات۔ اردو ادب کے تناظر میں'' مقالہ برائے ایم اے اردو، مملوکہ لائبریری، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۰ء
- سلیم عباس قیصر، ''پی ٹی وی اردو ڈرامہ سیریل، ایک تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ ۱۹۷۰ء تا ۲۰۰۰ء'' مقالہ برائے پی۔ ایچ ڈی ابلاغیات''، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۲۰۱۰ء

Encyclopedia & Dictionairs:

- Bryan Turne, "The cambridge Dictionary of Socallogy" cambridge University Press, 2006
- Derek Gregory" UK Ltd., W. Black well publishers, 2000.
- John Secots, Gordon Marshall, "Oxford Dictionary of Sociology" 3rd 2005
- The New Encyclopedia Britanica "Volume: 10, 15th Edition, U.S.A, 1997
- The New International Webter's comprehensive dictionary of English language,

  Encyclopedia Edition, Trident Press International, 2004
- William outh waite, Tom Bottomore "The well Dictionary of twentienth century social

  thought" UK Black well Publiers, 1993

Internet Material:

- http://AshfaqAhmedabout Pakistan and Quaid!! youtube-windows.internet explorer
- http://U4U.com/pub/index.U4U
- http://ashfaqahmed.com
- http://column.com.pk/category/short-stories/asfaq-ahmed/ DASTANGO BY ASHFA
  AHMED Postedby azeem on August 17,2010
- http://en.wikipedia.org/wiki/Ashfaq-Ahmed
- http://forum-urduworld.com/f135/ashfaq-ahmad-343200
- http://novelPK.com/about-ashfaq-ahmed-posted by umer List/Farooq24 October, 2011
- http://urduadab4.blogspot.com/2010/09ashfaq-ahmed-autograph.html
- http://www.bashoorPakistan.com/category/writer/ashfaq-ahmed
- http://www.forumPakistan.com/ashfaq-ahmed Thu Aug 09, 2007, 10:43p.m.
- http://www.khalidhasan.net/2004/09/10/ashfaq-ahmed
- http://www.mwf.com.pk/index/PhP/ashfaq-ahmed-writer-broadcaster
- http://www.urdumania.com/tag/ashfaq-ahmed-urdu-writer
- www.hamiweb.com/articles/articles.aspxid=1788
- http://www.youtube.com "Ideology and Commercialism" by Ashfaq Ahmed. Part-3